قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2020 قیمت 15 ₹

# ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی
— لال چند فلک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

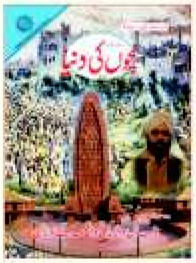

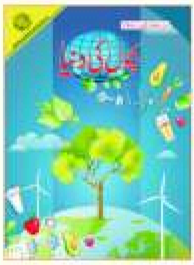

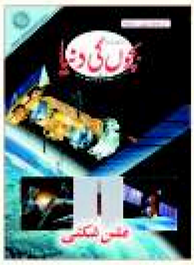

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22،شمارہ:08،اگست 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

**مطبع:**

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

**مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل**

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے    سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں



**صدر دفتر**

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000    شعبۂ ادارت: 49539009

**ویب سائٹ**

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 040-24415194

**اداریہ**

ہماری بات 4

**خطوط**

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

**نقد و نگاہ**

شعور، ذہانت، علم، وجدان اور انسان — سید شبیہ الحسن زیدی 6

جمہوری ادب کا تصور اور فنی تقاضے — عبدالبرکات 10

پروفیسر محمود الٰہی اور 'مقدمہ الہلال' — انس مسرور انصاری 13

ترجمہ نگاری کا فن اور تکنیک — عبدالرحمٰن انصاری 18

اردو شاعری میں کتاب — صابر علی سیوانی 23

غلام مجتبیٰ انصاری اور ان کا سفرنامہ 'ایران' — فیضان حیدر 27

فراق گورکھپوری کی خطوط نگاری — عزیز احمد خان 30

ذوق کا رنگ سخن: اعجاز و امتیاز — امتیاز رومی 34

**زبان و تعلیم**

حکومت کے اہم تعلیمی ڈیجیٹل اقدامات اور اردو — پی ایف رحمٰن 38

زندگی کی مہارتوں پر مبنی تعلیم کامیاب زندگی کی کلید — پٹھان محمد وسیم 41

**اصناف ادب**

رباعی کی نشاۃ ثانیہ — شمیم احمد صدیقی 44

حماد انجم کی رباعی نگاری — شمس کمال انجم 47

جدیدیت اور جدید افسانہ — محمد اقبال جاوید 50

ہندوستانی ڈرامے پر مغربی ڈرامے کے اثرات — لیاقت علی 53

**خراج عقیدت**

الوداع اکرام باگ — اسلم محبوب خان 57

**شخصیات**

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیوپوری — سعید رحمانی 61

حافظ احمد علی خاں شوق اور ان کی علمی خدمات — ساجدہ شیروانی 64

نور جہاں ثروت: منفرد لہجے کی شاعرہ — ظفر گلزار 66

**سلسلۂ صحافت**

ماہنامہ 'شب خون' کی چالیس سالہ ادبی خدمات — اسلم مصباحی 69

**خصوصی گفتگو**

دلیپ کمار سے گفتگو — جلیل بازید پوری 74

**نیا آسمان نئے ستارے**

عہد اکبری میں مثنوی سرائی — الطاف حسین 76

**دوسری زبانوں سے**

عورت کی عہد شکنی — مصطفیٰ لطفی منفلوطی، ترجمہ: سعد اللہ احسان 78

**کتابوں کی دنیا**

تعارف و تبصرہ — ادارہ 80

**خبرنامہ**

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 88

# ہماری بات

'اردو دنیا' کے قارئین کو یومِ آزادی مبارک!

پندرہ اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا جس کا باشندگان ہند کو شدت سے انتظار تھا۔لیکن یہ آزادی یوں ہی نہیں مل گئی، بلکہ بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی۔ بلاتفریق مذہب وملت ملک کے تمام طبقات نے آزادی کی جدو جہد میں حصہ لیااور ہر نوع کی قربانیاں دیں۔ کتنے قید وبند کی صعوبتوں سے گزرے، کتنوں نے پھانسی کے پھندوں کو چومااور کتنوں نے آزادی کی لڑائی زبان وقلم کے ذریعے لڑی۔اس حوالے سے اردو کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا کردار نہایت تابناک اور سرگرم رہا۔'دہلی اردو اخبار' کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تحریک آزادی کے پہلے شہید صحافی ہیں۔انھیں برطانوی استعمار کی مخالفت کی وجہ سے جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔اس کے بعد تحریکِ آزادی کی لَے اور تیز تر ہوتی گئی۔

دیگر اخبارات اور رسائل نے بھی برطانوی سامراج کے خلاف محاذ کھول دیا اور اس کا عوامی ذہن وشعور پر بہت ہی گہرا اثر مرتب ہوا۔ برطانوی حکومت بھی لرزہ براندام ہوگئی اور اس انقلابی آواز کو روکنے کے لیے اخبارات کے خلاف کارروائی شروع ہوگئی۔مولانا ظفر علی خاں کے اخبار 'زمیندار'، مولانا محمد علی جوہر کے 'ہمدرد' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ 'الہلال' کے گرد شکنجہ کسا گیا۔اردو کے نہایت باوقار اور عظیم شاعر مولانا حسرت موہانی کو جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ان کے علاوہ اور بہت سی مقتدر شخصیات کو قید و بند کی سزائیں دی گئیں۔مگر اس کے باوجود اردو کے ادبا و شعرا اور صحافت سے جڑے ہوئے افراد ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔اپنی تحریروں، نظموں اور افسانوں کے ذریعے باشندگانِ ہند میں ولولۂ آزادی پیدا کرتے رہے۔

اردو شعرا اور صحافیوں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے ایسی تحریریں لکھیں جن سے باشندگانِ ہند کے جذبۂ آزادی کو تقویت حاصل ہوئی اور وہ انگریزوں کے سامنے ڈٹے رہے۔جوش ملیح آبادی کی نظم 'شکست زنداں کا خواب' بڑی مشہور ہوئی اور جگہ جگہ پڑھی اور گائی گئی۔ان کے اس شعر کی گونج ملک کی فضاؤں میں ہر جگہ سنائی دی۔

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے　　　　اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

اسرارالحق مجاز نے ہندوستانی عوام کو جگانے اور انقلابی بنانے کا کام کیا۔انھوں نے خواتین کو بھی انقلاب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بہت سے انقلابات خواتین کے ذریعے آتے ہیں۔اگر ملک گیر سطح پر انقلاب لانے کی تحریک میں خواتین بھی شامل ہوجائیں تو پھر حالات کا رخ موڑنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔مجاز نے کہا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن　　　　تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تھی تو اچھا تھا

اور بھی بہت سے ایسے شعرا و ادبا تھے جنھوں نے برطانیہ مخالف انقلابی شاعری کے ذریعے ہندوستانی عوام کے جذبات کو مہمیز کرنے اور انگریزوں کے حوصلوں کو پست کرنے کا کام کیا۔ہندوستان کی دیگر زبانوں کے علاوہ اردو نے تحریک آزادی میں ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا اور انقلاب کو ایک نئی آواز اور ایک نیا آہنگ دیا۔اس زبان کا جو کردار رہا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔اس کے حوالے سے بہت سی کتابیں اور تحریریں منظرعام پر آچکی ہیں جن کے مطالعے سے جدو جہد آزادی میں اردو زبان کے کردار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دراصل اردو ایک ایسی زندہ اور سخت جان زبان ہے جو ہر آڑے وقت میں اپنا رول ادا کرنے کی استطاعت رکھتی ہے یہی وہ زبان ہے جو محبت و یگانگت اور گنگا جمنی تہذیب کے گیت چھیڑتی ہے اور یہی وہ زبان ہے جو وقت پڑنے پر انقلابی بن جاتی ہے۔اردو اور دیگر زبانوں نے تحریک آزادی کے حوالے سے جو کارنامہ انجام دیا وہ تاریخ کے صفحات پر درج ہے۔اب ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم پندرہ اگست کے موقعے پر تمام مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یاد کریں اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کریں کہ انہیں کی قربانیوں کی وجہ سے ہمارے ملک کو آزادی جیسی بیش بہا نعمت نصیب ہوئی۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

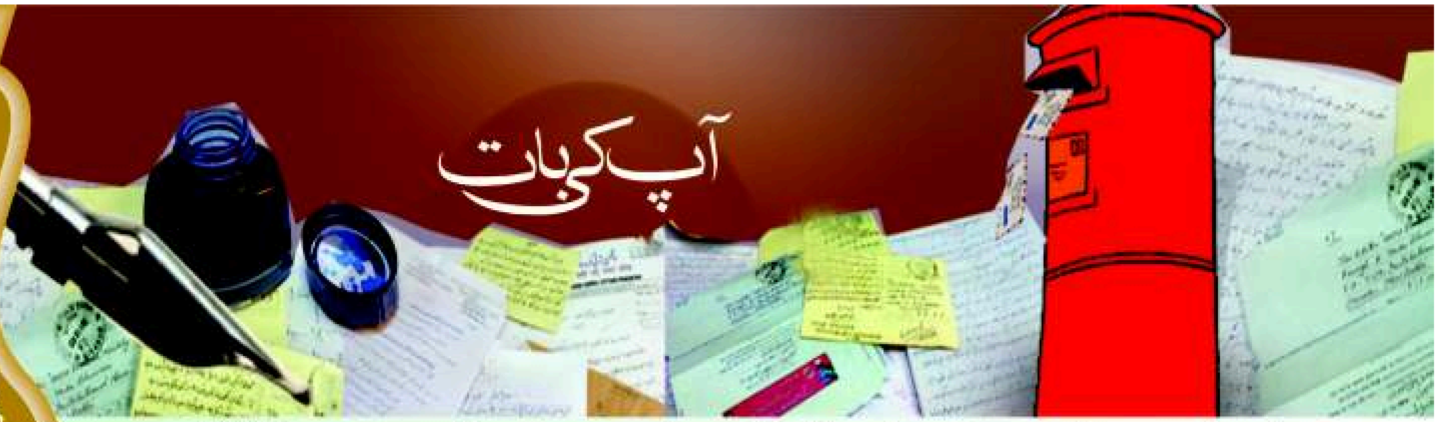

# آپ کی بات

'اردو دنیا' مارچ 2020 وصول ہوا۔ مطالعہ کے بعد تاثرات زیر تحریر تھے کہ 24 مارچ 2020 کو لاک ڈاؤن کا سندیسہ آن پہنچا کہ کرونا وائرس جیسی غیر مرئی آسمانی آفت سے برائے عافیت اپنے گھر ہی میں محفوظ رہنا ہے۔

دنیا میں آدمی کو نسبت کہاں نہیں وہ کونسی زمین ہے جہاں آسمان نہیں

باور یہ بھی کرایا جارہا ہے کہ یہ حیاتیاتی چیلنش ہے۔ ہوگی! دیکھیں کیا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اللہ تمام عالم کو اس وبا سے اپنی حفظ وامان میں سلامت رکھے۔ آمین۔ زیر نظر شمارہ کوئی تیرہ اصناف سخن میں منقسم ہے اور ان میں بھی چیدہ چیدہ نگارشات نگینوں کی طرح رکھتے دمکتے ہوئے۔ ادب کا ارتقائی ٹھہراؤ فی الواقعی فکرمندی کا مقام ہے کسی بھی زبان کی صحافت اور ذرائع ابلاغ اس زبان کو ترقی کی جانب گامزن رکھتے ہیں جہاں تک زبان اردو میں صحافت کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا اور انتہا (آزادی) تک غیر مسلم طبقہ نے ہی تمام تر جوش وخروش سے اپنا حصہ ادا کیا۔ صحافت کے اس دور کے دوران نہ صرف آزادی کی جدو جہد پر قلم اٹھایا بلکہ وطن عزیز میں طبقاتی شیرازہ بندی پر بھی توجہ مرکوز کی۔ پھر یہ سلسلہ دنیا کے دیگر اہم ممالک تک وسعت اختیار کر گیا تھا۔ اداریہ سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ ہم اردو صحافت کے تحفظ وترقی میں خلوص دل سے پیش پیش رہیں۔ مزید رہنمائی کے لیے صحافت پر اردو کونسل دہلی کی دو درجن سے زائد نادر مطبوعات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ 'خطوط' (ص 5) کے ذیل میں ص 6 پر آپ نے 'اردو دنیا' دسمبر (سنہ ندارد) کے حوالے سے توجہ دلائی کہ اقبال کے مشہور شعر 'پھول کی پتی سے...' کا غلط مفہوم دیکھ کر ازحد افسوس ہو لیکن اس غلط مفہوم کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا گیا کہ کیا غلط تفہیم ہوئی ورنہ ہم بھی غم میں برابر شریک رہتے۔ بنا دلیل کے یہ تحریر چھپنی نہیں چاہیے تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کے حقائق قدرے تفصیل طلب ہیں لیکن اطمینان کی خاطر محض اتنا عرض ہے کہ یہ شعر سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے یعنی یہ بہ یک وقت منظوم بھی ہے اور منثور بھی ایسی صورت میں غلط تفہیم کا خیال ہی خبط ہے پھر اسے برمحل استعمال کیا گیا تھا۔ اس لیے ماتم کس بات کا؟ دراصل اس کا تعلق 'اردو دنیا' نومبر 2019 کے اداریہ سے تھا۔ قطع نظر اس کے مشاہدہ باطن سے فرد اپنے منفی جذبات جیسے تکبر وتنفر پر گہری نظر اور قابو رکھ سکتا ہے خیر۔ زبان وتعلیم (ص 8) کے تحت اردو زبان کی تدریس میں مبادلہ تدریس...'' کا موضوع پیش کیا گیا ہے۔ جو فلسفیاتی بھی ہے اور نفسیاتی بھی ایسے خشک موضوع کو اتنی چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ آپ بجائے بور ہونے کے اس میں دلچسپی لینے پر مائل ہو جائیں گے۔ اس کی وضاحت چھ سرخیوں اور کچھ ذیلی سرخیوں کی مدد سے کی گئی ہے جن میں جان ڈیوی اور جین پیاجے کے غیر رسمی طریقۂ تدریس کو پیش کیا گیا ہے جس میں آموزش زیادہ موثر ہوگی، تعلیمی نفسیات کے یہ دونوں ماہرین دراصل امریکہ میں نفسیات کے بانی ولیم جیمز (1842 تا 1910) کے نظریہ تفاعلیت (Functionalism) سے متاثر تھے۔ ڈیوی اور پیاجے نے اس نظریہ کو مزید سائنٹفک انداز میں پیش کیا۔ اس تمام موضوع کو بڑی آسانی سے اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ بچہ کی شخصیت میں دماغ (Brain) اور ذہن (Mind) کے فرق کو سمجھا جائے۔ دماغ دراصل محفوظ نرم، عصبی بافتوں (Neurons) سے بنا عضو ہوتا ہے جبکہ ذہن دماغ کا وقوفی عمل (Cognitive Proces s) ہوتا ہے جس کی مدد سے تجربہ اور علم مسلسل حاصل ہوتا رہتا ہے اور جب دماغ کے ساتھ ساتھ اعضاء وعضلات پختہ ہوتے جاتے ہیں تو بچہ صحیح تلفظ کے ساتھ ساتھ بخوبی لکھ اور پڑھ سکتا ہے، یہی کل کیفیت ہے، جسے بڑی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے اور ہاں ایک جگہ پیش گوئی کی بجائے پیشن گوئی (ص 9) چھپ گیا جس کا تعلق درس وتدریس کی بجائے علم غیب سے ہوسکتا ہے غالباً یہ D.T.P کی سہو ہوگی ورنہ متن میں تو اس کے بعد لفظ پیش گوئی ہی مستعمل ہے۔ اس مضمون کی افادیت سے انکار نہیں البتہ مزید مطالعہ کے لیے قومی اردو کونسل دہلی کی مطبوعات بعنوان 'تعلیم کی نفسیاتی اساس' مترجم عبداللہ ولی بخش قادری 'انسانی شخصیت کے اسرار ورموز' از ساجدہ زیدی کے علاوہ دیگر تصانیف بھی کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ ڈی ایڈ، بی ایڈ اور ایم ایڈ کے طلبہ واساتذہ اس مضمون سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ 'نقد ونگاہ' میں کوئی چھ قابل قدر مقالے زیر نگاہ ہیں۔ 'فارسی میں درباری شاعری ایک مطالعہ' (ص 11) میں فارسی ادبی تاریخی دلکش تانا بانا پیش کیا گیا ہے، قومی اردو کونسل دہلی میں اس ادب پر بھی قابل قدر کام ہو رہا ہے اس زبان پر ہو رہی پیش رفت کی تفصیلات شمارہ کے (ص 88) پر ملاحظہ فرمائیں۔ 'قرۃ العین حیدر' (ص 14) پر یوں تو بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اس شمارے میں پیش کیا گیا مضمون اپنی پیش کش کے اعتبار سے بڑی ندرت رکھتا ہے پر شخصیات پر مضامین لکھنے سے مصنف عموماً پیش منظر میں چلا جاتا ہے۔ جائزہ کے تحت 2019 کے فکشن (ص 34) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'خراج عقیدت میں 'خدیجہ عظیم...'' (ص 42) پر لکھا گیا مضمون دلچسپ بھی ہے اور نہایت پر اثر بھی۔ مصنف کو زبان وبیان میں ید طولیٰ حاصل ہے 'شخصیات' (ص 46 تا 52) میں دیے گئے تینوں مضامین اچھے لکھے گئے ہیں ص 50 پر دیا گیا یہ شعر تو حالات حاضرہ پر خوب جچتا ہے۔ وفا ملک پوری

چاہتا ہوں کہ آپ تک پہنچوں کیا کروں راستہ نہیں ملتا

تہذیب وثقافت (ص 53) 'نیا آسمان نئے ستارے' (ص 55 تا 62) میں دیے گئے مضامین بھی بہت خوب ہیں پر ان میں 'صنف رباعی کا آغاز وارتقا' (ص 58) میں تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ بڑی شفقت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ادب پارہ ہے کہ دل کو چھو گیا۔ بالخصوص اوزان تو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'نگر نگر اردو' (ص 63) میں جلگاؤں کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ جبکہ 'سائنس' (ص 66 تا 74) میں بہت خوب سائنسی تعلیمات درج ہیں ان میں آئنسٹائن اور 'سمندر میں رہنے والی لفٹ' پسند آئے 'کمپیوٹر' (ص 75) کے تحت دیا گیا مضمون ریویو اور ویو سے کمپیوٹر سیکھنے والوں کو بہت سی نظری اور عملی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں 'کتابوں کی دنیا' (ص 78 تا 86) میں کوئی گیارہ کتابوں کا تعارف اور ان پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے جن کی مدد سے آپ حسب ضرورت کتب منتخب کر کے خرید سکتے ہیں۔ ان میں اردو قومی کونسل کی کتب معیاری مفید اور بلحاظ قیمت واجبی لگتی ہیں۔

**مصطفی ندیم خان غوری**، نزرین ویلا، B-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

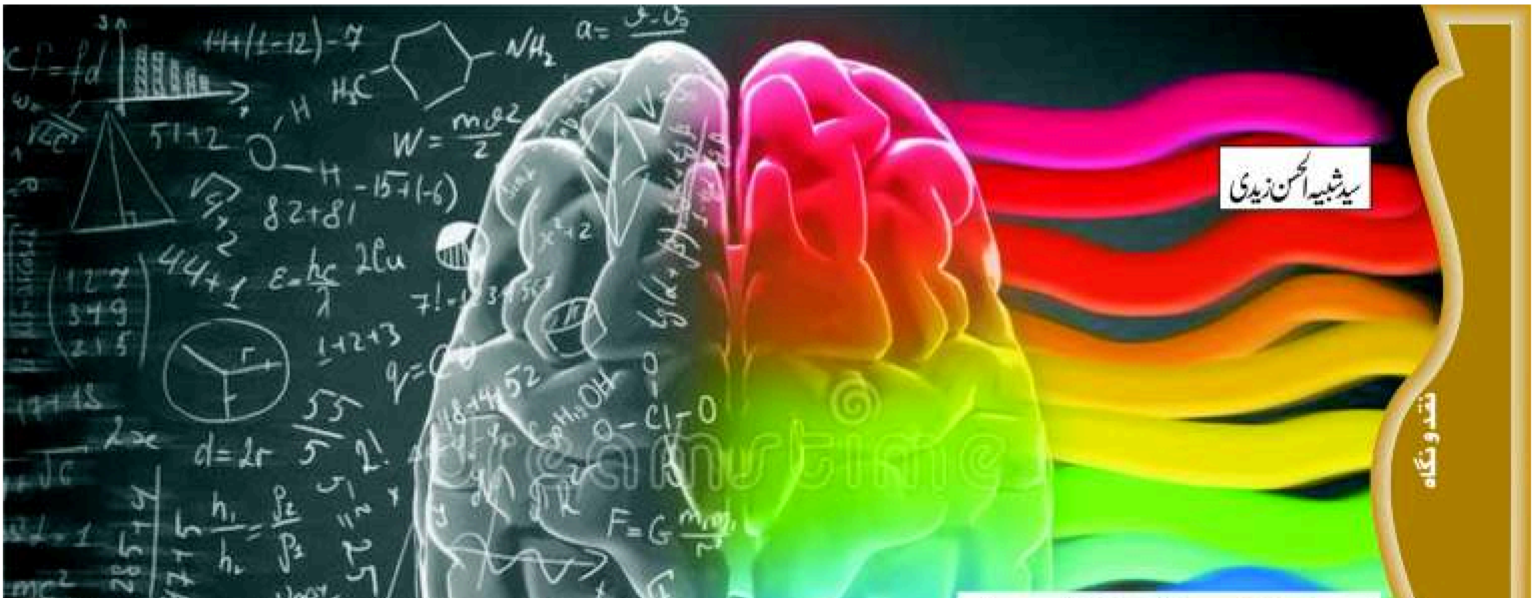

# شعور، ذہانت، علم، وجدان اور انسان

سید شبیہ الحسن زیدی

انسان کی شعوری تاریخ خصوصاً پچھلے تین ہزار سال کے دوران فلسفہ اور فلسفی علم اور عالم کے طور پر شناخت کیے جاتے رہے۔ یہ ہر ممکن انسانی علم کے مطالعے اور غور و فکر میں مصروف رہے۔ عام آبادی کو معلومات اور ہدایات فراہم کرتے رہے۔ تعلیم کے فروغ واشاعت کے ذمے دار رہے۔ انسانی معاشرے اور تہذیب وتمدن کی ترتیب وتشکیل کرتے رہے۔ انسانی ارتقا کے ساتھ علم بھی ارتقا پذیر رہا۔ اس کی ترقی، وسعت اور دائرۂ کار مختلف علمی شعبہ جات اور ماہرین میں منقسم ہوتا چلا گیا۔ یہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب کا باعث ہوا اور اب جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں عامل اور ارتقا پذیر ہے۔ فلسفہ اب ایک علمی شاخ کے طور پر انسانی وجود کی غرض وغایت اور اخلاقیات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا ہمزاد علم مابعد الطبیعیات وجودیت کو منطق واستدلال کے پس منظر میں ارتکاز تجزیات کے علاوہ موجودہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں ابھرنے والے وجودیاتی پہلوؤں کو تجرباتی اور مشاہداتی پس منظر میں زیرِ بحث لاتا ہے۔

ایک اہم مسئلہ جو فلسفے، مابعد الطبیعیات، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مشترک اور حل طلب ہے۔ وہ یہ ہے کہ شعور، ذہانت، علم اور وجدان انسانی مادی حیات میں کہاں اور کیسے محوِ کار ہوتے ہیں۔ ان کی نامیاتی بنیاد اور انسان سے تعلق کس طرح روبہ عمل ہوتا ہے۔ کیا ان کا جبر واختیار اور ماورائی پہلو بھی ہے؟

یہاں بالخصوص جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے پس منظر میں گفتگو کریں گے۔ اس حد تک اصولی طور پر اتفاق ہے کہ شعور دماغ سے ابھرتا ہے لیکن اس کے پورے میکنزم کو دریافت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جدید ترین سائنسی برقی مشینیں جو دماغ کے میکنزم کا تفصیلی مشاہدہ کرتی ہیں ان میں ای ای جی (EEG)، ایم ای جی (MEG) اور ایف ایم آر آئی (FMRI) سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف آلات کے ذریعے دماغی نیورونز اور کیمیائی باہم دگر عمل کا تفصیلی تصویری مشاہدہ ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔ زیرِ تجزیہ رکھا جا سکتا ہے۔ ڈاٹا جمع کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کے اندر اور باہر عارضی یا مستقل طور پر طبی آلات لگائے جا سکتے ہیں جو اندرونی خود پیوستہ اور خودکار بیٹری کے ذریعے کمپیوٹر اور دوسرے بیرونی برقی آلات کے زیرِ نگرانی رہتے ہیں۔ نینو بوٹس استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ 2013 میں یوروپین یونین نے دس سالہ ہیومن برین پروجیکٹ (Human Brain Project) سوئٹزرلینڈ میں قائم کیا ہے جہاں انسانی دماغ پر عالمی ریسرچ کی جا رہی ہے جو اس کی تفصیلی کارروائی کو ریکارڈ کرتے ہوئے اس کے میکنزم کا ماڈل مکمل کرے گا۔ اس دوران جاری ریسرچ کے نتائج دماغی سائنسدانوں کو مہیا ہو رہے ہیں جو ریسرچ کی ترقی اور تسلسل میں معاونت کر رہے ہیں۔ ان تمام کاوشوں کے باوجود شعور، مادی طور پر کہاں اور کس طرح وجود میں آتا ہے، مادے سے ابھرتا ہے اور روبہ عمل ہوتا ہے، ابھی تک ایک لاینحل معمہ ہے۔ طبیعاتی طور پر کوانٹم میکینکس کا سہارا لیا جا رہا ہے جو وجود اور حیات کے بنیادی ذرات بلڈنگ بلاکس کی سائنس ہے جس کے قوانین ایٹم سے بڑی موجودات پر عامل کلاسیکل طبیعاتی قوانین کے متوازی عمل پیرا ہیں۔ یہ جماداتی، نامیاتی اور حیاتیاتی موجودات کے مقررہ، متعین، متوقع، عمومی، مشاہداتی اور عملی قابل توثیق اور تجرباتی قابل تصدیق ہوتے ہیں جبکہ کوانٹم میکینکس کے قوانین پر اسرار اور بظاہر بعید از عقل معلوم ہوتے ہیں مثلاً ان کے تحت کوئی بھی عمل، واقعہ اور وجود ممکن ہے لیکن مشاہدے سے مشروط ہے۔ ایک ذرہ بیک وقت کئی جگہ یا ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ ایک منقسم ذرہ ہمزاد ہو سکتا ہے یعنی کائنات کے مختلف گوشوں میں ہوتے ہوئے بھی یک جان دو قالب ہوتا ہے۔ ذرہ بیک وقت ثنویت کا حامل ہوتا ہے یعنی ایک ہی وقت میں ذرہ بھی ہے اور لہر بھی اور بوقت مشاہدہ، حالت اور ضرورت ذرے یا لہر کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ ایک ذرے کی رفتار اور مقام میں صرف ایک کا ہی ایک وقت میں صحیح حساب اور تعین کیا جا سکتا ہے۔ ذرہ یا لہر، کوانٹا یعنی اکائیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان قوانین سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجود مشاہدے پر منحصر ہے اور کیا کسی بھی حقیقت کا صحیح علم قابل حصول ہے؟ یہی وجہ ہے کہ چند سرکردہ سائنسدان حلقوں کی رائے میں یہ قوانین نامکمل ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے ترمیم، اضافہ، تخفیف اور رد و بدل ضروری ہے حالانکہ تجرباتی مراحل میں یہ تمام قوانین عملی طور پر تصدیق شدہ ہیں اور جدید ترین ٹیکنالوجیز اور ایجادات ان ہی کی مرہون منت ہیں جن میں کمپیوٹر، اسمارٹ فون، لیزر، انٹرنیٹ، جی پی ایس سسٹم، سیٹیلائٹس، راکٹس اور دماغی برقی مشینیں شامل ہیں۔ انہی قوانین کی بنیاد پر موجود دور کے ایک رہنما برطانوی ریاضی دان اور سائنسدان

سرراجر پینروز (Sir Roger Penrose) اور امریکی اینستھیسیولو جسٹ اور سائنسدان اسٹیورٹ ہمیراوف (Sturrt Hameroff) نے بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شعور کے بارے میں ایک تھیوری پیش کی تھی جو (Orch-Or) اورک۔اور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مطابق دماغ کے اندر مائیکروٹیوبلز جو ہر خلیے میں موجود ہوتی ہیں کوانٹم میکینکس کے قوانین کے تحت لہریں ذروں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

Wave Function Collapse Occeures

جہاں سے خودشناختی اور شعور ابھرتا ہے ان میں معلومات اور یادداشت کے ذخیرے کو محفوظ کرنے اور رکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ان کا نیورل سنیپٹکز (Neural Synaptics) اور میمبرین سے رابطہ ہوتا ہے۔ ذروں کی ہمزادگی دماغ سے باہر رابطے کا سبب بن سکتی ہے اس لیے شعور کا تعلق کائناتی شعور سے قائم ہونا ممکن ہے۔ یہ سائنس کی متفقہ تھیوری نہیں ہے کیونکہ اسے عملی تجرباتی طور پر نہیں جانچا جاسکتا۔ دوسری اہم تھیوری اٹلی کے ممتاز دماغی سائنسدان اور ماہر نفسیات گیولیو ٹونونی (Giulio Tononi) نے نوبل انعام یافتہ امریکی دماغی سائنسدان جیرلڈ ایڈلمین (Gerald Edelman) کے تعاون سے 2004 میں آئی آئی ٹی (Integrated Information Theory of Consciousness) کے نام سے پیش کی تھی جس کے مطابق شعور کی بنیاد دماغ کی ساخت اور صلاحیت کہ اس میں معلومات، مشاہدات اور عملی تجربات کا ذخیرہ ہو اور ان کا آپس میں باہم دگر عمل اور مخصوص انداز (Patterns) ہم آہنگی ہو۔ یہ کارروائی داخلی اور خارجی دونوں صورتوں میں ہوتی ہے۔ اسی لیے شعور کا تعلق دماغ سے باہر قائم رہتا ہے۔ اطلاعات کے ذخیرے کی کمی بیشی اس کی سطح کا تعین کرتی ہے جو حیوانی شعور سے لے کر انسان کے مختلف درجاتی شعور طے کرتی ہے جنھیں شمار کرنے کا طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ اطلاعات کی کمی بیشی اور درجاتی شدت حرارت اور متعلقہ نامیاتی اور حیاتیاتی اثرات مادے میں تحرک کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو اس کی خودشناسی، شعور، علم اور ذہانت بن کر ابھرتے ہیں۔ تیسری قابل ذکر تھیوری امریکی دماغی سائنسدان برنارڈ بارس (Bernard Baars) نے پیش کی جسے گلوبل ورک پلیس (Global Work Place) کا نام دیا گیا۔ دماغ اس کے مطابق ایک بلیک بورڈ یا یادداشت بینک کی طرح ہے جس میں مختلف پروگرام فراہم (Load) ہوتے اور چلتے رہتے ہیں جیسے کمپیوٹر جہاں یہ دماغ کے مختلف متعلقہ حصوں میں پہنچ کر ہم آہنگ ہوتے ہیں، پیٹرنز بناتے ہوئے سوئچ آن آف کرتے ہیں جن سے شعور ابھرتا ہے۔ اس کی بنیاد پر شعور کے لیے دوسرے سائنسدانوں نے مزید ماڈلز اور تھیوریز بھی پیش کی ہیں لیکن کوئی تھیوری ابھی تک مادی عملی و تجرباتی طور پر ثابت نہیں کی جاسکی ہے۔

اس پس منظر میں ہم اب تک کامیاب ترین تجرباتی سائنس کوانٹم میکینکس کے قوانین کی جانب آتے ہیں کیونکہ مصدقہ کلاسیکل طبیعاتی قوانین صرف ایٹم سے بڑی مادی موجودات پر عامل ہوتے ہیں جبکہ شعور اس زمرے میں نہیں ہے بلکہ موجودات سے ابھرتے ہوئے اثر (Energent Property) میں شامل ہے۔ موضوعی بھی ہے اور معروضی بھی۔ شعور کی اگلی منزل ذہانت سے ہوتی ہوئی علم تک پہنچتی ہے جہاں باب وجدان وا ہوسکتا ہے۔ کوانٹم قوانین ان منازل کے ماخذ، رسائی اور ترکیب وساخت سے بہرہ ور ہونے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ قانون ہمزادگی ان کی موضوعی، معروضی اور ماورائی حیثیت کو ممکن بناسکتا ہے۔ قانون انطباق یعنی ایک ذرہ بیک وقت ہر جگہ موجود ہوسکتا ہے، اس کی توثیق کرتا ہے اور قانون ثنویت یعنی ذرہ بوقت مشاہدہ یا ضرورت ذرہ بھی ہوسکتا ہے اور لہر بھی شعور کی نوعیت سے ہم آہنگ ہے۔ کوانٹم قوانین شعور اور اس کی تمام اعلیٰ تر منازل یعنی ذہانت، علم اور وجدان کی تشریح و توضیح کرسکتے ہیں۔ ان کے مطابق کائنات میں ہر طرح کی موجودات، واقعات اور حالات یقینی نہیں ہوتے بلکہ ممکن ہوتے ہیں یعنی عالم امکان یقینی ہے اور عالم وجود غیر یقینی۔ انسان میں دماغ ہی وہ عضو خاص ہے جو اطلاعات اور معلومات (Information) کے لیے اینٹینا، ترسیل و وصول اور نشر و اعلان کا اسٹیشن ہے جہاں متعلقہ کارروائی عمل میں آتی ہے۔ دماغ نامیاتی حیاتیاتی ہے۔ جینوٹائپ اور فینوٹائپ کے تابع ہے۔ نظام تولید کا محتاج ہے۔ اس لیے منفرد ہے۔ ہر انسان شعور وعقل کے مختلف درجات میں ہے۔ بے ترتیب، منقسم، اتفاقی اور حوالہ جاتی ہے۔ اسی لیے کوئی ناقص ہے کوئی کامل، کوئی احمق ہے کوئی عاقل، کوئی جاہل ہے کوئی عالم، کوئی دانا ہے کوئی نادان، کوئی صاحب حکمت ہے اور کوئی صاحب وجدان، انفرادی جینز اجتماعی جینز پول میں منعکس ہوتی ہیں جو اجتماعی شعور کا ماخذ بن جاتی ہیں جہاں ذہانت کے چشمے ابلتے ہیں، علم کے دریا نکلتے ہیں اور وجدان کی شفق پھوٹتی ہے۔ اسی سے انسان قدرتی ذہانت سے مصنوعی ذہانت کی تشکیل کررہا ہے۔ عام حقائق سے مصنوعی حقائق یعنی ورچول ریلٹی (Virtual Reality) ایجاد کررہا ہے۔ قدرتی ارتقا کو تابع کرتے ہوئے اپنی نسل کو اپنی ضرورت، خواہش اور اہداف کے مطابق مرتب کررہا ہے۔ سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ایجادات سے کرۂ ارض سے باہر دوسرے کائناتی کروں، چاند اور خلائی اجسام میں آبادی کے منصوبے بنارہا ہے اور بالآخر

**انسان قدرتی ذہانت سے مصنوعی ذہانت کی تشکیل کررہاہے۔ عام حقائق سے مصنوعی حقائق یعنی ورچول ریلٹی (Virtual Reality) ایجاد کررہاہے۔ قدرتی ارتقا کو تابع کرتے ہوئے اپنی نسل کو اپنی ضرورت، خواہش اوراہداف کے مطابق مرتب کررہاہے۔ سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ایجادات سے کرۂ ارض سے باہر دوسرے کائناتی کروں، چاند اور خلائی اجسام میں آبادی کے منصوبے بنارہاہے اور بالآخر ایک سائبورگ (Syborg) خلائی مخلوق کی صورت اختیار کرنے کی جستجو میں ہے۔**

ایک سائبورگ (Syborg) خلائی مخلوق کی صورت اختیار کرنے کی جستجو میں ہے۔

کوانٹم میکینکس ابھی تک تمام جدید ترین انسانی ایجادات کی بنیاد بنی ہے۔اس کے قوانین کے مطابق مستقبل کے تمام انسانی منصوبے اصولی طور پر ممکن الحصول ہیں۔جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، کچھ سرکردہ سائنسدان کوانٹم میکینکس قوانین کی پراسراریت اور بظاہر چند بعید العقل پہلوؤں کے علاوہ ان کا صرف ایٹم اور تحت ایٹم ذرات پر عامل ہونے کی وجہ سے نامکمل سمجھتے ہیں۔ان میں اس دور کے دو(2) سرکردہ سائنسدان سر روجر پینروز (Sir Roger Penrose) اور لی سمولن (Lee Smolin) شامل ہیں جبکہ البرٹ آئنسٹائن بھی جو ان قوانین کی دریافت اور مرتب کرنے والوں کا پیشرو تھا، ان کی کاملیت سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ بہت سے رہنما سائنسدان پچھلے سو سال (100) سے اس کی ممکنہ تکمیل اور متوازی کلاسیکل طبیعاتی قوانین جو ایٹم سے بڑے اجسام پر عامل ہوتے ہیں، ان کے امتزاج کے لیے کوشاں ہیں تاکہ وہ ایٹم سے چھوٹے اور ایٹم سے بڑے ذرات و اجسام پر یکساں اثر انداز اور عامل ہوں۔ یہ درحقیقت ایک تھیوری آف ایوری تھنگ کی شکل ہوگی جس کی تلاش میں عظیم سائنسدان البرٹ آئنسٹائن اپنی زندگی کے آخری تیس سال صرف کرنے کے باوجود تشنہ کام رہا۔تھیوری آف ایوری تھنگ کا مطلب یہ ہوگا کہ قدرت کے تمام عامل قوانین انسانی کی دسترس میں آجائیں اور کائنات کے تمام راز آشکار ہوجائیں تاکہ انسان کے لیے کائنات میں کچھ بھی ناممکن نہ رہے۔

موجودہ صورت میں کوانٹم میکینکس کے بارے میں ایک اور بڑا سوال اٹھتا ہے کہ کیا مشاہدے کے بغیر حقیقت کا وجود نہیں ہے؟ کیا وجود کسی شاہد کا محتاج ہے۔شاہد کون ہے رہو اور اس کے مشاہدے کا حقیقت سے کیا تعلق ہے۔ کیا وجود کسی شاہد کے بغیر وجود نہیں ہے اور اگر وجود خود ہی وجودیت ہے تو شاہد کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت غالب کے وجدان نے دوسو سال پہلے یہ سوال اٹھایا تھا کہ:

اصل شہود وشاہد ومشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یہ سوال ہمیں کوانٹم میکینکس سے مابعد الطبیعات کی جانب لے آتا ہے۔اس کی اطمینان بخش تشریح مشکل امر ہے کیونکہ اس میں میٹا فلاسفی اور میٹا سائیکولوجی کے عناصر بھی شامل ہیں اس لیے اس کا عام مفہوم فزکس سے باہر آگے یا علاوہ لیا جاتا ہے حالانکہ قبل از مسیح دور میں یونان کے عظیم فلسفی اور عالم ارسطو (Aristotle) نے اس موضوع پر پہلی کتاب 'میٹا فزکس' کے عنوان سے ہی تحریر کی تھی اور اسے فرسٹ فلاسفی یعنی علم اول قرار دیا تھا۔الفاظ اور زبان کی پیچیدگیوں سے قطع نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حقیقت اور مجاز کے تصورات پر غور وفکر کا علم ہے۔ ہر شے جو نظر آتی ہے اس کی اصلیت تک پہنچنے کے طریق وعمل اختیار کرنے اور تجزیہ کرنے کا علم ہے۔

ہر شے کے ظاہری وجود، رنگ وروپ کے پس پردہ پوشیدہ عناصر وعوامل کو معلوم کرنے اور بیان کرنے کو مابعد الطبیعاتی کارروائی کہا جاسکتا ہے۔ ہر حقیقت کے حوالہ جات اور علت ومعلول کی کھوج، پرکھ، جانچ پڑتال، تفتیش، حصول معلومات اور حتی الامکان حصول شدہ نتائج کا اعلان، منطق ودلیل، تبصرہ اور بحث مابعد الطبیعاتی گفتگو، درس، تقریر، خطاب یا تحریر ہوگی۔ منطق بینی کی روشنی میں یہ گہری سوچ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا حقیقت ہے اور کیا مجاز، کیا معقول ہے اور کیا غیر معقول، کیا متوقع ہے اور کیا غیر متوقع، کیا ممکن ہے اور کیا ناممکن، کیا ہم آہنگ ہے اور کیا غیر ہم آہنگ؟ ایک مابعد الطبیعاتی عالم کا خصوصی دائرۂ فکر ونظر ہے۔

**انیسویں صدی عیسوی کے ایک اہم جرمن فلاسفر آرتھر شوپنہار (Arthur Shopenhauer) نے ہمہ نفسیات پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔اس کے مطابق ہمارا علم کائناتی علم کا حصہ ہے جو ہماری ذات میں ابھرتا ہے اورمابعد الطبیعاتی تسلسل ہے۔ آئنستائن نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے جو انگریزی زبان میں زیادہ مناسب مفہوم پیش کرتی ہے۔**

وجود، وجودیت، وجودیات اور موجودات مابعد الطبیعات کا اہم موضوع ہے۔قدیم فلسفے میں بھی وجود کے بارے میں غور وفکر، تحقیق، اجتہاد اور بحث مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ زمانہ قبل از مسیح کے ایک اور عظیم یونانی فلسفی افلاطون (Plato) کے مطابق وجود کا تصور بہت وسیع تھا یعنی کہ نہ صرف ہر مادی اور قابل مشاہدہ شے بلکہ ان کی صفات کا بھی اپنا علیحدہ وجود ہے۔اسی طرح یونیورسلز مثلاً سرخ رنگ جو مختلف النوع اشیا میں مشترک ہوسکتا ہے اپنا الگ وجود رکھتا ہے۔انسانی کردار واخلاق جیسے شجاعت ورحم دلی وغیرہ کا بھی الگ الگ وجود ہے۔ خواب وخیال، تصور، ہر ممکن کائناتی اجسام، صفات وعوامل ریاضی کے ہندسے اور جیومیٹری کی اشکال وغیرہ سب کا علیحدہ وجود ہے۔

جدید فلسفے اور مابعد الطبیعیات میں وجود، صفات، اشکال وخیاال کی جداگانہ تعریف ہے۔ واضح اصول، شناخت وقوانین ہیں جیسے مادی کمیت ومقدار کا تعین، حدود وشماریات طے کی جاسکیں قطعی تفصیلات معلوم کی جاسکیں جو مادی، واقعاتی او رمشاہداتی وجود، تجربات اور منطق واستدلال سے سچ ثابت ہوں گو کہ کسی بھی وجود کا ظاہر باطن سے مختلف ہوسکتا ہے۔ایک مثال 'سوراخ' کی دی جاسکتی ہے جو بظاہر موجود ہے لیکن نہیں بھی ہے کیونکہ خلا ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے مشہور آسٹرین فلسفی الیکسیس مائینونگ (Alexius Meinong) کے نزدیک ہونے (Being) اور وجود (Existence) میں فرق ہے۔ ہونے سے مراد کسی وجود کے ہر متعلقہ پہلو، ظاہر وباطن اور صفات واثرات سے ہے۔اگر 'ہونے' کو 'وجود' سے جدا کردیا جائے تو وہ صرف سرشت، تصوراتی، صفاتی، خیالی اور اساطیری ہوسکتا ہے۔

کوانٹم میکینکس کے قوانین نے کلاسیکل فزکس کے قوانین کے محض مادی وجود اور ان کی صفات کی مادی اختصاصیت کہ صرف مادی تجرباتی عملی طور پر ہی ان قوانین کا اطلاق ممکن ہے کو تبدیل کردیا۔ان کے مطابق مابعد الطبیعیات کوانٹم میکینکس سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہوسکتا ہے جبکہ مابعد الطبیعیات وجود کی مادی اور غیر مادی صفات کے علاوہ وحدت الوجود (Pantheism) اور ہمہ نفسیات (Panpsychism) دونوں سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔ وحدت الوجود نہ صرف سائنسی کوانٹم میکینکس بلکہ سائنسی کلاسیکل قوانین کے بہت سے پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے کیونکہ بنیادی بلڈنگ بلاکس، کوارکس، الیکٹرون (ایٹم) فوٹون اور نیوٹرینو ہر ممکن کائناتی وجود کی بنیاد ہیں۔ایٹمز پر مشتمل مولی کیولز گیس سے لے کر مائع، جمادات، نباتات وحیوانات اور کرۂ ارض سے لے کر سورج، دوسرے ستارے، سیارے اور کہکشائیں بمعہٗ ہر قسم کے کائناتی موجودات کے وجود وکارکردگی کا باعث ہیں۔جہاں تک ہمہ نفسیات کا تعلق ہے اسے عمومی طور پر انسان سے وابستہ کیا جاتا ہے کیونکہ یہ مادی دماغ کی غیر مادی صفات کی عکاسی بھی کرتا ہے لیکن فلسفی نظریے کے مطابق یہ ہر کائناتی وجود کے متعلق ہے یعنی ہر ممکنہ وجود کا اپنا دماغ ہے جو سب کی بنیاد میں موجود ہے۔انیسویں صدی عیسوی کے ایک اہم جرمن فلاسفر آرتھر شوپنہار

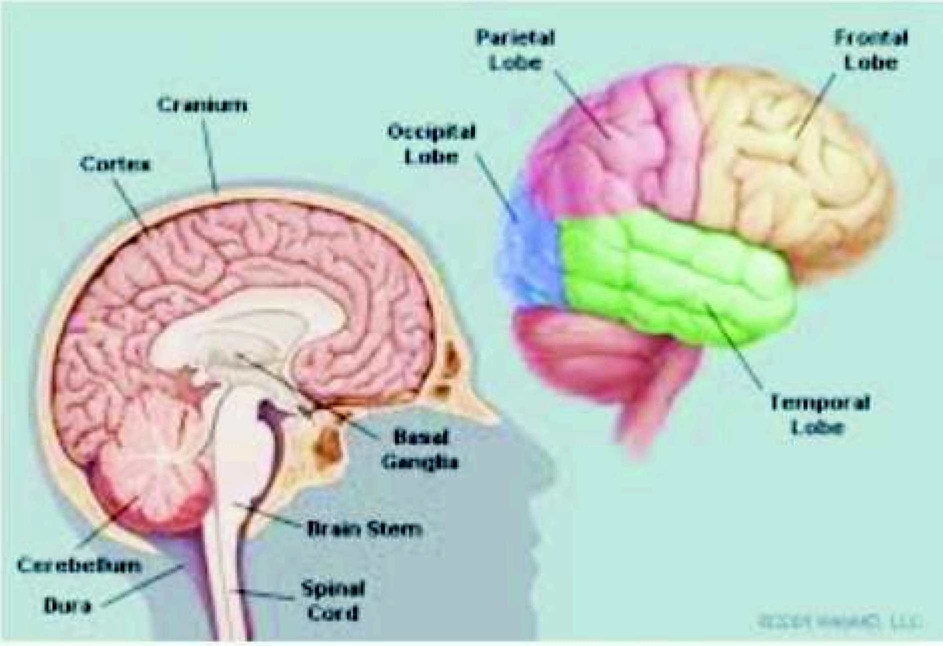


(Arthur Shopenhauer ) نے ہمہ نفسیات پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے مطابق ہمارا علم کائناتی علم کا حصہ ہے جو ہماری ذات میں ابھرتا ہے اور مابعد الطبعیاتی تسلسل ہے۔ آئنسٹائن نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے جو انگریزی زبان میں زیادہ مناسب مفہوم پیش کرتی ہے۔

" A man can do as he will but not will as he will"

''ایک انسان جو چاہے کرسکتا ہے لیکن وہ کیا چاہے نہیں چاہ سکتا۔''

شوپنہار نے اپنے نظریات میں گوتم بدھ کے بہت سے نظریات کی توثیق بھی کی ہے۔ موجودہ دور میں ہمہ نفسیات نظریے کی توضیح، تشریح اور پرچار میں آسٹریلوی فلاسفر ڈیوڈ چارلمرس (David Charlmers ) نمایاں ہیں۔ اس نظریے کا عملی طور پر منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات اور ہماری دنیا میں ہر جماداتی، نباتاتی اور حیاتیاتی شے کا اپنا دماغ ہے جو کائناتی دماغ کا حصہ ہے قطع نظر اس کی ظاہری ماہیت، صلاحیت، مواد اور صفات کے۔ موجودہ دور کے ایک اور سائنسدان اور فلاسفر برطانوی روپرٹ شیلڈریک (Rupert Sheldrake ) اس نظریے کی رو سے شعور کو ایک علیحدہ کائناتی قوت قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک بنیادی ذرات اور کائناتی بلڈنگ بلاکس کا سوال ہے وہ اس میں نظریۂ وحدت الوجود سے مختلف نہیں ہیں لیکن جب ارضی غیر حیاتیاتی کثیر الخلیاتی موجودات کا حوالہ ہوتا ہے جیسے کوئی برتن، میز، لیمپ، اسٹینڈ، پکچر فریم وغیرہ تو انسانی عقل سلیم کو دھچکا لگتا ہے اور جدید فلسفے اور مابعد الطبعیاتی منطق واستدلال کی حدود بشریاتی حوالے (Anthropological ) سے پگھلنے لگتی ہیں۔ موجودہ دور میں اکثر رہنما سائنسدان اور فلاسفرز کو اس کے بارے میں مختلف النوع تحفظات ہیں۔ اہم پہلو یہ ہے کہ تمام کائنات کو صرف انسانی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اب تک معلوم شدہ کائنات کی وسعت انسان کے مادی وجود کے لیے اس تناسب سے بے شمار زائد ہے جو ریت کے ایک ذرے کا انسان سے ہے۔ کرۂ ارض نظام شمسی کا ایک درمیانہ درجہ کا سیارہ ہے جبکہ یہ نظام شمسی ہماری کہکشاں 'ملکی وے' (Milky way ) کے دو بلین (2B) سے زائد نظام ہائے شمسی میں سے ایک ہے۔ ملکی وے کہکشاں اندازاً تین ٹریلین (3T) کہکشاؤں اور کائناتی اجسام میں سے ایک ہے۔ انسان صرف کرۂ ارض پر ہی عالم وجود میں آیا ہے اور موجودہ ذہین انسانی نسل کی صورت میں آباد ہے۔ اس لامتناہی کائنات میں اور کتنی ذہین، ذہین تر یا ذہین ترین مخلوقات موجود ہیں۔ وہ کس کرے کے نظام شمسی، کہکشاں یا کائناتی جسم پر آباد ہیں۔ ان کی ماہیت، مواد، قسم، نوعیت، صفات، صلاحیت، اہداف ودائرۂ کار ابھی تک نامعلوم ہے۔ اس لیے جب ہم کائنات کی بات کرتے ہیں منبع نور اور منبع علم کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا محور انسان نہیں ہوتا۔ نور اور علم لاتعداد کائناتی اجسام، کائناتی مخلوقات اور کائناتی عجائبات میں بکھرا ہوا ہے۔ نسل انسانی بھی انہی چند کرنوں اور ذروں کی حصہ دار ہے۔ بشری بے ترتیبی، بے یقینی، حادثاتی، نامیاتی تقاضوں اور جبر واختیار کے تحت برسرعمل ہے۔ اب تک معلوم شدہ قوانین قدرت اٹل ہیں۔ وہ کلاسیکل طبعیات کے ہوں یا کوانٹم میکینکس، دوسرے متعین قدرتی مستقلیات، عوامل اور کائناتی قوتیں ہوں یا اب تک نامعلوم ہوں، عامل وجاری ہیں۔

بشری توضیحات، تشریحات، معلومات، مفروضات، توقعات، نافذات، اعتقادات، اعمال اور طریقہ ہائے کار ناقص ہوسکتے ہیں لیکن قوانین قدرت کامل ہیں۔ سائنسدانوں کے لیے کلاسیکل اور کوانٹم قوانین کو ہم آہنگ کرنے کے لیے یہی سب سے اہم محرک ہے جو بالآخر تھیوری آف ایوری تھنگ کی منزل ہے۔

سائنس، تجرباتی اور مشاہداتی طور پر تمام کائناتی موجودات کی ایک ہی بنیاد ثابت کرتی ہے۔ مادہ اور نور متبادل ہیں۔ ہر ذرہ متصل ہے اور لہر کی صورت میں مسلسل ہے جو زمان ومکان کی چادر میں گندھا ہوا ہے۔ منبع نور وعلم بھی اسی چادر میں ہیں۔ کرۂ ارض پر انسانی حیات کے لیے جینز، شعور، ذہانت اور علم اجتماعی پول کی شکل میں نمائندہ ہوتی ہے۔ کسی مفروضہ خلائی مخلوق کے لیے موجودہ ارضی نامیاتی نسل انسانی کی شناخت اس کی سائنس اور

**اب تک معلوم شدہ کائنات کی وسعت انسان کے مادی وجود کے لیے اس تناسب سے بے شمار زائد ہے جو ریت کے ایک ذرے کا انسان سے ہے۔ کرۂ ارض نظام شمسی کا ایک درمیانہ درجہ کا سیارہ ہے جبکہ یہ نظام شمسی ہماری کہکشاں 'ملکی وے' (Milky way ) کے دو بلین (2B) سے زائد نظام ہائے شمسی میں سے ایک ہے۔ ملکی وے کہکشاں اندازاً تین ٹریلین ( 3 T) کہکشاؤں اور کائناتی اجسام میں سے ایک ہے۔ انسان صرف کرۂ ارض پر ہی عالم وجود میں آیا ہے۔**

ٹیکنالوجیکل ترقی، ایجادات اور برقی رابطوں اور سگنلز کے ذریعے ممکن ہے۔ نسل انسانی کے سابقہ ترقی شدہ ادوار کی طرح موجودہ دور میں اس کے تہذیبی رہنما علم جدید کے رہنما ہوں گے جو سائنس کے عالم ومجتہدین۔ اور ٹیکنالوجی کے موجدین ہیں۔ ماڈرن انسانی نسل کی ترقی کے ہر دور میں چند انفرادی نام اور علاقائی تہذیبوں کے نام تاریخ میں رقم ہوجاتے ہیں لیکن مجموعی نسلی ارتقا اور تہذیبی ترقی اجتماعی پول کے ذریعے ہوتی ہے جس میں بے شمار انفرادی شرکت شامل ہوتی ہے گوکہ اکثریت کی حصہ داری گمنام، پوشیدہ اور پس پردہ رہتی ہے۔

■

**SYED SHABEEHUL HASAN**
184A, LIGHTWOODS HILL
SMETHWICK, WEST MIDLANDS
B67 5EH, UK

عبدالبرکات

# جمہوری ادب کا تصور اور وقتی تقاضے

> طرز فکر، انداز احساس و جذبات، دکھ، غم، خوشی یکساں اور بھوک و پیاس کی شدت میں مماثلت بنیادی انسانی اقدار ہیں۔ چاہے انسان زمین کے کسی بھی خطہ میں رہے اور کسی بھی حالت میں رہے، ہر علاقہ، نسل اور مذہب کے افراد میں یہ قدریں موجود ہوتی ہیں۔ ترحم، خوشی، غم، افسوس، مسرت وغیرہ لطیف جذبات و محسوسات ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے جوڑتے ہیں۔

فرد اور معاشرہ فنونِ لطیفہ سے مربوط رشتہ رکھتے ہیں بلکہ فنونِ لطیفہ اور زندگی و معاشرتی نظام لازم و ملزوم ہیں۔ فنونِ لطیفہ بشمول شعر و ادب گاہے ان سے متحرک ہوتے ہیں، گاہے فرد و معاشرہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دورِ جمہور جن میلانات و رجحانات کے ساتھ رواں دواں ہے اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ فنونِ لطیفہ اور دیگر تمام تخلیقات و معروضات عوامی خیالات و جذبات اور محسوسات کی ترجمانی سے نئی انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ آج فنونِ لطیفہ کے حصار، خواص سے پھیلتے ہوئے عوام تک پہنچ گئے ہیں لہٰذا تخلیقات کے موضوعات اور تکنیک متنوع ہونے کے ساتھ انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب نابغۂ روزگار فنکار و قلم کار اور ناقدین نظریہ سازی کے عمل سے گزرتے ہیں تو ماحولیاتِ انسانی فلاح و بہبود پاتے ہیں اور معاشرتی نظام ترقی پسندانہ اقدام کے حامل بنتے ہیں جن کے دائمی اثرات فرد و معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ذہین اور شائستہ وارفع دماغ افراد معدودے چند ہوتے ہیں جن کے تصورات و افکار خواص و عوام سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان ہی کی کاوشوں سے پوری انسانی برادری اور سماج (چاہے وہ جس میدان میں کارنامہ انجام دیں) مستفیض ہوتے ہیں۔ نتیجتاً جب بھی معاشرتی نظام ایک نئی کروٹ لیتے ہیں تو نیا منظر نامہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک آزاد معاشرتی نظام میں ہی جذبات و خیالات اور تصورات کو نشو و نما پانے اور اس پر عمل درآمد کے بہترین مواقع میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے نئے نئے تصورات کی توسیع ہوئی، عوام میں نئی بصیرت کا ظہور ہوا اور دھیرے دھیرے نظام شاہی اپنا بستر لپیٹنے لگا جو شخصیت پرستی، خود غرضی اور استحصال پر مبنی تھا اور جمہوری نظام کا سورج جلوہ فگن ہوا۔ پھر نابغۂ روزگار ہستیوں کے افکار و تصورات کے جوہر کھل کر سامنے آگئے۔ نئی نئی ایجادات، افکار و نظریات نے پوری دنیا کو نئی تہذیب کا چولا پہنایا۔

معاشرتی نظام، جغرافیائی حالات اور معاشی و سیاسی صورتِ حال کے اثرات؛ نہ صرف انسان کی جسمانی ساخت، حالات و معاملات پر پڑتے ہیں جس سے طرزِ زندگی کا تعین ہوتا ہے بلکہ انسانی خصائل بھی متاثر ہوتے ہیں اور آدمی کے اشکال، لسان اور لباس و اطوار میں نمایاں فرق رونما ہوتا ہے۔ تاہم انسانی اقدار اور انسانیت آمیز امور میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انسانیت بھی روح کی طرح لطیف و شفاف ہوتی ہے جس پر خارجی دباؤ کے اثرات بہت کم ہوتے ہیں اور اس کی بنیادی قدروں میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ طرزِ فکر، انداز احساس و جذبات، دکھ، غم، خوشی یکساں اور بھوک و پیاس کی شدت میں مماثلت بنیادی انسانی اقدار ہیں۔ چاہے انسان زمین کے کسی بھی خطہ میں رہے اور کسی بھی حالت میں رہے، ہر علاقہ، نسل اور مذہب کے افراد میں یہ قدریں موجود ہوتی ہیں۔ ترحم، خوشی، غم، افسوس، مسرت وغیرہ لطیف جذبات و محسوسات ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے جوڑتے ہیں۔ خواجہ میر درد کا کہنا ہے:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

اس تناظر میں علاقائی ادب اور عوامی ادب جمہوری دور کا متقضی ہے کیوں کہ ہر خطہ یا علاقہ اپنی بولی اور زبان کا متحمل ہوتا ہے جس میں ان کی تہذیب و ثقافت جلوہ گر

ہوتی ہے۔ غالباً اسی لیے مابعد جدیدیت نے علاقائیت کو اساس بنایا ہے اور فرد کی اہمیت و افادیت کو اپنی فکر کا محور گردانا ہے کہ انسان خواہ کسی خطہ، علاقہ اور قوم و نسل کا ہو، اس کی انفرادیت اور اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب جمہوری نظام کا نفاذ مکمل طور پر ہو، کیوں کہ جمہوریت ختم ہونے کے بعد دہشت کا راج قائم ہو جاتا ہے لہٰذا انسانیت کی بقا کے لیے اس زمین پر جمہوری نظام ناگزیر ہے۔ اس صورتِ حال میں ہی انصاف ممکن ہے۔

ادبِ عالیہ کی تخلیق اس وقت ممکن ہوتی ہے جب انسان کی مسرت و انبساط، محبت و الفت، غم و الم، دکھ درد، کامیابی و ناکامی نیز سماج کے مجبور سے مجبور انسان کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ آدمیوں کے دمیان کی تفریق ختم کی جا سکے اور ان میں ایک دوسرے کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو؛ کیوں کہ ادب کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہیں۔ درحقیقت ادبِ عالیہ اعلیٰ ترین دماغ کی کاوش ہوتا ہے، غالباً اسی لیے 1950 کے نوبل انعام کی ایک تقریب میں ولیم فالکنر نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

''یہ اعزاز شاعر و ادیب کا ہے کہ وہ انسان کے حوصلے بڑھا کر اُسے دکھ برداشت کر لینے میں مدد دے اور اس کے دل میں جرأت اور احترام اور امید اور پندار اور احساس اور رحم اور ایثار کی یاد تازہ کرتا رہے۔ یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت اس کا ماضی اب بھی تابناک ہے۔ شاعر کی آواز کے لیے یہ چنداں ضروری نہیں کہ وہ انسان کی محض روداد ہو بلکہ یہ آواز تو تحمل و برداشت کے علاوہ مشکلات پر غالب آنے پر بھی اُبھار سکتی ہے۔'' (ترجمہ محمد اسلم)

(بحوالہ روزنامہ 'انقلاب' 19 اپریل 2020، سنڈے، ص 6)

دراصل 1917 کے انقلابِ روس نے زارشاہی کا تختہ پلٹ کر سارے ایشیا کی محکوم قوموں میں عوامی جمہوریت کی نئی لہر دوڑا دی اور پوری دنیا کے لیے ایک جمہوری طرزِ حکومت کے دروازے کھول دیے۔ رفتہ رفتہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ جمہوری طرزِ حکومت قائم ہو گئی جس کے تناظر میں ادب اور فنونِ لطیفہ کے مقاصد اور افادیت پر از سرِ نو غور و فکر کیا جانے لگا اور ترقی پسندانہ رجحان عام ہونے لگا۔ ادب میں بھی خرد افروزی اور معروضی طریقۂ کار فروغ پانے لگا۔ شعراء ادبا؛ عوامی مسائل اور ان کی کشمکشِ حیات میں 'حسن کی معراج' دیکھنے لگے۔ معاشرتی زندگی میں آپسی ہم آہنگی پروان چڑھنے لگا۔ لہٰذا رابندر ناتھ ٹیگور نے قلم کاروں کو پیغام دیا کہ:

''ادیبوں کو انسانوں سے مل کر انھیں پہچاننا چاہیے۔ میری طرح گوشہ نشیں رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ایک مدت تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں جو غلطی کی ہے اَب میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضہ ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔''

(بحوالہ 'ترقی پسند تحریک اور اردو کا ظریفانہ ادب' ڈاکٹر عبدالبرکات، ص 45، 2019)

اس طرح ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادبا، شعرا اور قلمکاروں نے اپنی توجہ عوامی زندگی اور معاشرتی معاملات و مسائل کی طرف مبذول کیا جس سے ادب کا کینوس وسیع ہوتا گیا۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کا رُخ خواص کے ساتھ عوام کی طرف بھی موڑ دیا جس کے طفیل فرد و معاشرے کے مسائل ضبطِ تحریر میں آنے لگے۔ اسی طرح مابعد جدیدیت نے علاقائی معاملات و مسائل اور علاقائی زبان و تحریر کی طرف ادب کی توجہ مبذول کرائی جس کی وجہ سے علاقائی زبانوں کے بہت سارے معتبر الفاظ اور ایسے محاورے و ضرب الامثال مرکزی ادب سے روبرو ہوئے جن سے انسان کے فکری میلان اور طرزِ زندگی کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ نیز علاقائی تاریخ، تہذیب اور ثقافت؛ ادبی منظرنامہ پر سامنے آنے لگے۔ آج ہر علاقہ سے شاعر، ادیب اور قلم کار علاقائی زبان اور لب و لہجہ کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہو رہے ہیں۔ ابتدائی ادب، روسا اور مخصوص افراد کے معاملات و مسائل اور طرزِ زندگی تک محدود تھا جس کو ترقی پسند تحریک نے خواص سے عوام تک وسیع کر دیا جب کہ جمہوری ادب خواص سے عوام تک کے قلم کاروں اور فنکاروں کو اپنی حصہ داری کا متقاضی ہے جس سے مرکزی ادب کا دامن وسیع و متنوع ہوگا اور ادب کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا لہٰذا سماج کے ترقی یافتہ افراد کے ساتھ عام عوام کے امور اور رموز معاملات جب ادب کے سانچے میں ڈھل جائیں تو میرے خیال سے ایسی تحریروں کو جمہوری ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حقیقتاً کسی نظریہ کے تحت تخلیق ادب کی جستجو ممکن نہیں کیوں کہ انسانی دماغ سیمابی ہوتا ہے۔ بہت دنوں تک وہ ایک ہی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ نئے نئے شاخسانے نکالتا رہتا ہے جو فرد و معاشرے کے لیے تغیر و تبدل کا موجب بنتا ہے اور نظامِ زندگی کے ساتھ معاشرتی نظام پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''......انسان زیادہ لمبے عرصے تک یکسانیت اور یک رنگی کو قبول نہیں کر سکتا اور اس کے داخل میں تغیر کی آرزو خود بخود کلبلانے لگتی ہے۔ تغیر کی یہ خواہش بذاتِ خود اتنا بڑا محرک ہے کہ ارتقائے کائنات کے بیشتر زاویے اسی کے مرہونِ منت نظر آتے ہیں۔''

(''اردو ادب کی تحریکیں: ڈاکٹر انور سدید، ص 27، اشاعت ہشتم 2013، انجمن ترقی اردو پاکستان)

اس تناظر میں ادبی نظریہ کا متاثر ہونا بھی لازمی ہے لیکن بہر صورت انسان اور انسانیت کی بقا سے قطعی انحراف

**ادب عالیہ کی تخلیق اس وقت ممکن ہوتی ہے جب انسان کی مسرت و انبساط، محبت و الفت، غم و الم، دکھ درد، کامیابی و ناکامی نیز سماج کے مجبور سے مجبور انسان کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ آدمیوں کے دمیان کی تفریق ختم کی جاسکے اور ان میں ایک دوسرے کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو؛ کیوں کہ ادب کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہیں۔**

**سنسار میں انسان ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور مرکز سے قطع تعلق کر کے کوئی بھی رجحان یا تحریک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، وہ کٹی پتنگ بن جائے گی جس کا زمیں بوس ہونا طے ہے۔ اسی اصول کے تحت بہت سارے رجحانات اور تحریکات مثلاً علی گڑھ تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، وجودیت، جدیدیت، تعمیریت، مابعد جدیدیت وغیرہ معرض وجود میں آتی رہی ہیں اور ان میں وہی تحریک مقبول و عزیز رہی ہے جس میں انسان اور اس کی بقا کو محور بنایا گیا ہے۔**

نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ سنسار میں انسان ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور مرکز سے قطع تعلق کرکے کوئی بھی رجحان یا تحریک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، وہ کٹی پتنگ بن جائے گی جس کا زمین بوس ہونا طے ہے۔ اسی اصول کے تحت بہت سارے رجحانات اور تحریکات مثلاً علی گڑھ تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، وجودیت، جدیدیت، تعمیریت، مابعد جدیدیت وغیرہ معرضِ وجود میں آتی رہی ہیں اور ان میں وہی تحریک مقبول وعزیز رہی ہے جس میں انسان اور اس کی بقا کو محور بنایا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کے دوسرے عشرہ کی ابتدا میں ہی ایک عالمی مہلک وبا منظر عام پر آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مہاماری نے تقریباً پوری دنیا پر اپنے سیاہ آنچل پھیلا دیئے۔ خواہ وہ ترقی یافتہ ممالک ہوں یا ترقی پذیر، ہر ملک سے اموات کی خبریں ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے توسط سے موصول ہونے لگیں۔ خوف، ڈر، وحشت اور افسردگی کا ماحول پیدا ہوگیا۔ تمام ممالک کی حکومتوں نے اپنے ملک کے شہریوں اور اپنے یہاں مقیم افراد کے تحفظ کے پیشِ نظر گھروں سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کردی کیوں کہ اس مہلک وبا جس کو 'کرونا وائرس' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، لاعلاج ثابت ہورہا ہے۔ اس سے بچنے کا واحد راستہ اس وبا سے متاثر افراد سے دوری اختیار کرنے کو قرار دیا گیا۔ لہٰذا سماجی فاصلہ (Social Distancing) پر عمل کرنے کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کے تقریباً تمام ممالک نے تالہ بندی (Lockdown) اور ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔ تمام سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی سرگرمیوں پر مکمل پابندی لگادی گئی۔ پھر پوری دنیا میں ایک ایک آدمی کو بچانے کی مہم شروع کردی گئی۔ مذہب، ذات، جنس، نسل، علاقہ، غریب، امیر، مزدور، کسان، محنت کش یعنی ایک ایک فرد کی جان بلاتفریق بچانے کے لیے ہر ملک کی حکومتیں کوشاں ہوگئیں۔ 'جان ہے تو جہان ہے' کے نعرہ سے انسان جی اُٹھا، انسانیت کی بقا ہوئی اور آدمی کی اہمیت، افادیت، برتری، عظمت اور وقار عود کر آئی۔ یہ احساس عام ہوا کہ انسان سے بڑھ کر اس کرۂ ارض پر کوئی مخلوق یا ازم نہیں ہے۔ صدیوں پرانی سماجی بناوٹ چرمراگئی۔ نظام زندگی میں غیر معمولی تغیر رونما ہوا، جس کی وجہ سے ایک نئی فضا تشکیل ہوئی اور ایک نیا سماجی منظر نامہ اُبھر کر سامنے آنے لگا جس کا واضح خط و خال ممکن ہے کچھ برسوں بعد اپنی شناخت قائم کرسکے۔ اس وبا نے تقریباً پوری دنیا کو اپنی ترجیحات طے کرنے پر مجبور کردیا اس لیے ممتاز سیاسی رہنماؤں نے بھی علاقائیت، انفرادیت اور مقامیت پر ارتکاز کرنے کا اعلان کیا۔ اس صورتِ حال میں جمہوری ادب کے تصور کا امکان مزید قوی ہوجاتا ہے۔ جمہوری ادب میں مندرجہ ذیل نکات کی جستجو کی جاسکتی ہے:

(1) ایسی تخلیقات جن میں عوام کے جذبات، خیالات اور ان کی ترجیحات کو محور بنایا گیا ہو۔

(2) انسان اور انسانیت کو بہرحال مقدم رکھا گیا ہو۔

(3) دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ انسان ہے کیونکہ وہ دنیاوی عجائب کا خالق ہے اس لیے انسانی امکانات کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہو اور آدمی میں پوشیدہ قدرتی عطیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

(4) طبقاتی تفریق کے خاتمہ اور اعلیٰ سے ادنیٰ افراد تک کے معاملات، مسائل اور نفسیات کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

(5) مزدور، کسان اور محنت کش طبقہ تک ایسے افکار، خیالات اور مثالیں پہنچانے کی کوشش کی گئی ہو جس سے ان کی زندگی میں بھی خوشحالی آئے اور اس طبقہ کے ذہین افراد قومی دھارے سے جڑ جائیں اور ان کی بستی اور سماج میں ترقی کی کرن پہنچ جائے۔

(6) علاقائی ادب اور عام عوام کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو مرکزی ادب سے ہم آہنگ کرنے کی سعی ہو جس سے ادب کے دائرۂ کار میں اضافہ ہوگا، نیز نئے افکار و خیال سے ادب وقیع ہوگا۔

(7) مزدور، کسان اور محنت کش طبقے کی بول چال کی زبان، الفاظ اور محاوروں کو ادبی انداز میں سلیقے سے برتا گیا ہو جس سے لسانی سطح پر ان طبقات کی اصلاح ہوسکے اور وہ تخلیقات سے محظوظ بھی ہوں۔ ان کے یہاں بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا بدل نہیں ہے۔

فنکار و قلم کار معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں، اس لیے تمام انسانوں سے ان کی وابستگی لازمی ہے۔ لوگوں کے چہرے اور معاشرتی نظام پر اُبھرنے والی لکیریں پڑھنا انھیں آتا ہے اس لیے ہر کس و ناکس کے جذبات و کیفیات کو وہ محسوس کرلیتے ہیں اور اپنی تخلیقات کا محور بناتے ہیں لہٰذا وارث علوی رقم طراز ہیں:

''سوائے انسانوں اور انسانی معاشرے کے فنکار کی وابستگی اور وفاداری کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ انسانیت کی بنیادی قدریں، انسانوں کے بنیادی تقاضے اور عام زندگی کی سماجی اور سیاسی کشمکش سے لگاؤ پیدا کرکے ہی فنکار سیاسی اور آدرشی وابستگیوں کے ان گڑھوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جن کے دلدل میں پھنس کر اس کا فن تو فن اس کی انسانیت تک غارت ہوجاتی ہے۔ بحیثیت انسان کے اس کا سروکار عام انسانوں کی زندگی سے ہے۔ انسان، انسان کی فطرت، اس کی تمنائیں اور آرزوئیں، اس کی مایوسیاں اور محرومیاں، اس کے قہقہے اور اس کے آنسو، اس کے طربیے اور اس کے المیے، اس کی جبلتوں کے طوفان اور اس کی فطرت کی پُراسرار گھپائیں، اس کی نفسیاتی گتھیاں اور اس کے رومانی اور اخلاقی وسائل، اس کی تہذیبی اور معاشرتی روایتیں اور اس کی سیاسی و سماجی کشمکش۔ یہ ہے فنکار کی جولانگاہ۔''

(بحوالہ روزنامہ 'انقلاب' 3 مئی 2020، ص 5)

پروفیسر وارث علوی کے مذکورہ خیالات ادب کے حوالے سے جمہوری ادب کے تصور میں معاون و مددگار ہیں۔ جمہور کا معنی عوام اور جمہوری ادب کا مطلب عوامی ادب، لیکن جمہوری ادب میں جو بلاغت اور معنویت مضمر ہے، وہ عوامی اور دلت ادب میں مفقود ہے۔ لہٰذا قلم کاروں و فنکاروں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

■

**Dr. Abdul Barkat**
Associate Prof.
Dept. of Urdu
MPS Science College
Muzaffarpur- 843165 (Bihar)

سوائے انسانوں اور انسانی معاشرے کے فنکار کی وابستگی اور وفاداری کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ انسانیت کی بنیادی قدریں، انسانوں کے بنیادی تقاضے اور عام زندگی کی سماجی اور سیاسی کشمکش سے لگاؤ پیدا کرکے ہی فنکار سیاسی اور آدرشی وابستگیوں کے ان گڑھوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جن کے دلدل میں پھنس کر اس کا فن تو فن اس کی انسانیت تک غارت ہوجاتی ہے۔

فنکار و قلم کار معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں، اس لیے تمام انسانوں سے ان کی وابستگی لازمی ہے۔ لوگوں کے چہرے اور معاشرتی نظام پر اُبھرنے والی لکیریں پڑھنا انہیں آتا ہے اس لیے ہر کس و ناکس کے جذبات و کیفیات کو وہ محسوس کرلیتے ہیں اور اپنی تخلیقات کا محور بناتے ہیں۔

الہلال
ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

انس مسرور انصاری

# پروفیسر محمود الٰہی اور الہلال مقدمہ

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں اردو صحافت وادب کے رول کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس عہد کی تحریروں میں آزادی کی جدوجہد کا موضوع غالب عنصر کی حیثیت سے داخل وشامل ہے۔ شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک اس ملک میں اردو زبان سب سے زیادہ مقبول ومروج زبان تھی۔ اسی زبان نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا جس نے ہندوستانیوں کی رگ وپے میں شرارے بھر دیے۔ کثیر الاستعمال زبان ہونے کی وجہ سے فطری طور پر آزادی کی لڑائی میں اس زبان کا سب سے اہم کردار اور حصہ رہا ہے۔

میسور کی سلطنتِ خداداد کے بانی حیدرعلی کے بیٹے سلطان فتح علی ٹیپو نے ہندوستان میں اُردو زبان کا پہلا اخبار'فوجی اخبار' کے نام سے 1794 میں جاری کرایا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ یہ اخبار خاص طور سے فوجیوں کے لیے شائع کیا جاتا تھا۔ اس میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی اسپرٹ تیز کرنے کے لیے مضامین اور انگریزوں سے وطن کے دفاع کے لیے لوگوں کی انقلابی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار سلطان کی شہادت تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ سقوطِ سرنگاپٹنم کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی تمام فائلوں اور سازوسامان کو نذرِ آتش کردیا۔

1877 میں منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے 'اودھ پنچ' جاری کیا جو چھتیس سال تک برطانوی سامراج اور مغربیت کی بے لگام عریاں تہذیب اور مغرب زدہ ہندوستانیوں پر طنز وظرافت کے تیر وتفنگ چلاتا رہا۔ 1912 میں مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) نے 'الہلال' اور اُس کے بعد 'البلاغ' جاری کیا۔ یہ دونوں جریدے اُردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'الہلال' آزادی کی جدوجہد کے سلسلے کی ایک لازمی کڑی ثابت ہوا۔ اس کی تاریخی اہمیت وافادیت اور مسلمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ہر شمارے کو ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی دانشورانہ قیادت اور بے پناہ علمی وادبی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کے سبب 'الہلال' کو اردو صحافت وادب کا ایک روشن ستون، درخشاں علامت، تابناک روایت اور تابندہ سمبل بنادیا۔

مولانا آزاد اور ادب وصحافت کے تعلق سے الہلال کا تذکرہ ہمیشہ ناگزیر سا رہا ہے۔ رسائل وجرائد، نصابی کتب اور دیگر مضامین میں باربار الہلال کے متعلق پڑھتے رہنے سے اردو طلبہ کے دلوں میں اس کے دیدار کا اشتیاق ہمیشہ جاگزیں رہا ہے۔ ایک جذباتی تعلق اور براہِ راست مطالعے کی تمنا ہمیشہ باقی رہی ہے لیکن الہلال ہر خواہش مند قاری کی دسترس سے باہر تھا۔ اس کی فائلوں کی دریافت وبازیافت، تلاش وجستجو، تحقیق وتدوین اور طباعت واشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت بن گئی تھی۔ بظاہر اس ناممکن العمل کام کو انجام عمل تک کون پہنچاتا۔ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ کیونکہ اس کے تمام شماروں کو ازسرِ نو منظرِ عام پر لانے کے لیے کسی ایک یا چند اشخاص نہیں بلکہ ایک مکمل، منظم اور مستحکم ادارہ کی ضرورت تھی لیکن یہ اتنا بڑا اور ضروری کام بہرحال ہونا تھا۔ خداوند کریم کی رحمتِ کاملہ الہلال کے تمام شماروں کو منصۂ شہود پر لانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اس کی توفیق پروفیسر محمود الٰہی کو بخشی گئی۔

پروفیسر محمود الٰہی (1930-2014) ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے علمی وادبی کاموں کا مختصر تذکرہ بھی تفصیل طلب ہے۔ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین، شگفتہ اور علمی اندازِ بیان، منفرد طرزِ نگارش اور دلائل وبراہین بتاتے ہیں کہ ان کے موثرات کا سلسلہ دراز تر ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ مدرسہ کنزالعلوم میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی مدرسے میں اس وقت مجروح سلطانپوری بھی زیرِ تعلیم تھے۔ اس مدرسے کے بانی اور شیخ الحدیث محمود الٰہی کے والد گرامی مولانا علیم اللہ صاحب تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں محمود الٰہی بہت اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ اسرار احمد

خاں اور محمود الٰہی دونوں ہی مولانا علیم اللہ صاحب کے شاگرد تھے اور دونوں کے تخلص بھی مولانا ہی کے تجویز کردہ ہیں۔ ایک کا تخلص انھوں نے مجروح رکھا اور دوسرے کا زخمی۔

ایسے دینی و علمی فضا و ماحول نے ان کی پرورش کی۔ یہاں سے ان کی ذہنی و فکری نشو و نما کا آغاز ہوا۔ ہر چند کہ بعد میں انھوں نے شاعری کو ترک کر دیا اور مستقل طور پر نثر کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تاہم ان کی ذات میں جس شاعر نے آنکھ کھولی اور ترقی کے مراحل و مدارج طے کیے تھے، وہ ان کی ذات میں ہمیشہ زندہ رہا اور نثر میں ان کے طرزِ نگارش کے ریشمی پردوں سے جلوہ افشانی کرتا رہا۔

بلاشبہ پروفیسر محمود الٰہی بہترین، ایمان دار اور اعلا درجہ کے ناقد تھے لیکن بنیادی طور پر ان کے مزاج کا غالب میلان 'تحقیق' کی طرف رہا۔ انھوں نے کتنے ہی طالب علموں کو نقاد اور محقق بنا دیا۔ ان کی کتابوں اور مضامین کی فہرست بتاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر محقق تھے۔ یہاں تنقید و تحقیق کے باہمی رشتوں کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ محقق بنیادی طور پر ناقد بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اچھے محقق کی پہچان بہترین تنقید نگاری کے حوالے سے بتائی گئی ہے۔ یہ دونوں اوصاف محمود الٰہی میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان کی تحقیق میں توانا اسلوب اور تنقیدی شعور نے دل کشی پیدا کر دی ہے۔ 'الہلال' کے تعلق سے پروفیسر محمود الٰہی رقم طراز ہیں:

'الہلال' کسی الف لیلوی داستان کے زمرے میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اُردو کے مختلف درجات کے نصاب میں مولانا آزاد کی تحریریں بجا طور پر شامل کی گئی ہیں اور جب اساتذہ اُن تحریروں پر درس دیتے ہیں تو 'الہلال' اور اُس کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ طلبہ کے اندر الہلال کے دیدار کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، مگر اساتذہ اُن کی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتے کہ الہلال ایک جنسِ نایاب ہے۔ اگر کہیں کسی کے پاس کوئی شمارہ ہے بھی تو اتنے پُراسرار طریقے سے اُس کی جلوہ گری کا سامان بہم کرتا ہے کہ یہ جلوہ گری ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، کے ذیل میں آ جاتی ہے۔ الہلال کے عکس کی اشاعت سے نئی نسل کی شکایت دور ہو جائے گی۔ کم از کم اتنا دعوا تو وہ کر سکتی ہے کہ اصل الہلال نہ سہی، اُس نے اُس کا عکس دیکھا ہے۔ الہلال کی یہ نئی جامہ پوشی اُس کے اندازِ قد کی بہرحال غمازی کرے گی۔''

(مقدمۂ الہلال' ص 17-14)

'الہلال' کی تحقیق و جستجو اور ترتیب و تدوین میں پروفیسر محمود الٰہی کو دشوار ترین مراحل سے گزرنا پڑا لیکن انتہائی حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ ان کے پائے استقامت میں ہلکی سی لغزش بھی نہیں آئی۔ اس بڑے کام کو تکمیل تک پہنچانے میں انھوں نے اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں کو احسن طریقے سے استعمال کیا۔ اس طرح وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی۔ مسلسل جدوجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور بالآخر 'الہلال' کے تمام شمارے محفوظ ہو گئے۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ اردو دنیا پروفیسر محمود الٰہی کی ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

''جون 1987 میں جب اتر پردیش اُردو اکادمی کی تشکیل نو ہوئی اور میں کوئی چار سال کے وقفے کے بعد اس کی مجلسِ انتظامیہ کا ایک بار پھر چیئر مین نامزد کیا گیا تو میرے ذہن نے اُس کا جو ترقیاتی منصوبہ مرتب کیا اُس میں مولانا آزاد کی صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات کو سرِ فہرست جگہ ملی اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کسی طرح یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا لیکن چھ ماہ کی طویل کشمکش کے بعد میرے اندازِ فکر میں تبدیلی رونما ہوئی اور اُس جذبے نے میری انفعالی کیفیتوں کو شکست دے دی کہ مولانا کی شخصیت اور اُن کی تعلیمات کا عام کرنا ہمارے واجبات میں ہے اور اُردو اکادمی اس قومی کام میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ میں نے جب اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کے اراکین سے آزاد صدی کے مختلف پہلوؤں پر غیر رسمی گفتگو کی تو اُن کے اندر اس منصوبے کی تکمیل کا ذوق مجھ سے کہیں زیادہ ملا اور آخر کار مجلسِ انتظامیہ نے اپنی پہلی نشست میں 'الہلال' کی مکمل فائلوں کے عکس کی طباعت و اشاعت کا منصوبہ بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ منظور کر لیا۔ مجلس انتظامیہ نے محسوس کیا کہ مولانا آزاد کو اس سے زیادہ مخلصانہ خراجِ عقیدت اور کیا ہوگا کہ 'الہلال' کا عکس ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا جائے۔''

(پیش لفظ، مقدمۂ الہلال' ص 14)

اُردو صحافت کی تاریخ میں 'الہلال' نے جو نقشِ دوام روشن کیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ وہ محض ایک اخبار نہ تھا بلکہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جدوجہد کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک پکار، ایک چیخ، ایک صدا، ایک دعوت، ایک پیغام، ملک اور قوم کے نام۔ ایک ایسی تحریک جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو مخاطب کرتی ہو۔ 'الہلال' کے صفحات پر مولانا آزاد نے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے تھے۔ ان کو سمیٹنا اور جمع کرنا آسان نہ تھا۔

اکادمی کی مجلسِ منتظمہ کی منظوری اور 'الہلال' کی تدوین و اشاعت کے درمیان حوصلہ شکن مشکلات کا مرحلہ وار طویل اور صبر آزما سلسلہ ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''اسلاف علم و ہنر اور سیم و زر کے مابین جو امتیازی لکیر کھینچتے آئے ہیں، اُس کی حقانیت کا بار بار تجربہ ہوا لیکن 'الہلال' کی فائلوں کی تلاش نے اُسے آئینہ کر دیا۔ اس کی اشاعت کے لیے ریاستی حکومت سے گرانٹ تو مل گئی لیکن اس کے صحیح و سالم اوراق کی فراہمی مرحلۂ جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا۔ مئی 1988 میں گورکھپور آ گیا تھا اور برابر یہاں کے کتب خانوں کی تلاش اور اُن سے استفادہ میں مصروف رہا۔ بعض ذاتی کتب خانوں کی فہرستیں بھی میں نے مرتب کر لی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ 'الہلال' کے سارے شمارے مجھے گورکھپور میں ہی مل جائیں گے اور اگر دو چار شماروں کی کمی ہوگی تو وہ باہر کے کتب خانوں سے پوری ہو جائے گی۔ میرے اس یقین نے دھوکا نہیں دیا۔ قریب قریب سارے شمارے یہاں مل گئے بلکہ بعض بعض شماروں کی چھ چھ کاپیاں ملیں لیکن دستِ بُردِ زمانے نے ان شماروں کی جو گت بنا دی تھی، اس نے میرے عزم و حوصلے کو متاثر کر دیا۔ کسی کا سرورق غائب ہے، کسی کے بیچ کے صفحات غیر حاضر ہیں۔ بعض فائلیں ناقص اوّل، بعض ناقص الآخر اور بعض ناقص الطرفین نکلیں۔ بعض شماروں سے تصویریں غائب تھیں اور عجوبے کی حد یہ تھی کہ بعض شماروں کے ایک کالم کو دیمک چاٹ گئی تھی اور بعض کے دوسرے کالموں کو۔ غرض یہ کہ 'الہلال' کی دستیابی کی جہاں خوشی تھی وہاں اس کا غم تھا کہ اس کا عکس کیوں کر لیا جائے گا۔

**بلاشبہ پروفیسر محمود الٰہی بہترین، ایمان دار اور اعلا درجہ کے ناقد تھے لیکن بنیادی طور پر ان کے مزاج کا غالب میلان 'تحقیق' کی طرف رہا۔ انھوں نے کتنے ہی طالب علموں کو نقاد اور محقق بنا دیا۔ ان کی کتابوں اور مضامین کی فہرست بتاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر محقق تھے۔ یہاں تنقید و تحقیق کے باہمی رشتوں کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ محقق بنیادی طور پر ناقد بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اچھے محقق کی پہچان بہترین تنقید نگاری کے حوالے سے بتائی گئی ہے۔ یہ دونوں اوصاف محمود الٰہی میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان کی تحقیق میں توانا اسلوب اور تنقیدی شعور نے دل کشی پیدا کر دی ہے۔**

بہت سی تدبیریں اور ترکیبیں ذہن میں آئیں مگر میں نے یہ کیا کہ سب سے پہلے سارے شماروں کے کارڈ بنا لیے اور اس کے اندراجات اس طور پر مکمل کیے گئے کہ جن سے بعض علمی اشارات کی نشان دہی بھی ہوجائے اور عاریتاً دینے والوں کے نام بھی۔ اور بعض شماروں کی ہیئت کذائی بھی واضح ہوجائے۔ میں نے اپنی بیوی کے سامنے مسائل رکھے اور اس سے کہا کہ میں ہفتے دو ہفتے کے لیے سارے گھر کو اس کام میں لگانا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ گھر کے معمولات میں فرق بھی نہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گھر کا ہر فرد اس میں میری مدد بھی کرے۔ ماں کا حکم ہوا تو میرا بیٹا مشہود اور بیٹیاں عذرا بشریٰ، قدسیہ فوزیہ، اور زیبا 'الہلال' کے کام میں لگ گئیں۔ سارا گھر الہلال کی اصل فائیلوں اور اُن کی الیکٹرو اسٹیٹ کاپیوں سے بھر گیا۔ کرسیوں پر، میزوں پر، ہر جگہ الہلال کے شمارے بھرے ہوئے تھے اور اللہ کا نام لے کر ہم سب نے ہر شمارے کے ایک ایک ورق کو دیکھنا شروع کیا اور جہاں کوئی نقص نظر آتا اُسے فوراً اُسی شمارے کی دوسری کاپیوں سے درست کرلیا جاتا۔ اس کی صورت یہ اختیار کر لی گئی کہ متاثرہ عبارت بھی صاف عبارت والا فوٹو چپکا دیا جاتا اور پھر اس طرح کے اوراق کا دوبارہ الیکٹرو اسٹیٹ کرالیا جاتا تاکہ اُس کی نگیٹیو بننے میں دشواری نہ ہو۔ دن بھر بلیڈ سے کاٹ کاٹ کر زخمی اوراق پر مرہم پٹی رکھا جاتا اور شام کو ان کا الیکٹرو اسٹیٹ کرالیا جاتا۔ صبح کوئی تین چار بجے جب سو کر اُٹھتا تو نئے اوراق کا حرفاً حرفاً مطالعہ کرتا کہ کہیں کوئی نقطہ یا حرف متاثر تو نہیں ہوگیا ہے۔'' (مقدمہ'الہلال'ص 18-17)

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ ہمیں ادراک و عرفان ہو کہ 'الہلال' کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدوین کے لیے پروفیسر محمود الٰہی نے کس قدر جاں فشانی، دیدہ ریزی، دور بینی و دور اندیشی سے ایک ایسے علمی و ادبی خزانے کو جمع کر کے قوم کے سامنے پیش کردیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناقابلِ بیان محنت و مشقت، حوصلہ مندی و خیر خواہی، جذباتی وابستگی اور احساسِ ضرورت کے تحت 'الہلال' منصۂ شہود پر آیا۔ جب بھی مولانا آزاد اور 'الہلال' کی بات آئے گی تو یہ بھی ضرور کہا جائے گا کہ محمود الٰہی نے 'الہلال' کو حیاتِ نو بخشی۔ اسی کے ساتھ اس قدر وقیع اور ایسے علمی کاموں کے لیے اُتر پردیش اُردو اکادمی کو بھی ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

**'الہلال' کی تدوین واشاعت پروفیسر محمودالٰہی کا اتنا بڑا علمی وادبی اورتحقیقی کارنامہ ہے جولائق صد تحسین وستائش ہے۔ 'الہلال' محض ایک اخبارنہ تھابلکہ وہ مولانا آزاد کاایک مشن تھاایک تحریک تھی۔ ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی۔ ہندو مسلم قومی یک جہتی کی دعوت،قومی وملّی اتحاد واتفاق کی دعوت۔! اس ایک دعوت میں کئی دعوتیں تھیں جن سے ملک وملّت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ 'الہلال' کے اثرات نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی دورتک پھیلے ہوئے تھے۔اُن کی دعوت اوراُن کی آوازایشیا سے یورپ تک گونج رہی تھی۔**

ایک بڑا کام یہ بھی ہوا کہ اُن کی صاحب زادی پروفیسر زیبا محمود نے 'الہلال' پر لکھے گئے اُن کے بسیط مقدمہ کو اُن کے مجموعۂ مضامین 'بازیافت' کے علاوہ الگ سے کتابی صورت میں شائع کرادیا ہے جس سے اُردو طلبہ و اساتذہ اور عام قارئین کو 'الہلال' کے تعارف کے لیے بڑی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

'الہلال' کی تدوین و اشاعت پروفیسر محمود الٰہی کا اتنا بڑا علمی و ادبی اور تحقیقی کارنامہ ہے جو لائق صد تحسین و ستائش ہے۔ 'الہلال' محض ایک اخبار نہ تھا بلکہ وہ مولانا آزاد کا ایک مشن تھا۔ ایک تحریک تھی۔ ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی۔ ہندو مسلم قومی یک جہتی کی دعوت، قومی و ملّی اتحاد و اتفاق کی دعوت۔! اس ایک دعوت میں کئی دعوتیں تھیں جن سے ملک و ملّت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ 'الہلال' کے اثرات نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی دعوت اور اُن کی آواز ایشیا سے یورپ تک گونج رہی تھی۔ اس ضمن میں محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''جس اخبار کا مقصدِ اشاعت ایک مخصوص دعوت ہو۔ ایسی دعوت جو ملت کو مفاد پرستی کے مانوس اور شناسا راستوں کو ترک کردینے کی تلقین کرے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب دے، اس کا ردِ عمل مثبت ہوسکتا ہے اور منفی بھی۔! پہلی بات تو یہ کہ اس سے مولانا کی کوئی ذاتی اور شخصی غرض وابستہ نہیں تھی۔ مولانا کا یہ اقدام فی سبیل اللہ تھا۔ حالات نے اُن کی رگ و پے میں ایک جذبۂ آتش فشاں دوڑا دیا تھا، جو 'الہلال' کی صورت میں ایک دن پھوٹا اور اس طرح پھوٹا کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک بھی اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔
(مقدمہ'الہلال'ص 37)

مولانا آزاد کا مقصد و نظریہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے بلکہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو ملک کی آزادی کے لیے ناگزیر خیال کرتے تھے۔ اُنھیں ملک کا وقار بھی بہت عزیز تھا، اور ملی تشخص بھی۔ ملک کی آزادی اور ترقی و خوش حالی اُن کا خواب تھا۔ برطانوی سامراج کے دو قومی نظریہ کے وہ شدید مخالف تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی وہ ایک ہندوستانی قوم سمجھتے تھے۔ البتہ خاص طور پر مسلمانوں کے تعلق سے بہت فکر مند تھے کیونکہ مسلمان بُری طرح انتشار کا شکار تھے۔ اُن کے رہنماؤں میں مستقبل شناسی کی بے حد کمی تھی اور مسلمانوں کا دینی و سیاسی شعور ہنوز بیدار نہیں ہوا تھا۔

مولانا آزاد نہایت گہری سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ اُن کی تمام تر جدوجہد کا مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ وہ اسی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ مسلمانوں کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر مجتمع و متحد دیکھنے کے آرزومند تھے۔

مولانا آزاد جب دوسری بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تو 1940 میں رام گڑھ میں اُس کا اجلاس ہوا۔ اُس موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں اُنھوں نے کہا:

''........ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ کہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفادات کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ ہندوستان کے 9/کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہِ عمل ہوسکتی ہے جس کی میں نے 1912 میں اُنھیں دعوت دی تھی۔ میرے جن ہم مذہبوں نے 1912 میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج اُنھیں مجھ سے اختلاف ہے۔ میں اس اختلاف کے لیے اُنھیں ملامت نہیں کروں گا۔ میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں لیکن ان تمام احساسات

کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جائے گا۔'' (مقدمۂ الہلال' ص24)

اپنی ابتدائی صحافتی زندگی کے آغاز سے 'صداقت' اور 'سچائی' کا اظہار واعلان کرتے کرتے مولانا آزاد کی ذات خود صداقت وسچائی کی علامت اور پہچان بن گئی۔ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''مولانا نے اسلامی تعلیمات پر مبنی جس راہِ عمل کو اختیار کیا، اُسی کا نام دعوتِ الہلال رکھا تھا اور عمر بھر وہ اُسی دعوت کا اعادہ کرتے رہے۔ اُن کی دعوت کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہنا چاہیے۔ اس میں اتنی وسعت تھی کہ انسانی فلاح کی جزئیات کا بھی وہ احاطہ کر لیتی ہیں۔ دو قومی نظریے کا ابطال، ہندو اور مسلم اتحاد اور ملکی سالمیت اُن کی دعوت کے مظاہر تھے۔ حصولِ آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد، آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شمولیت اور فکر ونظر کی آزادی مولانا کی دعوت کی اہم قدریں تھیں۔''

مولانا آزاد 'الہلال' کی 4 فروری 1914 کی اشاعت میں رقم طراز ہیں:

''آغازِ اشاعتِ الہلال سے 'دعوت' کا لفظ میری زبان پر ہے اور اس کثرت سے بار بار اس لفظ کو دہراتا ہوں کہ شاید بعض لوگ سنتے سنتے اُکتا سے گئے ہوں گے۔ میں نے ہمیشہ ایک 'دعوت' کا اعلان کیا جو ایک مقصودِ خاص کو اپنے سامنے رکھتی ہے اور ساتھ ہی چند مقاصد پیش کیے جو ہمیشہ سے انسانی جماعتوں اور آبادیوں کے سامنے پیش ہوتے آئے ہیں۔ اُن مقاصد میں ندرت وجدّت نہ تھی مگر صداقت ضرور تھی اور جس بیان میں صداقت ہو، ضرور ہے کہ وہ نئی نہ ہو، کیونکہ دنیا کی سب سے زیادہ پُرانی چیز صداقت ہی ہے۔''

(بحوالہ 'مقدمہ الہلال' ص35)

مولانا آزاد نے دعوتِ الہلال کی توضیح وتصریح بار بار کی ہے۔ اسی دعوت کو یوسفِ مقصود کہنا چاہیے اور اسی دعوت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک سمجھنا چاہیے۔ اسی دعوت میں وہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے جس کا دامن مولانا آزاد نے کبھی نہیں چھوڑا۔

'' 1921 کے نومبر میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کا یہ اقتباس قابلِ لحاظ ہے۔

''...... 1912 میں مَیں نے 'الہلال' جاری کیا۔ حضرات! مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے خودستائی اور خود فراموشی کا الزام نہ دیں گے، اگر میں بطور تحدیثِ نعمت اس موقع پر دعوتِ 'الہلال' کا بھی ذکر کروں۔ آج آپ کی یہ مقدس ومبارک جمعیۃ العلماء، جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے'' میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسفِ مقصود ہے جس کے فراق میں 1911 سے متصل یا اسفا علی یوسف، کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو بھی اپنے چشمِ خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے، اور اُس کے مواد وحرف کے اُوپر اپنے دل وجگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ 1911 سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق وشیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی..... جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم اندوہ پر بے قراری سے کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی وقید کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے۔ پس، اے بزرگانِ ملت! اگر آج علمائے اُمّت کی یہ نہضتِ مبارکہ جمعیۃ العلما کی شکل میں طالع ونظر افروز ہوئی ہے، تو مجھے کہنے دیجیے یہ میرے وہ سارے سوالوں کا جواب ہے، میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے، میری فریاد اور التجا کی قبولیت ہے۔'

(بحوالہ 'مقدمۂ الہلال' ص34)

**پروفیسر محمود الٰہی نے اپنے مقدمہ میں مولانا آزاد کی پُر وقار شخصیت، ان کے خصائص وکمالات ،ان کے نظریہ وخیالات، فکروشعور اور جادۂ عمل کی توضیح و صراحت اس خوبی سے کی ہے کہ سب کچھ آئینہ بردوش ہوگیا ہے۔ مولانا آزاد کے مقصد و مدعا اورالہلال کے تمام قابل ذکر گوشوں کی توضیح وتصریح 'مقدمہ الہلال 'میں موجود ہے۔ مولانا آزاد کے ادیبانہ اورخطیبانہ اسلوب کے مختلف پہلوؤں پربھی محمود الٰہی نے خاصی توجہ کی ہے۔بقول اُن کے، مولاناآزاد جس اسلوب کے موجد تھے وہی اس کے منتہی اورمختتم بھی ہوئے۔ان کی زبان اوراسلوب کی تقلید کسی سے نہ ہوسکی۔**

مولانا آزاد کی دعوت کیا تھی۔؟ اس کے عوامل وعواقب اور نتائج کیا نکلے؟ اس ضمن میں آپ کو خاصا کچھ علم ہو چکا ہے۔ مولانا نے صحافت کو کبھی وسیلۂ معاش نہیں بنایا بلکہ اسے قومی بیداری اور اصلاح ملک وقوم کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ملّی بیداری کے خواہاں تھے اور غفلتوں، کوتاہیوں، نادانیوں، بے خبریوں اور مایوسیوں میں حوصلوں کو بلند کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ 'الہلال' کے پہلے شمارہ 13 جولائی 1912 میں مولانا لکھتے ہیں:

''آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد، عصائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلت ورسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اُٹھو، کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو، کیونکہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔''

مولانا آزاد صحافت کو عوامی انقلاب کا ایک طاقت ور ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے ملک وقوم کی فلاح کے لیے لوگوں میں ایک نئے عزم وحوصلہ کو بیدار کیا۔ انھوں نے اپنے مشن کے تحت لوگوں کا زبردست محاسبہ کیا۔ بڑی سخت گرفت کی۔ اپنے نظریہ اور معیارِ صحافت سے کم پر کبھی مصالحت نہیں کی۔ مولانا آزاد کی صحافت کے تین اہم اُصول تھے۔ (1) اخبارات کا سماج کا آئینہ دار ہونا۔ (2) اصلاحِ معاشرہ۔ (3) عوام میں جدید ترین علوم وفنون کو فروغ دینا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے اقتباسات سے 'مقدمہ الہلال' مزین ہے جن سے مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے کارناموں کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی نے اپنے مقدمہ میں مولانا آزاد کی پُروقار شخصیت، ان کے خصائص وکمالات، ان کے نظریہ وخیالات، فکر وشعور اور جادۂ عمل کی توضیح وصراحت اس خوبی سے کی ہے کہ سب کچھ آئینہ بردوش ہو گیا ہے۔ مولانا آزاد کے مقصد ومدعا اور الہلال کے تمام قابلِ ذکر گوشوں کی توضیح وتصریح 'مقدمہ الہلال' میں موجود ہے۔ مولانا آزاد کے ادیبانہ اور خطیبانہ اسلوب کے مختلف پہلوؤں پر بھی محمود الٰہی نے خاصی توجہ کی ہے۔ بقول اُن کے، مولانا آزاد جس اسلوب کے موجد تھے وہی اس کے منتہی اور مختتم بھی ہوئے۔ ان کی زبان اور اسلوب کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی۔

'مقدمہ الہلال' میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں

وہیں اس کے قارئین کو شکایت بھی ہے کہ وہ مولانا آزاد کی ابتدائی صحافتی زندگی کے احوال و معاملات سے محروم و بے خبر ہیں۔ مگر چونکہ محمود الٰہی صاحب کا موضوع خاص 'الہلال' رہا ہے، اس لیے انھوں نے الہلال کے عوامل وعواقب اور اجتہادو تعلیمی موثرات کی طرف خصوصی توجہ مبذول رکھی اور سارے کا سارا فوکس الہلال ہی پر مرتکز رکھا۔ یہاں تک کہ 'البلاغ' کا ذکر بھی عمومی اور ضمنی طور پر ہی ہوا ہے۔ مولانا آزاد کی ابتدائی صحافتی زندگی سے انھوں نے صرفِ نظر کیا۔ موضوع کے اعتبار سے وہ حق بجانب ہیں تاہم جہاں انھوں نے مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، ان کی ابتدائی صحافیانہ زندگی کے تعلق سے بھی کچھ نہ کچھ مذکور ہونا چاہیے تھا۔ اس سے مقدمہ کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا اور اردو اسکالرس کو مولانا کی صحافتی بنیادوں کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔

مولانا آزاد کو قدرت نے اپنی جن بے حساب نوازشوں سے فیضیاب کیا تھا ان کا حال نوجوانی میں ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔ گویا شباب سے پہلے مولانا پر شباب آ گیا۔ ان کے علم وفن، فضل وکمال اور صلاحیت کے چرچے شروع ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ شبلی نعمانی کی نظر نے آزاد کے اندر پوشیدہ جوہروں کو دیکھ لیا اور 'الندوہ' جیسے اہم رسالہ کی ادارت ان کے سپرد کر دی۔ اس سے پہلے مولانا آزاد کلکتہ کے ماہنامہ 'نیرنگِ نظر' ہفت روزہ 'المصباح'، 'رسالہ محمدیہ' ہفت روزہ 'احسن الاخبار' پندرہ روزہ 'لسان الصدق' شاہ جہاں پور کے 'اڈورڈ گزٹ' لکھنؤ کے 'خدنگِ نظر' سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ ان رسائل وجرائد سے وابستگی اور مسلسل خامہ فرسائیوں سے آزاد کی صحافیانہ صلاحیتوں کو نکھرنے، سنورنے اور نشو ونما پانے کا خوب موقع ملا۔ مگر اصل میں 'الندوہ' لکھنؤ۔ اور 'وکیل' امرتسر، وہ رسائل ہیں جن کی ادارت کے دوران ان کی مشقِ صحافت 'الہلال' میں ان کے بہت کام آئی۔

1902 کے آس پاس کلکتہ سے شائع ہونے والا 'احسن الاخبار' بند ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد مولانا آزاد نے 'لسان الصدق' کلکتہ سے جاری کیا۔ یہ پہلا پندرہ روزہ اخبار تھا جس کے وہ کلی طور پر مالک تھے۔ اس اخبار سے منسلک دوسرے افراد محض ان کے معاون و مددگار تھے۔

'لسان الصدق' کا پہلا شمارہ نہایت خاموشی کے ساتھ 20 نومبر 1903 کو تاراچند اسٹریٹ کلکتہ 16 سے جاری ہوا۔ اس وقت آزاد کی عمر 16-15 برس کی تھی۔ یہ اخبار بہت پسند کیا گیا۔ مختلف رسائل وجرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ معاصرین نے خیال کیا کہ یہ رسالہ کسی معمر، کہنہ مشق اور تجربے کار اہلِ قلم کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ 'لسان الصدق' حق اور سچائی کا سمبل تھا۔ حق گوئی و بے باکی اس کے عمل کا اساسی دستور تھا۔

**مولاناآزاد کوقدرت نے اپنی جن بے حساب نوازشوں سے فیضیاب کیا تھا ان کا حال نوجوانی میں ھی ظاھر ھونے لگا تھا. گویا شباب سے پھلے مولانا پرشباب آگیا. ان کے علم وفن، فضل وکمال اورصلاحیت کے چرچے شروع ھوگئے .یھی وجه تھی که علامه شبلی نعمانی کی نظر نے آزادکے اندر پوشیده جوھروں کو دیکھ لیا اور 'الندوه' جیسے اھم رساله کی ادارت ان کے سپرد کر دی . اس سے پھلے مولاناآزاد کلکته کے ماھنامه 'نیرنگ نظر' ھفت روزه 'المصباح'، 'رساله محمدیه' ھفت روزه'احسن الاخبار' پندره روزه 'لسان الصدق' شاه جھاں پور کے 'اڈورڈگزٹ' لکھنؤ کے 'خدنگ نظر' سے بھی وابسته ره چکے تھے. ان رسائل وجرائد سے وابستگی اور مسلسل خامه فرسائیوں سے آزادکی صحافیانه صلاحیتوں کو نکھرنے، سنورنے اور نشوونما پانے کا خوب موقع ملا.**

مولانا آزاد مذہب اور ادب کو صحافت سے جوڑنے والے اردو کے پہلے صحافی تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے سیاست کے اندھیروں میں حق وصداقت اور ایمان و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ ان کا ذہن ایک عالم کا ذہن تھا۔ ان کا مزاج ایک مفکر کا مزاج تھا۔ ان کی اصابتِ فکر ایک فلسفی کی فکر تھی لیکن وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ کیونکہ ان کی طبیعت کا رجحان ابتدا ہی سے اخبار نویسی کی طرف مائل رہا۔ وہ ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور اس کے نفوذ واثر سے بخوبی واقف و آگاہ تھے۔ ان کے نزدیک ایماندارانہ صحافت ایک طاقت و صداقت تھی جس کے ذریعے داخلی وخارجی انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ اور انھوں نے الہلال کے ذریعے انقلاب برپا کیا۔ ایک ایسا انقلاب جس نے خوابیدہ روحوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

'لسان الصدق' کے پہلے ہی شمارے میں مولانا آزاد نے حسب ذیل چار مقاصد کا اعلان کیا۔ (1) سوشل ریفارم۔ یعنی مسلمانوں کی معاشرتی رسومات کی اصلاح۔ (2) ترقی اردو۔ یعنی اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔ (3) علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگلہ زبان میں (4) تنقید۔ یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

لسان الصدق، کے مقاصد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد نے اوائل عمری اور علمی زندگی کے آغاز ہی میں علمی وادبی اور لسانی شعور حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 15 یا 16 سال کی تھی۔

'لسان الصدق' کا آخری شمارہ اپریل/مئی 1905 کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ تینوں جلدوں کے مجموعی صفحات کی تعداد تقریباً تین سو ہے۔ ان کے مشمولات کی زیادہ تعداد اردو زبان وادب کے مسائل سے متعلق ہے۔ دیگر ادیبوں کے مضامین کے علاوہ درج ذیل مضامین مولانا آزاد کے تحریر کردہ ہیں۔

'الہلال' (1912) تک آتے آتے مولانا بڑی قد آور شخصیت کے مالک ہو چکے تھے۔ ان کے پاس علم اور تجربہ دونوں تھا۔ انھوں نے 'الہلال' میں اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کے جوہر کھل کر دکھائے اور اسے گنجینۂ معانی کا طلسم بنا دیا۔

اس گنجینۂ معانی کے طلسم کو پروفیسر محمود الٰہی نے سات ضخیم جلدوں میں سمیٹا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا۔ یہ 'مقدمہ الہلال' ایک ایسا نگارخانۂ علم وادب ہے جو مولانا آزاد کی پہلو دار شخصیت، ان کی عظمت، ان کی علمی وجاہت، نظریہ وخیال، مقصد و مدعا، جذبہ وحوصلہ، ان کی تحریروں اور تقریروں کے اہم ترین اقتباسات اور خود محمود الٰہی کے علمی لیکن شگفتہ وتوانا اسلوب اور توضیحی کلمات سے روشن ہے۔

'الہلال' کے تعارف کے لیے 'مقدمہ الہلال' کا مطالعہ ناگزیر سا ہے۔ محمود الٰہی نے مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی فعالیت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ 'الہلال' کا مکمل تعارف حاصل ہو جاتا ہے اور مولانا کی عظمت دل میں بیٹھ کر رہ جاتی ہے جن کی رسائی 'الہلال' تک نہیں ہے ان کے لیے 'مقدمہ الہلال' ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں، جو طلبہ و اساتذہ کے لیے اکتسابِ فیض کا بہترین ذریعہ ہے۔

'مقدمہ الہلال' میں نہ صرف مولانا آزاد کی باوقار شخصیت کے کئی اہم پہلو روشن نظر آتے ہیں بلکہ ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش پر بھی محمود الٰہی کی سیر حاصل گفتگو نے اسے نہایت علمی وادبی خزینہ بنا دیا ہے۔

■

**Anas Masroor Ansari**
National Urdu Tahreek, Sakrawal
Urdu Bazar, Tanda
Ambedkar Nagar - 224190 (UP)

عبدالرحمن انصاری

# ترجمہ نگاری کا فن اور تکنیک

ترجمہ ایک ایسا فن اور ناگزیر امر ہے جس کے بغیر بنی نوع انسان کی مادی اور ثقافتی ترقی مکمل طور پر احاطۂ تصور میں نہیں لائی جا سکتی ہے۔ انسانی علوم کی ترسیل مختلف زبانوں اور قوموں کے درمیان ترجمہ اور مترجم کی ہی مرہون منت ہے۔ قدیم ترین علوم، تہذیبوں اور ثقافتوں کا مطالعہ عمل ترجمہ کے ذریعے ہی ممکن ہو پایا ہے۔ قدیم سنسکرت اور یونانی زبان کے علمی و ادبی شاہکار اب بھی ترجمہ کی شکل میں موجود ہیں جس سے نسل انسانی آج بھی استفادہ کر رہی ہے۔ عمل ترجمہ مختلف زبانوں، تہذیبوں، ملکوں اور زمانوں کو قریب تر لانے کے ساتھ ساتھ رابطے اور پل کا بھی کام کرتا ہے اسی بنا پر مترجم کو تہذیبی و ثقافتی سفیر بھی کہا گیا ہے۔ الغرض قدیم تہذیبی زندگی کے آغاز سے موجودہ سائنسی وٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور کی تشکیل و تعمیر کے مختلف مراحل تک ترجمے نے بھی دیگر عوامل کے ہمراہ اہم رول ادا کیا ہے۔

ترجمہ کیا ہے؟ ترجمہ کرتے وقت مترجم کن ذہنی مراحل سے گزرتا ہے؟ یہ ذہنی مراحل کیا ہیں؟ کیا ان کا اطلاق بالعموم سبھی مترجم پر ہو سکتا ہے؟ انھیں چند بنیادی سوالوں کا جواب اس مضمون میں دینے کی کوشش کی جائے گی۔ ترجمے سے متعلق مغرب کے اہل علم و دانشوروں کے نقطۂ نظر کو پیش کیا جائے گا۔

مغربی پس منظر میں اگر عمل ترجمہ کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو قدیم ترین زمانے میں زیادہ تر تراجم یونانی زبان سے لاطینی زبان میں کیے گئے۔ اس کی پہلی وجہ یہی ہے کہ یونانی زبان لاطینی زبان سے زیادہ قدیم اور ترقی یافتہ تھی جب کہ لاطینی زبان اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، ادب اور مابعد الطبیعات جیسے مختلف علوم وفنون سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نئے نئے خیالات و افکار کی بدولت یونانی زبان میں ایک مستحکم شعبۂ فکر اور بحث و دلائل کی مضبوط روایت ثبت کر چکے تھے۔ اس صورت میں یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہونا ایک عالمی فطری معاملہ سمجھا جا سکتا ہے۔

مغرب میں بالخصوص یورپ میں ترجمہ کاری یورپی نشاۃ ثانیہ سے باقاعدہ شروع ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ترجمہ ہی یورپی نشاۃ ثانیہ کا محرک بنا۔ یونانی کلاسیکی ادب اور دیگر شاہکار تصانیف کے تراجم جب لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں کیے گئے تو نئے علوم و فنون کا گویا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ Petrarque، Dante اور Boccace اس زمانے میں یونانی زبان و ادب کے مشہور مترجم اور شاعر تھے جن کو آنے والی نسلوں نے مشعل راہ بھی تصور کیا۔

جہاں تک ترجمے کی تعریف کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ماہرین فن نے بے شمار تعریفیں پیش کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ اصل زبان سے کسی فن پارے یا علمی دستاویز کو پوری خوبصورتی، کامیابی اور دیانتداری کے ساتھ دوسری زبان میں مکمل طور پر منتقل کر دیا جائے۔ ان سب تعریفوں میں 'خوبصورتی'، 'کامیابی'، 'دیانتداری' اور 'مکمل' جیسے الفاظ کا استعمال ترجمہ کے پس منظر میں حد درجہ ابہام کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً دیانتداری کس کے تئیں ہونی چاہیے اصل زبان و ادب اور تہذیب کے یا جس زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اس کے؟ اس لیے ہمیں لگتا ہے کہ ترجمے کی تعریف پر بحث کرنے سے زیادہ سود مند یہ ہوگا کہ ترجمے کے اسلوب پر بحث کی جائے۔ بہ الفاظ دیگر اس پر کہ ماہرین نے کس اسلوب کو زیادہ ترجیح دی ہے لفظی ترجمہ کو یا مفہوم کے ترجمہ کو۔

یورپی پس منظر میں ترجمے کے اسلوب پر اپنے تصورات کو پیش کرنے والا پہلا شخص Marcus Tullius Cicero (106-43 ق۔م) کو مانا جاتا ہے۔ یہ ایک مشہور رومن فلسفی، مقرر، ماہر قانون، سیاست داں اور مترجم تھا۔ یونان کے دو مشہور مفکرین Demosthenes اور Aeschines کے خطبات کا ترجمہ جب وہ لاطینی زبان میں منتقل کرتا ہے تو مقدمہ میں اپنے کیے ہوئے ترجمے کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

''ان کے خطبات کا ترجمہ میں نے محض ایک مترجم ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا ہے بلکہ ایک مقرر کی حیثیت سے کیا ہے۔ لفظوں، جملوں اور خیالات کے باہمی ربط اور آہنگ کو دھیان میں رکھ کر لاطینی زبان کے مروجہ الفاظ، لوگوں کی عام بول چال اور روز مرہ میں استعمال ہونے والی زبان کے عین مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ لفظ بہ لفظ ترجمے سے پرہیز کیا گیا ہے لیکن اصل زبان کے لفظوں کے معنی کی وسعت کو نظر انداز بھی نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت میں نے لفظوں کو گننے کے بجائے

لفظوں کو تولنے کی کوشش کی ہے۔''[1]

سیسرو کا یہ اقتباس دل چسپی سے خالی نہیں ہے جس میں وہ عملِ ترجمہ کو ایک مترجم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مقرر کی حیثیت سے بروئے کار لاتا ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے اسلوب اور طریق ترجمہ میں کافی حد تک نمایاں فرق رہے گا۔ مترجم کی حیثیت سے زبانِ اصل کے تئیں دیانتداری اور وفاداری کو ترجیح حاصل ہوگی جب کہ بصورت دیگر ایک مقرر کی حیثیت سے جس زبان و تہذیب میں ترجمہ کیا جارہا ہے ان لوگوں کے تئیں ایمانداری اور دیانتداری کو اولیت دی جائے گی۔ سیسرو ایک طرف جہاں لفظ کو صرف لفظ سے تبدیل نہیں کرتا ہے بلکہ مفہوم کے بدلے مفہوم پیش کرنے پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے تو دوسری طرف ان لفظوں، محاوروں اور ترکیبات کا استعمال کرتا ہے جو لاطینی لوگوں کے مزاج اور تہذیب وثقافت کے عین مطابق تھیں۔

ایک مترجم ہونے کی حیثیت سے سیسرو کا رجحان زبانِ ترجمہ یعنی جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، اس کو اولیت حاصل ہے اور اصل زبان یعنی جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے، ثانوی ترجیح کے زمرے میں آتی ہے۔ سیسرو کے اس اسلوب اور طریق ترجمہ سے آگے آنے والی مترجمین کی نسلیں کافی حد تک متاثر نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ سیسرو پر پانچ صدی گزر جانے کے بعد سینٹ جیروم (Saint Jerome) سابقہ روایتوں سے ہٹ کر کچھ نئے خیالات اور طرز اسلوب لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کا طریق ترجمہ بھی سابقہ روایتوں سے بہت زیادہ منفرد نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ مذہبی تحریروں اور دیگر ادبی اصناف کے طریق ترجمہ کے اسلوب میں امتیاز کرتا ہے۔

سینٹ جیروم (420-347 ع) ایک مشہور رومن دانشور اور عیسائی مذہب کا عالم تھا جس نے مقدس انجیل کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے مذہبی صحیفوں اور دیگر ادبی اصناف کے طریق ترجمہ میں فرق کو واضح کیا۔ اس کے بقول مترجم کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں اصناف کا ترجمہ کرتے وقت مختلف طرز اسلوب کو لازم رکھے۔ ادبی تصانیف کے ترجمے کے وقت مفہوم کے بدلے مفہوم کا ترجمہ کرنے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن مذہبی صحیفوں کا ترجمہ کرتے وقت لفظ کے بدلے لفظ ہی سے ترجمہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے مطابق، مذہبی صحیفوں کے ''الفاظ کی ترتیب بھی پُر اسرار ہوتی ہے۔''[2]

مغربی عہد وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے اکثر مترجمین اور ماہرین فن کے یہاں سیسرو اور سینٹ جیروم کے اسلوب ترجمہ کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی یعنی یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور میں Etienne Dolet ایک عظیم فرانسیسی مترجم تھا جسے فرانس میں علم ترجمہ کا پہلا نظریہ ساز مانا جاتا ہے۔ فرانسیسی زبان وادب میں ترجمہ کے لیے استعمال ہونے والی پہلی فرانسیسی اصطلاح (Traduction) اسی کے قلم سے 1540 میں وجود میں آئی۔ اس نے سولہویں صدی عیسوی میں ترجمے کے کچھ اصول متعین کیے جو موجودہ دور کے مترجمین کے لیے آج بھی رہنما ثابت ہورہے ہیں۔ وہ چند اصول ملاحظہ ہوں:[3]

1. مترجم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ زبانِ اصل کے مواد کو مکمل طور پر سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور اصل مصنف کے بحث ودلائل کو برتنے اور انھیں آگے بڑھانے کی تکنیک کا بخوبی احاطہ کرتا ہو۔

2. دوسری شرط یہ ہے کہ مترجم اصل زبان سے پورے طور آشنا ہو اور متن کا تعلق جس مصنف سے ہو اس مصنف کے بارے میں بھی مکمل عبور رکھتا ہو۔

3. مترجم اصل متن کا لفظی ترجمہ نہ پیش کرے۔ بہ الفاظ دیگر، ہر زبان کی کہاوتیں اور ضرب الامثال متعین ہوتی ہیں جو اس مخصوص سماج کے مروجہ طور طریقوں سے جنم لیتی ہیں۔ ان کہاوتوں اور محاوروں کا تہذیب وثقافت سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اس لیے لفظی ترجمہ ناموزوں اور سمجھ سے پرے ہوتا ہے۔

4. ایسے الفاظ، تراکیب، محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال کیا جائے جو عام لوگوں کے روزمرہ کے استعمال میں ہوں اور جو عام لوگوں کی بول چال کی زبان ہو۔ بلاضرورت نئے لفظ کی اختراع نہ کی جائے۔

**جہاں تک ترجمے کی تعریف کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ماہرین فن نے بے شمار تعریفیں پیش کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ اصل زبان سے کسی فن پارے یا علمی دستاویز کو پوری خوبصورتی، کامیابی اور دیانتداری کے ساتھ دوسری زبان میں مکمل طور پر منتقل کردیا جائے۔ ان سب تعریفوں میں 'خوبصورتی'، 'کامیابی'، 'دیانتداری' اور 'مکمل' جیسے الفاظ کا استعمال ترجمہ کے پس منظر میں حد درجہ ابہام کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔**

5. عمل ترجمہ سے پہلے بہترین مقرروں اور خطیبوں کا بغور مشاہدہ کیا جائے اور موزوں اور عمدہ لفظوں اور تراکیب کو چن لیا جائے اور ان کی درجہ بندی اس طرح کی جائے جسے پڑھتے وقت قاری پر گراں نہ گزرے اور مفہوم اس کی روح تک اترتا چلا جائے۔

ان مذکورہ اصولوں کے مطابق Etienne Dolet نے "New Testament" عیسائیوں کی مقدس کتاب اور "Summary of Christian Faith" کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں پیش کیا جس کے نتیجے میں عیسائی پادریوں کا ایک گروہ اس سے سخت ناراض ہوگیا اور اس پر مقدمہ قائم کرکے عدالت میں پیش ہونے کا فرمان صادر کردیا گیا۔ عدالتی کارروائی میں مذہبی صحیفوں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے اسے ملحد قرار دیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ متعدد بار جیل سے فرار ہونے اور پکڑے جانے کے بعد آخرکار مذہبی صحیفوں کی بے حرمتی کے الزام میں 1543 میں اسے زندہ آگ کے حوالے کردیا گیا۔

سترہویں صدی کے نصف تک اکثر مغربی مترجمین کے یہاں اسلوب ترجمہ کا یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ یعنی لفظی ترجمے سے پرہیز کیا جائے اور اصل متن کے مفہوم کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ Perrot d'Ablacourt جو سترہویں صدی کا ایک مشہور مترجم ہے اس کا یہ مشہور قول ہے کہ:

''ترجمہ کرتے وقت میں لفظوں کو گننے کے بجائے انھیں تولتا ہوں۔''[4]

ترجمہ کرتے وقت اکثر وہ اصل زبان اور مصنف سے ہٹ کر ایک ''نئی تخلیق'' پیش کرتا ہے جس کے تراجم کو فرانسیسی زبان کا ایک مشہور ومعروف گرامر داں Gille Menage ''Les belles infideles'' سے تعبیر کرتا ہے یعنی خوبصورت لیکن غیر دیانتدارانہ ترجمہ۔ یعنی ایسا ترجمہ جو اگر خوبصورت ہوگا تو دیانتدارانہ نہیں ہوگا اور اگر دیانتدارانہ ہوگا تو خوبصورت نہیں ہوگا۔ اسی صدی کے آخر سے ترجمے میں دیانتداری اور وفاداری کا تصور اہل علم کے درمیان بحث ومباحثے کا حصہ بننے لگا۔

ترجمے کے انھیں خیالات ونظریات کو مدنظر رکھ کر ماہرین اور اہل علم نے اس سے آگے بڑھ کر اس میدان میں تحقیق وجستجو کی نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کیں۔ ترجمہ نگاری اور فن ترجمہ بحیثیت ایک علیحدہ مضمون کے انیسویں صدی کے نصف میں باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔ اس سے قبل فن ترجمہ لسانیات اور تقابلی ادب (Comparative literature) کے زمرے میں شمار کیا جاتا تھا۔

اسی دور میں فنِ ترجمہ نگاری اور عملِ ترجمہ کے متعلق بے شمار نظریاتی تصانیف وجود میں آئیں جنھوں نے اس میدان میں تحقیق وجستجو کا دائرہ وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھیں میں سے ایک بے حد مشہور تصنیف جو فنِ ترجمہ کے میدان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے 1958 میں منظر عام پر آئی۔ وہ تصنیف J. P. Vinay اور J. Darbelnet کی Stylistique comparée du francais et de l'anglais ہے۔ اس تصنیف میں ان دونوں ماہرین نے یہ بحث پیش کی ہے کہ عملِ ترجمہ کے وقت مترجم کن ذہنی مراحل اور کشمکش سے گزرتا ہے۔ ان ذہنی مراحل کو وہ Procédé de traduction یعنی Process of translation کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انھیں اصول ترجمہ یا تکنیک بھی کہا جاسکتا ہے جنھیں ترجمہ کرتے وقت ایک مترجم دانستہ یا غیر دانستہ طور پر بروئے کار لاتا ہے۔

ان اصولوں کے متعلق جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے مصنف کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

Jean Paul Vinay کی پیدائش پیرس میں 1910 میں ہوئی۔ ابتدائی اعلی تعلیم یونیورسٹی آف پیرس اور یونیورسٹی آف کاں سے حاصل کی۔ پھر پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یونیورسٹی کالج لندن میں داخلہ لے لیا جہاں انھوں نے لسانیات میں ایم،اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1946 میں کناڈا چلے گئے اور یونیورسٹی آف مونٹریال کے شعبہ لسانیات وترجمہ کے صدر مقرر ہوئے۔ 1958 میں Jean Darbelnet کے ساتھ مل کر مذکورہ بالا کتاب مکمل کی۔ اس کے بعد 1967 میں خود کو یونیورسٹی آف وکٹوریہ سے منسلک کرلیا اور آخر عمر تک درس وتدریس میں یہیں مشغول رہے۔ 1999 میں وکٹوریہ، برٹش کولمبیا میں وفات پائی۔

مترجم جب کسی متن کے ترجمے کا ارادہ کرتا ہے تو زبانِ اصل اور زبانِ ترجمہ، دونوں زبانوں کے مکمل نظام سے سروکار رکھتا ہے۔ یعنی ایک طرف جہاں زبان کے داخلی امور کو سمجھتا ہے جیسے گرامر، قواعد، لفظوں کی ترکیب، جملوں کی ساخت تو دوسری طرف زبان کے ماورائی امور پر بھی دسترس رکھتا ہے مثلاً استعارہ، کنایہ، تلمیحات، کہاوت اور ضرب الامثال۔

ترجمہ کرتے وقت زبانِ اصل کے یہ مکمل نظام اس کے سامنے پہلے سے تحریری اور جمودی شکل میں موجود ہوتے ہیں جب کہ زبانِ ترجمہ میں تخلیق نو کا عمل ابھی باقی ہے۔ ترجمے کا عمل متنِ اصل کی قرأت سے شروع ہوتا ہے جب مترجم اصل مواد کے بیانیہ اور تخیلاتی پہلوؤں کی جانچ پرکھ شروع کردیتا ہے، اس کی اثر انگیزی کا اندازہ لگاتا ہے، جملے کی علمی اقدار کا تعین کرتا ہے۔ پھر جملے اور تراکیب کی خوبصورتی کو ناپتا اور تولتا ہے۔ ان سارے ذہنی مراحل کو بتدریج طے کرنے کے بعد مترجم کا ذہن اس جملے کا ترجمہ پیش کرتا ہے۔ بعض دفعہ یہ مراحل اتنی جلدی طے ہوتے ہیں کہ مترجم کو اس کا شعور بھی نہیں ہوپاتا اور اسے ایک اندرونی خوشی حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک حتمی فیصلہ لینے سے پہلے ٹھہر کر جائزہ لیتا ہے کہ اصل عبارت کا کوئی حصہ چھوٹ تو نہیں گیا۔

Jean Paul Vinay اور Jean Darbelnet کے مطابق، ان ذہنی کشمکش اور مراحل سے گزر کر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ایک مترجم سات اصولوں یا تکنیک کا سہارا لے کر ترجمہ کرتا ہے۔ ان ساتوں اصولوں کو اولاً وہ دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلی قسم میں لفظی ترجمے کو رکھتا ہے جسے وہ Direct یا Literal Translation کہتا ہے۔ لفظی ترجمہ کی وہ مزید تین قسمیں بتاتا ہے۔ (1) Emprunt (Borrowing words) یعنی لفظی استقراض (2) Calque (Borrowing structure) یعنی ترکیبی استقراض (3) Traduction litterale (Literal Translation) یعنی لفظ بہ لفظ ترجمہ۔

ترجمے کی دوسری قسم ماورائی ترجمے کی ہے جسے وہ Traduction oblique (Oblique translation) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ماورائی ترجمے کی وہ مزید چار قسمیں بتاتا ہے: (1) Transposition یعنی تبدیلِ قواعد۔ (2) Modulation یعنی تبدیلیِ نقطۂ نظر۔ (3) Equivalence یعنی مساوی، متبادل۔ (4) Adaptation یعنی تطبیق، ڈھالنا۔

(1) Emprunt یعنی لفظی استقراض: ترجمہ کرتے وقت مترجم لفظی استقراض کا سہارا اس وقت لیتا ہے جب زبانِ ترجمہ میں اس کا ہم شکل لفظ اور بدل موجود نہ ہو۔ ترجمہ کے اصول میں یہ سب سے آسان تکنیک ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کوئی نئی تکنیکی ایجاد سامنے آئے یا اس کے متعلق کوئی ایسا نیا تصور ہو جس کے معنی کی ترسیل کے لیے زبانِ ترجمہ میں ابھی لفظ موجود نہ ہو۔ اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو ترجمے کے وقت انگریزی زبان سے اردو میں مستعار لے لیے گئے ہیں۔ مثلاً کمپیوٹر، سائنس، ٹکنولوجی، فکشن، موبائل، لیپ ٹاپ وغیرہ۔

اسی طرح بہت سارے الفاظ جنھیں دوسری زبانوں سے مستعار لے لیا گیا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے مزاج اور روایت میں اس طرح ڈھل گئے ہیں کہ ان میں اب کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً ناول، افسر، ریل، پائپ وغیرہ۔

اس تکنیک کے استعمال کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ مترجم جب قاری کی زبانِ اصل سے نسبت اور تعلق کو مزید استوار کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ زبانِ اصل کے چند لفظوں کو ہو بہو زبانِ ترجمہ میں نقل کردیتا ہے جس سے قاری اصل زبان کے چند تہذیبی وثقافتی رموز سے بھی واقف ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی فرانسیسی متن کا ترجمہ کررہا ہے تو Monsieur (Mister) کا ترجمہ 'جناب' کرنے کے بجائے 'موسیو' ہی رہنے دیتا ہے اسی طرح "Boulevard" کا ترجمہ فٹ پاتھ یا راستہ کرنے کے بجائے 'بولوارڈ' ہی رکھتا ہے۔ اس سے مترجم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قاری کو اصل زبان کے اور قریب تر لے جایا جائے۔

(2) Calque، (Borrowing structure) یعنی ترکیبی استقراض: مترجم اس تکنیک کا استعمال اس وقت بروئے کار لاتا ہے جب زبانِ اصل کی ترکیب اپنے ترجمہ میں متعارف کرانی مقصود ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں مترجم پورے لفظ کو مستعار لیتا تھا لیکن اس صورت میں لفظوں کا ترجمہ تو پیش کرتا ہے لیکن محض اصل زبان کی ترکیب مستعار لے لیتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو اس کا استعمال زبانِ ترجمہ میں کسی نئی ترکیب کو متعارف کرانے کے لیے کرتا ہے یا پھر کسی نئی کہاوت یا ضرب المثل کی اختراع کے لیے کرتا ہے۔ پہلی صورت میں انگریزی سے اردو ترجمہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

Paper weight / کاغذ داب، Cold war / سرد جنگ، Science fiction / سائنس فکشن، Cold Proof / سردی روک، ٹھنڈ روک، Water ballet / آبی رقص وغیرہ۔ ایک دوسری ترکیب: Government of India / حکومت ہند، United Arab Emirates / متحدہ عرب امارات، National Council for Promotion of Urdu Language / قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ایک تیسری ترکیب کی چند مثالیں حاضر ہیں: United States of America / ریاست ہائے متحدہ امریکہ، World Health Organisation / عالمی ادارۂ صحت، Ministry of Human Resource Development / وزارت

ترقی انسانی وسائل وغیرہ۔

اس کے استعمال کی دوسری صورت یہ ہے کہ مترجم اس کے ذریعہ ایک نئی کہاوت یا ضرب المثل اختراع کرنا چاہتا ہو۔ ایسی صورت میں مترجم زبان اصل کے محاورات کا لفظی ترجمہ پیش کرتا ہے جو زبان ترجمہ میں قابل قبول ہوتا ہے۔ چند مثالیں غور فرمائیں۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے ''Its like finding a needle in a haystack'' یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کام کا مکمل ہونا یا اس میں کامیابی مل پانا لگ بھگ ناممکن ہو۔ اس کا ترجمہ ہے 'بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاشنا' ایک اور انگریزی محاورہ ملاحظہ ہو: ''Speak of the Devil and he will appear'' جس کا ترجمہ ہے 'نام لیتے ہی شیطان حاضر'۔ اسی طرح ''One hand cannot clap'' 'ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی' ''I saw stars when he punched me'' 'اس کے مکے کی مار نے مجھے دن میں تارے دکھا دیے'۔ غرض اس طرح کے بے شمار محاورے اور کہاوتیں ہیں جن کا لفظی ترجمہ پیش کرکے زبان ترجمہ میں مختلف نئے محاوروں کو متعارف کرایا گیا ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب کے دائرے کو وسیع کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اب یہ کہاوتیں اردو زبان کے سرمایہ کا حصہ ہیں جن سے اجنبیت کی کوئی بو نہیں آتی۔

(3) Traduction litterale، (Literal Translation) یعنی لفظ بہ لفظ ترجمہ: یہ ایک ایسی تکنیک ہے جس کی مدد سے مترجم اصل متن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ یہ اپنے آپ میں خود ایک مکمل اصول ہے جب تک معنی کی ترسیل میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو۔ چند مثالیں دیکھیے: "I left my spectacles on the table downstairs" 'میں نے اپنا چشمہ نیچے میز پر چھوڑ دیا ہے' ''This train arrives at Union Station at ten'' 'یہ ٹرین یونین اسٹیشن پر دس بجے آتی ہے'۔ یہ تکنیک اس وقت زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے جب دونوں زبانیں ایک ہی قبیل کی ہوں۔ ایسی صورت میں ترجمہ کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر عربی، فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنا مقابلتاً آسان ہے۔ اسی طرح ہسپانوی سے فرانسیسی میں ترجمہ کرنا قدرے سہل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آرٹکل اور اضافت کا تصور ان سب زبانوں میں لگ بھگ یکساں ہے۔ لسانیات کے ماورائی حقائق بھی لگ بھگ ملتے جلتے ہیں۔ اردو سے ہندی کا معاملہ بھی کافی آسان ہے کیونکہ جملوں کی ساخت تبدیل کرنا نہیں پڑتی۔

J. P. Vinay اس ضمن میں مزید کہتے ہیں کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ اس وقت کسی حالت میں قابل قبول نہیں ہوگا جب ترجمہ صحیح مفہوم کے علاوہ:

(1) کوئی دوسرا مفہوم پیدا کرے۔

(2) کوئی مفہوم پیدا نہ کرے۔

(3) جملے کی ساخت تبدیل کرنا ناممکن ہو۔

Direct یا Literal Translation کے ضمن میں آنے والے جو تینوں اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا استعمال ایک مترجم غیر افسانوی ادب کے ترجمے کے وقت زیادہ استعمال میں لاتا ہے جیسے کسی اخبار کا ترجمہ یا کسی مشین یا آلے کے استعمال کی ہدایات کا ترجمہ وغیرہ لیکن ادبی تصانیف کے ترجمے میں لسانی حقائق کے علاوہ لسانیات کے ماورائی حقائق کا ترجمہ بھی درکار ہوتا ہے جس کے لیے مترجم کو چار اور تکنیکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترجمے کی دوسری قسم ماورائی ترجمے کی ہے جس کی چار شکلیں ہیں:

(1) Transposition یعنی تبدیلی قواعد: ایک جملے کی لسانی نوعیت کو دوسری لسانی نوعیت سے تبدیل کرنے میں اس تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی مترجم عبارت ترجمہ میں فعل کو اسم سے اور اسم کو فعل سے تبدیل کرنے پر مجبور ہو۔ اس شرط کے ساتھ کہ معنی اور مفہوم میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک لازمی دوسری اختیاری۔ لازمی کی یہ مثال دیکھیں۔ انگریزی کا یہ جملہ 'He was still surprised' کا ترجمہ 'اس کی حیرت ابھی دور نہیں ہوئی تھی' تبدیلی قواعد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مترجم انگریزی کے اس جملۂ فعلیہ کا اسمی حالت میں ترجمہ کرنے پر مجبور ہے جب کہ 'He was still surprised' اور 'His surprise was not still faded away.' میں انگریزی زبان میں لفظ surprise اسم اور فعل دونوں نوعیت میں استعمال ہو سکتا ہے اور دونوں جملوں کا مفہوم بھی لگ بھگ یکساں ہے۔

اسی طرح ایک اردو سے انگریزی ترجمے کی مثال دیکھیں۔ 'جیسے ہی اس کی نیند کھلی' اور 'جیسے ہی وہ جگا' ان دونوں جملوں کا مفہوم یکساں ہے جن کا انگریزی ترجمہ 'As soonhe as he woke up/wakes up.' بغیر فعلی حالت میں تبدیل کیے ممکن نہیں ہے۔ جب کہ اردو میں اسمی اور فعلی دونوں حالت کے استعمال میں کوئی دشواری نہیں۔

Transposition کی دوسری صورت اختیاری ہے جس میں مترجم جملے کی ایک نوعیت کو دوسری نوعیت سے تبدیل کرنے پر مجبور نہیں ہوتا بلکہ یہ اختیاری ہوتا ہے۔ اس کی یہ ایک مثال دیکھیں: انگریزی کا یہ جملہ 'He informed about his return' اور 'He informed that he will return' میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق واضح نہیں ہوتا اور لفظ 'return' کا استعمال فعلی اور اسمی دونوں حالتوں میں ہوا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 'اس نے اپنی واپسی کی اطلاع دی' اور 'اس نے اطلاع دی کہ وہ واپس آئے گا' مترجم کے لیے دونوں صورت میں ممکن ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 'اس نے اپنی واپسی کی اطلاع دی' اور 'He informed me about his return' زیادہ ادبی اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

(2) Modulation یعنی تبدیلی نقطۂ نظر: مترجم اس تکنیک کا استعمال اس وقت کرتا ہے جب لفظی ترجمہ یا تبدیلی لفظ کے استعمال سے ترجمے میں کوئی حل ملنے کی امید نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں گرامر و قواعد کے اعتبار سے ترجمہ شدہ عبارت میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن وہ زبان ترجمہ کے مزاج اور آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس طرح نظام لسان میں قابل قبول نہیں ہو پاتا۔ اس صورت میں مترجم Modulation یعنی تبدیلی نقطۂ نظر تکنیک کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مترجم اصل متن کے جملے کے ایک نقطۂ نظر کو زبان ترجمہ کے دوسرے نقطۂ نظر سے تبدیل کر دیتا ہے۔ اور اس تبدیلی سے مفہوم کی ادائیگی میں کچھ خاص تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: 'دودھ جیسا سفید' اس جملے کا اگر انگریزی میں لفظی ترجمہ 'As white as milk' کیا جائے تو گرامر کے حساب سے درست تو ہو سکتا ہے لیکن انگریزی نظام لسان میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس کا درست ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو نقطۂ نگاہ میں تبدیلی کرنے کی ضرورت ہوگی اور 'As white as snow' زیادہ بہتر حل ہوگا۔ برصغیر میں سفیدی کو اگر دودھ سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے تو انگریزی داں کے یہاں سفیدی کا تصور برف یعنی snow سے متصل ہے۔ اسی طرح اس جملے پر غور کریں 'ان کی شکل آپس میں اتنی ملتی جلتی تھی جیسے جڑواں ہوں'۔ اس جملے کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے 'جڑواں' کی جگہ 'As two drop of water' یعنی جیسے پانی کے دو قطرے ہوں اور فرانسیسی میں ترجمہ کرنے کے لیے 'comme deux petits pois' یعنی 'جیسے دو مٹر کے

وانے ہوں' کا استعمال کرنا پڑے گا۔ ایک اور جملہ جس میں مترجم کو سخت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے وہ ہے 'سفید جھوٹ'۔ اس کا ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی زبان میں' White lie ' ترکیب موجود ہے لیکن دونوں ترکیبوں کا محل استعمال بالکل جدا ہے۔ انگریزی میں ' White lie ' کا مطلب ایک معصوم سا جھوٹ ہے جس سے کسی کو نقصان پہنچانا یا غلط جانکاری دینا مقصد نہیں ہوتا مگر اردو میں سفید جھوٹ اس کے یکسر الٹ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سفید جھوٹ کے لیے' Black lie ' کا استعمال کیا جا سکتا ہے جو سفید جھوٹ کے بے حد قریب ہے۔ الغرض، اس تکنیک کی مدد سے مترجم جملے کے ایک حصے کے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نگاہ سے تبدیل کر دیتا ہے۔

(3) Equivalence یعنی مساوی، متبادل: اس تکنیک کے استعمال کے لیے مترجم کو بڑی حد تک دونوں زبانوں اور ان کی تہذیب و ثقافت کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس تکنیک کا استعمال ایک مخصوص کیفیت یا ایک مکمل تصور کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس میں اصل زبان کے لفظوں کی تعداد، جملے کی ساخت، ان کی گہرائی، معنوی وسعت سے مترجم کو کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ اس کا پورا دھیان اس مخصوص کیفیت اور تصور کو دوسری زبان میں منتقل کرنے پر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ کلاسیکی مثال عمدہ ثابت ہوگی کہ اگر کسی اردو بولنے والے کو چوٹ یا تکلیف پہنچے تو وہ 'آہ' بولے گا اگر کسی انگریز کو پہونچے تو ' Ouch! ' اور اگر کوئی فرانسیسی ہو تو ' Aie! ' 'آئی' کی آواز نکلے گی۔ محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال کے متبادل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اس ضمن میں یہ محاورہ 'دودھ کا جلا، چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے' کا متبادل انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ انگریزی میں اس کیفیت کو ' Once bitten, twice shy ' سے بیان کیا جا سکتا ہے اور فرانسیسی میں اس کا متبادل "chat échaudé craint l'eau froide" یعنی 'دودھ سے جلی بلی، پانی بھی پھونک پھونک کر پیتی ہے'۔

(4) Adaptation یعنی تطبیق، ڈھالنا: اس آخری تکنیک کا استعمال مترجم اس وقت کرتا ہے جب اصل زبان کی کوئی کیفیت یا تصور زبان ترجمہ میں نہ پائی جاتی ہو اور مترجم اس کے مدمقابل کوئی اور کیفیت یا تصور بیان کرے جسے وہ زبان اصل کی کیفیت اور تصور کے مماثل سمجھتا ہو۔ مترجم کے لیے یہ ایک انتہائی دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی پس منظر میں ایسے لاتعداد تصورات موجود ہیں جنھیں دوسری زبانوں میں ڈھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مثلاً 'مانگوں میں سندور بھرنا'۔ اس کیفیت کا مغربی پس منظر میں کوئی متبادل تلاش کرنا لگ بھگ ناممکن ہے۔ اس صورت میں مترجم کو اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری کیفیت بیان کرنی ہوگی کہ مطلب بھی ادا ہو جائے اور بات بھی بن جائے۔ اسی طرح لفظ 'بونی' ہے جو دن کی پہلی کمائی ہوتی ہے اسے کہتے ہیں۔ اس کا تصور صرف ایک پہلی کمائی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ تاجر یا محنت کش کی ایک عقیدت بھی اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ ان جیسے تصورات کا مغربی تہذیب وثقافت میں متبادل موجود تو نہیں ہے لیکن مترجم انھیں کے مثل یا قریب تر دوسرے تصور کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی پس منظر میں انقلاب فرانس کے زمانے میں جو لوگ انقلاب کے مخالف تھے انھیں سزا دینے کے لیے ' Guillotine ' کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ اس لفظ کے ساتھ پورا تصور منسلک ہے۔ یہ ایک ایسا تختہ ہوتا تھا جس کے اوپر ایک دھاردار، کافی بڑا اور وزنی بلیڈ لٹکتا رہتا اور اس کے نیچے مجرم کو اس طرح لٹا دیا جاتا ہے کہ اس کی گردن اور بلیڈ دونوں ایک سیدھ میں ہو جائیں۔ حکم ملتے ہی جلاد بلیڈ کو جوری سے بندھا ہوتا چھوڑ دیتا اور مجرم کا سر دھڑ سے الگ ہو جاتا۔ بہرحال اس تصور کا مفہوم برصغیر کے اردو قاریوں کے لیے سمجھنا آسان نہیں ہوگا جب تک کہ حاشیہ لگا کر اس کی وضاحت نہ کی جائے۔ بصورت دیگر مترجم اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری کیفیت بیان کرتا ہے جس سے قاری کو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

### حواشی

1. Marcus Tullius Cicero بحوالہ Ines Oseki-Depre، Theories et pratique de la traduction litteraire، Armand Colin، Paris، 1999، ص 19
2. Saint Jerome، بحوالہ Ines Oseki-Depre، ص 20
3. Edmond Cary، " Etienne Dolet, 1509-1546 "، Babel، جلد 1، شمارہ 1، ستمبر، 1955، ص 17-20۔
4. Perrot d'Ablancourt بحوالہ Ines Oseki-Depre، ص 31

■

**Abdur Rahman Ansari**
Asst. Prof. (French)
Dept of Foreign Languages
Aligarh Muslim University

## ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

# جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

صابر علی سیوانی

# اردو شاعری میں کتاب

**کتابیں** علم کا خزینہ ہوتی ہیں۔ ان میں علم وفن کے بیش بہا موتی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان موتیوں سے قدر شناس افراد استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو کامیاب بناتے ہیں۔ علم وفضل کی بڑی بڑی مسندوں کو رونق بخشتے ہیں۔ کتابیں ادب اور تہذیب وثقافت کی ترویج واشاعت کا بہترین وسیلہ ہوتی ہیں جو ہماری قابلِ افتخار اور لائقِ رشک روایت کو فروغ دینے کا کام کرتی ہیں۔ کتابیں نہ صرف تنہائی کی بہترین رفیق ہوتی ہیں بلکہ انسان کی صحیح رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ کتابوں کی اہمیت وافادیت سے بھلا کون شخص انکار کرسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب سے قطع نظر ناخواندہ افراد بھی کتابوں کی قدر وقیمت بخوبی جانتے ہیں۔ کتابوں کی اہمیت سے واقف ہونا اور اُن سے استفادہ کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

کتاب کی افادیت سے ہر شخص واقف ہوتا ہے، لیکن کتاب خوانی کا شوق ہر شخص کی فطرت میں شامل نہیں ہوتا ہے۔ ماضی میں کتابوں سے دلچسپی کا رجحان عام ضرور رہا ہے، لیکن موجودہ زمانے میں کتاب خوانی یا مطالعے کا شوق بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ان دنوں کتابوں کے مطالعے کا چلن اس لیے کم ہوگیا ہے کیونکہ دوسرے ذرائع ترسیل وابلاغ کے دامن کی اسیری انسان کا مقصد بن چکی ہے۔ روایتی قدروں کے فقدان کے ساتھ ساتھ مطالعے کی عادت سے دوری اب ایک جدید روایت بن چکی ہے۔ انٹرنیٹ، موبائیل، ٹیلی ویژن کے علاوہ دیگر الیکٹرانک ذرائع تفریح وترسیل میں دلچسپی نوجوانوں کے ساتھ ساتھ عمر رسیدہ افراد میں بھی دیکھی جارہی ہے۔ بقول حالی ''چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی'' کی مکمل تصویر موجودہ معاشرے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والی ہر چیز کی تقلید کرنی چاہیے، لیکن اپنی تقلید میں اپنی صحت مند اور قابلِ فخر روایت سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے اور کتابوں سے دوری اسی روایت سے انحراف کی مثال پیش کرتی ہے۔

کتاب کو مرکز میں رکھ کر سیکڑوں شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ ہر شاعر نے اپنے اپنے طور پر اس کے مختلف پہلو پیش کیے ہیں۔ کسی نے عام زندگی میں روشنی کی ایک علامت کے طور پر اسے پیش کیا ہے۔ کسی نے اسے محبوب کے حسین چہرے سے تشبیہ دی ہے۔ کوئی تخلیق کار کتاب کو دل سے تشبیہ دیتا ہے تو کوئی فنکار اسے محبوب کی مجسم تصویر قرار دیتا ہے۔ غرض متعدد شعرا نے کتاب کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جن دنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں بی اے سال آخر کا طالب علم تھا تو طلبہ کی الوداعی تقریب کے موقع پر میرے صدر شعبۂ فارسی نے مجھے کارڈ پر ایک شعر لکھ کر دیا تھا۔ وہ شعر الوداعی تقریب کے موقع پر اپنے استاد کی جانب سے لکھ کر دیا جانے والا محض ایک شعر ہی نہیں تھا بلکہ وہ میری ذہنی وفکری کیفیات کی ترجمانی کرنے والا شعر تھا۔ اس شعر کا خالق کون ہے؟ مجھے اس کا علم تو نہیں لیکن وہ شعر آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے، اسے آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

میں اک کتاب کی مانند ہوں زمانے میں
مجھے شعور کے ماحول میں پڑھا جائے

اس شعر سے ایک بات تو ضرور سمجھ میں آجاتی ہے کہ کتابیں شعور کے ماحول میں پڑھی جانی چاہئیں ورنہ ان سے استفادہ ممکن نہیں۔

نیچرل شاعری کے امام نظیرا کبرآبادی جن کی مشہور نظم 'بنجارہ' کے بند کا ایک مصرع ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں سماجی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ نظیرا کبرآبادی نے بڑی آسان زبان میں مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کے حوالے سے نظمیں کہی ہیں۔ کتاب کو

مرکز نگاہ بنا کر ایک شعر لکھا ہے، جس میں انھوں نے دل کی کتاب کو تمام کتابوں کی تفسیر کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جب میں نے دل کی کتاب پر غور کیا تو تمام کتابوں کے مفاہیم و معانی سمجھ میں آ گئے۔ نظیر کہتے ہیں۔

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

آخر یہ دل کی کتاب ہے کیا؟ نظیر نے دل کی کتاب سے کیا مراد لیا ہے؟ اس سوال کا بس اتنا جواب ہو سکتا ہے کہ شاعر نے اس شعر میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہزاروں کتابوں کے مطالعے سے جو مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا وہ صرف ایک کتاب کے پڑھنے سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے دل سے مربوط ہزاروں فلسفے، جو حیاتِ انسانی سے رشتہ رکھتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی ہی کی طرح سعید راہی نے بھی ایک شعر میں یہی فلسفہ پیش کیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ دل سے بہتر کوئی کتاب نہیں، اس لیے کبھی کبھی اسے پڑھتے رہنا چاہیے تاکہ اقدارِ انسانی کی نزاکتوں سے آگاہی ہوتی رہے۔ بقول سعید راہی۔

گاہے گاہے اسے پڑھا کیجیے
دل سے بہتر کوئی کتاب نہیں

کتاب کے ذیل میں شعرا نے جن نکاتِ فکر اور مضمراتِ خیال کو پیش کیا ہے، انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کلاسیکی شعرا کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے سخنوروں کے یہاں بھی کتاب ایک بہترین ذریعہ استفادہ رہا ہے، جس کے سہارے انھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اور قاری کی فکری و ذہنی ورزش کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ عصری، سیاسی و سماجی خلفشار کے ماحول میں کتاب کس قدر بامعنی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی فکر پاکستان کے بہترین شاعر غلام محمد قاصر نے ایک شعر میں پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا جو بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے اس کے ہاتھوں میں اگر کتاب تھما دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور یہ کہ یوں ہی بیس صدیاں تو گزر چکی ہیں کم از کم جاری اکیسویں صدی میں جو ہم نے امن و سکون کے خواب دیکھے ہیں، خدا کرے اس خواب کی تعبیر تو مثبت ہو۔

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آ جائے کتاب تو اچھا ہو
اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو

نصیر احمد ناصر اکیسویں صدی کے نمائندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کتاب کے حوالے سے بہت ہی فکر انگیز بات اپنے ایک شعر میں کہی ہے۔ ناصر کا کہنا ہے کہ علم و حکمت اور فلسفے کی باتیں تو صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں، ان کا اطلاق نہ اصل زندگی میں پایا جاتا ہے اور نہ درسگاہوں کی نصابی کتابوں میں۔ درسگاہوں میں تو بس نصابوں کے نام پر بے فیض اور بے سود ابواب و اسباق پڑھائے جاتے ہیں، جو اپنی وقعت بڑی حد تک کھو چکے ہیں۔

فلسفے سارے کتابوں میں الجھ کر رہ گئے
درسگاہوں میں نصابوں کی تھکن باقی رہی

مظفر نگر (یوپی) میں 1943 میں پیدا ہونے والے سید ناصر زیدی کی ایک شاعر کے طور پر منفرد شناخت ہے۔ عشق و محبت اور معاملاتِ دنیا کو شعری قالب میں جس مخصوص انداز سے اُنھوں نے ڈھالا ہے وہ ان کے انفراد و امتیاز کے لیے کافی ہے۔ ان کا ایک ضرب المثل شعر ہے جس میں لفظ 'کتاب' کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔

مثالِ سادہ ورق تھا مگر کتاب میں تھا
وہ دن بھی تھے میں ترے عشق کے نصاب میں تھا

تحقیقی مقالے یا مضامین لکھنے والوں کو حوالوں کے لیے ان کتابوں سے استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو یا تو برسوں سے الماریوں کی زینت ہوتی ہیں یا جو اتنی پرانی ہو چکی ہوتی ہیں کہ بوسیدگی کی وجہ سے ان کے اوراق چھوتے ہی بکھرنے لگتے ہیں۔ ان حوالہ جاتی کتابوں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ حالانکہ آج کل سہل پسند اصحاب انٹرنیٹ سے ہی اپنا کام چلا لیتے ہیں، لیکن انٹرنیٹ پر موجود مواد استناد کا درجہ نہیں رکھتے۔ ان میں کئی طرح کی غلطیاں رہتی ہیں یا پھر ان کے حوالے مشکوک ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے مشہور شاعر فارغ بخاری (1917-1997) اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ فارغ بخاری نے اپنی مثال ان حوالوں کے طور پر استعمال ہونے والی پرانی اور بوسیدہ کتابوں سے دی ہے جو اس وقت کھولی جاتی ہیں جب کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں ہوتا ہے۔ ان کا یہ شعر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ فنکار کی قدر اس کی زندگی میں نہیں ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب کوئی بڑا فنکار یا بڑا آدمی جو کچھ کر کے گزر جاتا ہے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی مثال پیش کی جاتی ہے اور اسے خراجِ عقیدت کے طور پر تحسین آمیز کلمات استعمال کیے جاتے ہیں۔ فارغ بخاری کے لفظوں میں۔

یاد آئیں گے زمانے کو مثالوں کے لیے
جیسے بوسیدہ کتابیں ہوں حوالوں کے لیے

سلیم شاہد معاصر اردو شاعری کے حوالے سے اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ مخصوص پیرایۂ اظہار کے باعث ان کی شاعری بھیڑ میں بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ کتابوں کا ذکر کیے بغیر انھوں نے اس کے مفہوم کو بڑی خوبصورتی سے اپنے ایک شعر میں پیش کیا ہے۔ اظہار خیال کا یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے کہ کنائے میں کوئی بات کہہ دی جائے اور اس کے مفہوم کی ترسیل اسی انداز سے قاری تک ہو سکے جس مفہوم کی وضاحت تخلیق کار کرنا چاہتا ہے۔ سلیم شاہد ایک سلجھے ہوئے فنکار ہیں۔ انھوں نے الماریوں میں بند رفاقتوں کا تذکرہ کیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ جو رفاقتیں الماریوں میں بند ہیں، وہ اوراق کا جامہ زیب تن کرتے ہوئے ایک پوری داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئی ہیں۔ سلیم شاہد کے فکری و تخیلاتی اظہار پر نظر ڈالیے۔

الماریوں میں بند ہیں کیا کیا رفاقتیں
اوراق داستاں ہیں یہ پہنے ہوئے لباس

نسائی جذبات کے اظہار میں مہارت رکھنے والی شاعرہ پروین شاکر نے بھی اپنے احساسات و جذبات کو کچھ اسی پیرائے میں پیش کیا ہے اور کتاب کو استعارہ بنایا ہے۔

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

کتابوں کے غیر افادی پہلو پر بھی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ کتاب میں پوشیدہ زندگی کے اصول، قاعدے، قانون، طور طریقے یہ سب اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ یہ درست ہے کہ کتابوں کے مطالعے سے علم و دانش کی دنیا آباد ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کتابیں شکم کی آگ لیے شہر بہ شہر پھر رہے شخص کی ضرورت پوری کر پاتی ہیں؟ بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بے روزگاری کی مار جھیل رہے نوجوانوں سے اگر پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ کتابوں میں جو اصول کی باتیں لکھی گئی ہیں، وہ ضرور اچھی لگیں، لیکن ہم نے ان اصولوں پر عمل کر کے بہت بڑی بھول کی۔ اس زاویۂ نگاہ سے بھی شاعروں نے کتاب کو استعاراتی طور پر استعمال کرتے ہوئے سماج کے سلگتے ہوئے بے روزگاری کے مسئلے پر طنز کیا ہے۔ روزی روٹی اور کتابوں کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ سیکڑوں کتابیں طلبہ اس اُمید پر پڑھ جاتے ہیں کہ انھیں ڈگریاں مل جائیں گی اور ان ڈگریوں کے سہارے انھیں نوکریاں مل جائیں گی، لیکن کیا یہ ممکن ہو پاتا ہے؟ نظیر باقری اس عہد کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے کتاب کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس طنزیہ انداز میں یہ شعر رقم کیا ہے، اس کی معنویت اور صداقت سے بھلا کون شخص انکار کر سکتا ہے۔ روٹی کے چار حروف لے کر کھڑا ہونے والا شاعر معاشرے سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہے کہ۔

کھڑا ہوں آج بھی روٹی کے چار حرف لیے
سوال یہ ہے کتابوں نے کیا دیا مجھ کو؟

مہدی پرتاب گڑھی نے بھی اصولی باتوں، کتابوں میں موجود پند و نصائح اور خوبصورت و دل نشین حکایات کی تعریف ضرور کی ہے اور انھیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے کی بات بھی کی ہے، لیکن ان اصولی باتوں پر عمل کرنے کو بھول بتایا ہے۔ کیونکہ زندگی کی گاڑی صرف اُصولوں کے پہیوں پر نہیں چلتی۔

اچھی لگیں کتابوں میں باتیں اصول کی
اُن پر عمل کیا ہے یہی میں نے بھول کی

پڑھنے میں جو چیزیں آتی ہیں، عملی طور پر انھیں زندگی میں داخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جو پڑھا جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے جیا بھی جائے کیونکہ کتاب زندگی گزارنے کا سلیقہ ضرور سکھاتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سلیقہ زندگی کے شب و روز میں داخل کرنے والے کو راس بھی آسکے۔ ظفر صہبائی 1946 میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آج وہ ہندوستان کے معتبر شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ صہبائی زندگی کو کتابوں سے الگ رکھنے کی وکالت کرتے ہیں بلکہ وہ خود بھی اپنی زندگی میں ان کتابی اصولوں کو اُتارنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسے زندگی کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا۔

جو پڑھا ہے اُسے جینا ہی نہیں ہے ممکن
زندگی کو میں کتابوں سے الگ رکھتا ہوں

کچھ یہی انداز ہمیں ندا فاضلی کے اس شعر میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ندا نے زمانے کے تجربات کی روشنی میں زندگی کو دیکھنے کی وکالت کی ہے اور کتابوں کو ہٹا کر زندگی کی حقیقت کو پڑھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ خود ہی اس مفہوم کو ندا فاضلی کے اس شعر پر نظر ڈال کر سمجھ سکتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے، کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

'کتاب' لکھی ہوئی چیز، جلد، نسخہ، رسالہ، بہی رجسٹر اور بیاض کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ فیروز اللغات میں اس کے سات معانی بتائے گئے ہیں جنھیں یہاں نقل کیا گیا ہے۔ کتاب سے متعلق کئی اصطلاحیں مشہور ہیں جو اس طرح ہیں۔ کتاب کا کیڑا، کتاب حوالہ، کتاب آسمانی، کتاب مقدس، کتاب رو، کتابچہ، کتب فروش، کتب خانہ وغیرہ۔ کتابی چہرہ بھی مستعمل ہے جو لمبوترے چہرے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر کتابی چہرہ محبوب کے خوبصورت چہرے کو بھی کہا جاتا ہے اور یہ اس کے حسن و دلکشی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے تو کتابوں کو کتابی

**کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں جو عام دوستوں کی طرح کم از کم بے وفائی نہیں کرتی ہیں۔ کتابیں ایک انسان کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابیں تفریح کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ دل جوئی کے وسائل پیدا کرتی ہیں اور آزمائش کے وقت ہمیں حوصلہ دیتی ہیں۔ سماج، سیاست، ادب، آرٹ، کلچر، ثقافت اور ملکی و بین الاقوامی حالات سے واقف کراتی ہیں۔ نئی نئی اختراعات، نئی نئی ایجادات کے بارے میں یہ کتابیں ہمیں باخبر کرتی ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھتی ہیں۔**

چہرے کے آگے بھلا دینے کی بات تک کہہ دی ہے۔

بھلا دیں ہم نے کتابیں کہ اس پری رو کے
کتابی چہرے کے آگے کتاب ہے کیا چیز؟

جدید حسیت کا اظہار جن معاصر شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے، ان میں سرفہرست محمد علوی کا نام آتا ہے۔

کتاب کے حوالے سے بھی جو لفظیات انھوں نے وضع کی ہیں، ان لفظیات کو ان سے پہلے مجھے لگتا ہے شاید ہی کسی شاعر نے اس انداز سے استعمال کیا ہو۔ کتاب کھولتے ہی حرفوں میں کھلبلی مچ جانا اور قلم اُٹھاتے ہی کاغذ کو پھیلتے دیکھنا جیسی باتیں دور کی ہی منطق معلوم ہوتی ہیں جو فکر کی منطق پر غالب نظر آتی ہیں۔

کتاب کھولوں تو حرفوں میں کھلبلی مچ جائے
قلم اُٹھاؤں تو کاغذ کو پھیلتا دیکھوں

حفیظ بنارسی کے یہاں بھی ایک ایسا شعر ملتا ہے جو کتاب کی معنویت کو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ تجربوں کی تلخی کو کتاب کے پردے میں بڑی عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے کوئی نئی بات درج ذیل شعر میں نہیں کہی ہے، لیکن ایک نئے انداز سے پرانے خیال کو اس شعر میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

وفا نظر نہیں آتی کہیں زمانے میں
وفا کا ذکر کتابوں میں دیکھ لیتے ہیں

وصال و فراق کی باتیں کتابوں میں اتنی بار دہرائی جاچکی ہیں کہ اب کوئی اس بات کو دہراتا ہے تو وہ ذہن پر گراں معلوم ہوتی ہیں۔ آج کل جس طرح کی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آرہی ہیں ان میں بیشتر ایسی ہوتی ہیں جو چبائے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانے کی تصویر پیش کرتی ہیں یا کسی پرانی تحریر یا پرانی کتاب کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی ادبی روش کو ہدف تنقید و طنز بناتے ہوئے برصغیر کے بلند پایہ شاعر افتخار عارف یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

وہی تعریف کی باتیں، وہی حکایت وصل
نئی کتاب کا ایک ایک ورق پرانا تھا

علامہ اقبال کی پوری شاعری درس انسانیت، درسِ اخلاق و محبت اور اسلامی افکار کی ترجمانی کرتی ہے اقبال نے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تو ایسی قوم سے ہے جو کتاب خواں ضرور ہے، لیکن صاحبِ کتاب نہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

کتاب کو مرکزِ خیال بنا کر بشیر بدر نے بھی ایک شعر لکھا ہے جو بڑی حد تک علامتی شعر کی خوبیوں سے متصف معلوم ہوتا ہے۔

کاغذ میں دب کے رہ گئے کیڑے کتاب کے
دیوانہ بے پڑھے لکھے مشہور ہوگیا

سیماب اکبر آبادی کا ایک شعر یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس میں انھوں نے راست طور پر کتاب کا ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن اس شعر سے جو مفہوم واضح ہوتا ہے اس سے کتاب کی ہی شبیہ اُبھر کر آتی ہے۔ وہ بربادی کی آندھی میں اوراق دل کے اُڑنے پر کبیدہ خاطر تو ضرور ہیں، لیکن وہ یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ ان اوراقِ دل میں جو صفحہ ان کے محبوب کی تصویر پر مشتمل ہے، کہیں وہ نہ گردِ بربادی میں اُڑ جائے۔ خیال کی اس نزاکت پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ خیر اب سیماب کے اس شعر کو ملاحظہ کیجیے اور ان کے شعری کمال کو محسوس کیجیے۔

اُڑ رہے ہیں گردِ بربادی میں کچھ اوراقِ دل
اُن میں وہ صفحہ نہ ہو، جس پر تری تصویر ہے

'کتاب' کو کلیدی لفظ کے طور پر سیکڑوں شعرا نے اپنے کلام میں برتا ہے۔ طوالت میں نہ جا کر یہاں بس چند دیگر اشعار نقل کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

کھلی کتاب تھی رنگوں بھری زمیں میری
کتاب میری تھی رنگِ کتاب اس کا تھا (وزیر آغا)

رہتا تھا سامنے ترا چہرہ کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں (شکیب جلالی)

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا (جگر مرادآبادی)

کس طرح جمع کیجیے اب اپنے آپ کو
کاغذ بکھر رہے ہیں پُرانی کتاب کے (عادل منصوری)

قبروں میں نہیں، ہم کو کتابوں میں اُتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مَرے ہیں (اعجاز توکل)

اُلٹ رہی تھیں ہوائیں ورق ورق اس کا
لکھی گئی تھی جو مٹی پہ وہ کتاب تھا وہ (زیب غوری)

جسے پڑھتے تو یاد آتا تھا، تیرا پھول سا چہرہ
ہماری سب کتابوں میں ایک ایسا باب رہتا تھا (اسعد بدایونی)

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے، اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
(بشیر بدر)

الفاظ سو نہ جائیں کتابوں کو اوڑھ کو
دانشورانِ قوم ذرا جاگتے رہو (منصور عثمانی)

کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں جو عام دوستوں کی طرح کم ازکم بے وفائی نہیں کرتی ہیں۔ کتابیں ایک انسان کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابیں تفریح کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ دل جوئی کے وسائل پیدا کرتی ہیں اور آزمائش کے وقت ہمیں حوصلہ دیتی ہیں۔ سماج، سیاست، ادب، آرٹ، کلچر، ثقافت اور ملکی و بین الاقوامی حالات سے واقف کراتی ہیں۔ نئی نئی اختراعات، نئی نئی ایجادات کے بارے میں یہ کتابیں ہمیں باخبر کرتی ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اب کتابیں پڑھنے والے لوگ ان سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں؟ کیا ان کتابوں کو پڑھا جاتا ہے جو لائبریریوں کی زینت ہیں؟ کتابوں کی زبوں حالی کا اندازہ گلزار کی ایک نظم 'کتابیں' پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ گلزار نے بڑی خوبصورتی سے کتاب کی معنویت اور موجودہ معاشرے میں ان کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ یہ ایک پُر اثر، دل انگیز، دلگیر، دل پذیر اور شاہکار نظم ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پَردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سوکھے پیڑ لگتے ہیں وہ اب الفاظ
کہ جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر نیم سجدے میں
پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور
مہکے ہوئے رقعے کتابیں مانگنے، گرنے اٹھانے کے
بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

سید تقی عابدی کا مضمون 'کتابوں کا تحلیلی تبصرہ' حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالے 'سب رس' میں شائع ہوا ہے جو نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ اس تبصرے میں اس نظم کے حوالے سے عابدی صاحب تحریر کرتے ہیں:

''شاعر نے نظم کے چہرے میں کتابوں سے دوری، کتابی ریڈرشپ کی کمی اور موجودہ دور میں کمپیوٹر اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی ترقی اور گلوبل ولیج کے ماحول سے وابستگی کے حقیقی اور سچے اثرات کو شعری رس میں گھول کر جذبات کا ساغر پیش کیا ہے۔ شاعر نے فوراً روایت سے رشتہ جوڑ کر ذہن کو جھنجھوڑا کہ انھی کتابوں میں جو انسانی، سماجی، علمی، اخلاقی اور مذہبی قدریں اشعار میں، خاکوں، کہانیوں، افسانوں، ڈراموں، ناولوں میں پڑھی اور سنی جاتی تھیں، وہ ذہن کے خانوں میں ہمیشہ زندہ اور تازہ رہتی تھیں۔ آج موجود نہیں۔ یہی نہیں بلکہ انسانی اور خاندانی رشتے جن سے سماج اور خاندان بندھا رہتا تھا وہ بندھن جس کا تذکرہ وہ تہذیب و تربیت، طور وطریقہ جو تخلیقی شہ پاروں کی وجہ سے کتابوں کے نقش کے ذریعے دل و دماغ پر ثبت ہوتا تھا آج بگڑ چکا ہے''۔
(ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، دسمبر، 2017، صفحہ 10)

کتابوں سے دوری کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کسی لائبریری میں چلے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو دس، دس پندرہ برس کی مدت میں ایک دو بار جاری ہوئی ہیں۔ دوسری طرف کتابیں کثرت سے شائع بھی ہورہی ہیں۔ جو بقول مشفق خواجہ ''بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو شائع ہونے کے بعد ضائع ہوجاتی ہیں'' کی مصداق ہیں۔ نوجوان نسل تو کتابوں سے ایسے بھاگتی ہے، جیسے سگ گزیدہ پانی کو دیکھ کر۔ بہرحال کچھ نوجوان ایسے ہوتے ہیں جو کتب خانوں کا رُخ ضرور کرتے ہیں، لیکن ان کا کیا مقصد ہوتا ہے، اسے مجتبیٰ حسین کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے۔

''میں لائبریری میں لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کے علاوہ کبھی کبھی نوجوانوں کے دلوں کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے واقف ہوں جو لائبریری میں علم کی پیاس بجھانے نہیں آتے، بلکہ اپنی نظر کی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لائبریری کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مجنوں نے صحرا کو استعمال کیا تھا۔ مجنوں لیلیٰ کی تلاش میں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرتا تھا اور یہ اپنی محبوباؤں کی تلاش میں لائبریریوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ لائبریری ان کے لیے وہ مقام بن جاتی ہے جہاں دو بچھڑے ہوئے دل آپس میں مل جاتے ہیں۔ پھر نظریں چار ہوتی ہیں، دل کے معاملات سلجھنے لگتے ہیں۔ نظروں کی پیاس بجھنے لگتی ہے۔ دونوں پر ایک سرور کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ تب ایک دوسرے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں''۔
(مضمون لائبریری، چند گھنٹے، تکلف برطرف، ص 81)

کتابوں کی افادیت پر شعرا نے بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن کتابوں سے جس قدر دوری بڑھتی جارہی ہے ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ کتابوں کی زبوں حالی پر شکیب جلالی کا ایک شعر حساس دل انسانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

■

**Sabir Ali Siwani**
H.No.9-4-87/C/12, Ist Floor
Behind Moghal Residency, Tolichowki,
Hyderabad (Telangana) Pin:500008
CellNo:9989796088
Email: mdsabirali70@gmail.com

فیضان حیدر

# غلام مجتبیٰ انصاری
# اور ان کا سفرنامۂ ایران

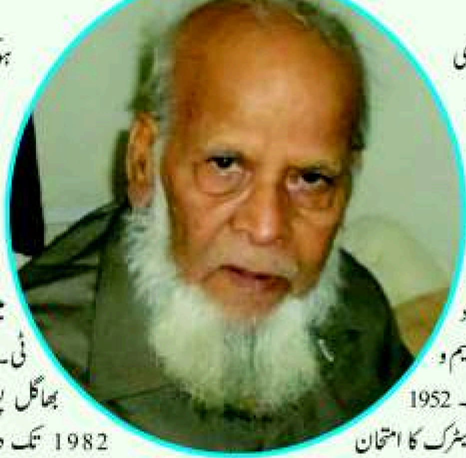

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کا تعلق ضلع ویشالی کی ایک مردم خیز بستی عطاء اللہ پور سے ہے۔ وہ 18 مئی 1938 کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد نصیر الدین تھا جو لعل گنج کے ایک اسکول میں بحیثیت استاد مامور تھے۔ ابتدائی نشو ونما اور تعلیم و تربیت والد کے زیر سایہ ہوئی۔ 1952 میں لعل گنج کے اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد حصول علم کا شوق و ذوق دامن گیر ہوا، چنانچہ انھوں نے پٹنہ کی راہ لی اور پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں سے 1954 میں آئی اے اور 1956 میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ 1958 میں فارسی میں ایم۔اے اور 1960 میں اردو میں ایم اے کیا۔ 1970 میں ڈاکٹر محمد صدیق کی نگرانی میں 'درویش حسین والہ ہروی کی حیات و خدمات' پر وقیع تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد 'حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی کی شخصیت اور علمی کارناموں' پر تحقیقی مقالہ لکھا، جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے 1977 میں ان کو فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔

1900 میں یو جی سی کے ذریعہ ایک پروجیکٹ بہ عنوان 'ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستانی سماج اور ثقافت کی جھلک' کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کی غرض سے انگلستان کا سفر بھی کیا۔ 1994 میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی دعوت پر ایک ماہ کے ریفریشر کورس میں شرکت کے لیے ایران گئے۔ وہاں انھوں نے علمی، ادبی اور مذہبی مقامات کی سیر و سیاحت کی اور وہاں کے تاریخی آثار کا بھی قریب سے مشاہدہ کیا۔ 'مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران' ان کے اسی سفر کی یادگار ہے۔

ویسے تو ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بہار کو آپریٹو سوسائٹی میں بحیثیت انسپکٹر ہوا، لیکن چونکہ یہ ان کا عملی میدان نہیں تھا اس لیے بہت جلد اس سے کنارہ کش ہوکر درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ 1960 میں سہرسہ کالج سہرسہ میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ اس کے بعد ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگل پور چلے گئے جہاں 1982 تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1982 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور کے شعبہ فارسی میں بحیثیت ریڈر منتخب ہوئے اور مجموعی طور پر تقریباً 37 سال تدریسی خدمات کی انجام دہی کے بعد دسمبر 1997 میں بحیثیت پروفیسر سبک دوش ہوئے۔

علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو 15 اگست 2001 کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازے جانے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ 6 فروری 2002 کو صدر جمہوریہ کے۔ آر۔ نارائن کے مبارک ہاتھوں سے ان کو ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں سے بعض کتابیں ان کے گہرے تحقیقی و تنقیدی شعور پر دال ہیں۔ ان کے متعدد مضامین قومی اور بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

انھیں تصحیح و تدوین سے ذہنی مناسبت تھی۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم کارنامہ شیخ حسین شہرت شیرازی کے دیوان کی تصحیح و تدوین ہے جو 2010 میں ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے مطالعے سے ان کی تحقیقی و تدوینی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا انتقال 20 ستمبر 2018 کو پٹنہ میں 80 سال کی عمر میں ہوا۔

ان کی کتابوں کی فہرست مع جائے اشاعت و سال اشاعت پیش کی جارہی ہے تاکہ ان پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے معاون ثابت ہو:

1. حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی: احوال و آثار، مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1997
2. دیوان اشعار حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی، ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی، 2010
3. سید قاسم حاجی پوری: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مع غزلیات قاسم، مطبوعہ دی آرٹ پریس، پٹنہ 1977
4. عبدالقیوم انصاری، مطبوعہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ 2006
5. فخر ملک عبدالقیوم انصاری: احوال و افکار، مطبوعہ عبدالقیوم انصاری ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، 2002
6. فرہنگ فارسی جدید با معانی اردو، مطبوعہ بھاگل پور، 1981
7. گنجینۂ ادب المعروف (بہ) مقالات مجتبیٰ، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز احمد، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ 2010
8. مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران ہمراہ با ہشت مقالہ، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ 2012
9. مولانا محمد نصیر الدین: احوال و آثار، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ 2013

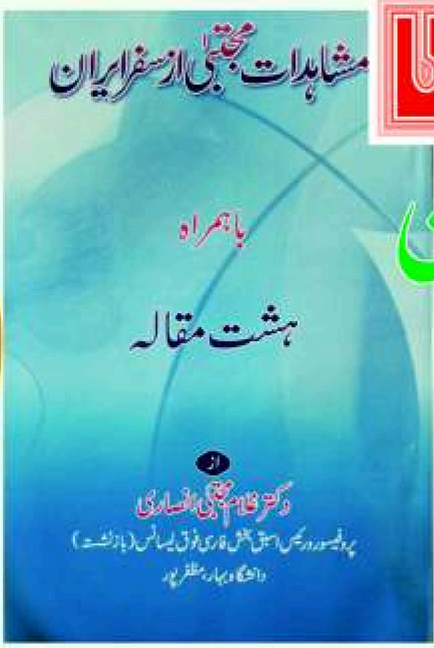


مجتبیٰ انصاری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بہترین استاد ہونے کے ساتھ ادیب، محقق، ناقد اور شاعر بھی تھے۔ ایک بہترین استاد کی حیثیت سے ان کی شناخت مسلّم ہے، لیکن انھوں نے گاہے بہ گاہے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ اس کی عمدہ مثال ان کا منظوم فارسی سفرنامہ ہے۔ ان کا منظوم ادبی سرمایہ اگرچہ کمیت میں کم ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔ موصوف نے اپنی فکری صلاحیتوں کے اظہار کا وسیلہ اردو اور فارسی دونوں کو بنایا لیکن ان کا بیشتر منظوم ادبی سرمایہ ضائع ہوگیا جس میں بڑی حد تک ان کی سادہ لوحی اور بے نیازی کا عمل دخل رہا ہے۔

موصوف کا سفر ایران 20 مارچ 1994 کو شروع ہوا۔ انھوں نے اس سفر کا آغاز دہلی سے کیا۔ دہلی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بمبئی گئے اور وہاں سے 'ہما' نامی جہاز پر سوار ہوکر تہران کے ہوائی اڈے مہرآباد پہنچے۔ ان کا قافلہ ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ جب یہ قافلہ ایران کے مہرآباد ہوائی اڈے پر پہنچا تو اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ قافلے کو باشگاہ فرہنگیان میں ٹھہرایا گیا اور اس کی رہنمائی کے لیے جناب گیلانی نژاد مقرر کیے گئے۔

مجتبیٰ انصاری نے اپنے اس سفر کی یادداشتوں کو منظوم سفرنامے کی شکل دی اور فارسی میں لکھے گئے اپنے دوسرے تحقیقی وتنقیدی مقالات کے ساتھ 2012 میں 'مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران ہمراہ با ہشت مقالہ' کے نام سے شائع کیا۔ مقالات سے قطع نظر ان کے منظوم سفرنامے کے حوالے سے چند معروضات پیش کی جارہی ہیں جو تقریباً تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس سفرنامے کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے جو بالترتیب یہ ہیں: مناجات، نعت حضرت محمد مصطفیٰ (ص)، مدح امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ، ولہ، از ہند تا ایران، باشگاہ فرہنگیان، دیدار از قم، دیدار از مرقد عبدالعظیم، رفتن بہ سعد آباد و دیدن قصرہای شاہی، سیاحت مشہد، خانم ہای ایران، شہر تہرانست مثل نوعروس، خطاب بہ آقای گیلانی نژاد، بہ نام آقای سید مجتبیٰ موسوی، تہنیت بہ جناب آقای دکتر سید جعفر شہیدی بہ اہدای دکترای افتخاری من جانب دانش گاہ پکن، گل ہای عقیدت۔

چونکہ مجتبیٰ انصاری کی نشو ونما علمی وادبی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے ان کا ذہنی میلان شروع سے ہی شعر و ادب کی طرف تھا۔ کلاسیکی فارسی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے قدما کے دواوین وکلیات کا مطالعہ کیا تھا خصوصاً ہندوستانی فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے، نیز جدید افکار ونظریات اور اسلوبیات ولفظیات سے بھی باخبر تھے۔ 'مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران' اس کی جیتی جاگتی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ دیکھیے اس کا آغاز کس انداز سے کرتے ہیں۔

خدایا! ببخشا گنہ گار را — نگاہ کرم کن خطا کار را
بسی شرمسارم بہ درگاہ تو — کہ راہی ندارم بہ جز راہ تو
اگر تو نبخشی تبہ می شوم — بہ قعر مذلت تبہ می شوم
بسی ظلم کردم بہ نفس خودم — نبخشی اگر رو سیہ می شوم

(ترجمہ: (1) اے خدا! تو اس گنہگار کو بخش دے، اس خطا کار پر نظر عنایت کردے۔ (2) تیری بارگاہ میں بہت شرمندہ ہوں کیوں کہ تیرے سوا تمام راستے مسدود ہیں۔ (3) اگر تو مجھے معاف نہ کرے تو تباہ و برباد ہوجاؤں گا، ذلت کے کنویں میں [اوندھے منھ گر کر] ہلاک ہوجاؤں گا۔ (4) میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے، اگر تو معاف نہ کرے تو میں گنہگار ہی رہ جاؤں گا۔)

مناجات کے یہ اشعار ان کے ذہنی وفکری رویے کا پتا دیتے ہیں۔ ایک ایک شعر میں جس حوصلے، جذبے، دین داری اور دنیا بیزاری کا اظہار ہوا ہے اس سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ مناجات کے اشعار ہیں جن میں خوف خدا کا بیان کھل کر ہوا ہے اور یہی گھبرائے ہوئے دلوں کے چین وسکون اور اطمینان کا ساز و سامان بھی ہے۔ ہم اسے محض ان کا تفکر وتخیل قرار دیں یا ان کے رگ وریشے میں پیوست خوف خدا اور دینی غیرت وحمیت۔ ظاہری بات ہے کہ یہ مکتب کی کرامت ہی ہے جس نے یہ ابراہیمی جذبہ ان کے سینے میں ڈال دیا۔

موصوف کو طبیعت کی موزونی قدرت نے ودیعت کی تھی، لیکن انھوں نے اس کی مشق وممارست جاری نہیں رکھی جس کی وجہ سے کہیں کہیں ان کی شاعری پھیکی پڑگئی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری معاصر ہندوستانی فارسی شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ دور اخیر کے ہندوستانی فارسی شعرا عبدالقادر بیدل، مرزا غالب اور علامہ اقبال کا تتبع کرتے ہیں۔

گیلانی نژاد ہر سفر میں مجتبیٰ انصاری کے ساتھ ساتھ رہے اور ان سے اتنا شیر وشکر ہوگئے کہ انھیں اپنے گھر کا ایک فرد تصور کرتے تھے۔ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور ان کے ہر حکم کی تعمیل میں لگے رہتے تھے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان غیر ایرانی مہمانوں کی خاطر خواہ مہمان نوازی نہ کرسکیں۔ لیکن یہ خلوص ومحبت یک طرفہ نہیں تھا بلکہ مجتبیٰ انصاری بھی گیلانی نژاد کے اخلاق وکردار اور ان کے جذبۂ ایثار سے حد درجہ متاثر تھے۔ چنانچہ ان کی رہنمائی کی قدردانی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فکر او بودہ تمامی مشتمل بر این مراد
تا بیاموزیم درس و ہم زبان گیریم یاد

(ترجمہ: ان کی پوری توجہ اس مقصد پر مرکوز تھی کہ ہم تربیت حاصل کریں اور فارسی سیکھ لیں۔)

ہندوستانیوں کو کسی طرح کی بھی قید و بند میں رہنا قطعاً پسند نہیں ہے۔ جب وہ ایران میں فارسی کے اس تربیتی کورس کے لیے گئے تو ان پر دروس کے نظام الاوقات لاد دیے گئے۔ آزاد فضا میں سانس لینے والے افراد کو قید و بند میں رہنا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں ان کے روسی دوست بھی کچھ کم نہ تھے کیوں کہ انھوں نے ہندوستانیوں سے قبل ہی آزادی کا سویرا دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے بعض دوستوں نے ان سے شکایت کی کہ ہم خود استاد ہیں اور یہاں شاگردوں کی طرح ہم کو ٹریٹ کیا جارہا ہے۔ ہم کو یہ پابندی دروس کیوں کر برداشت ہوسکتی ہے۔

دوستان گفتند سختی ہای پابند دروس
کی روا باشد برای ہندیان و اہل روس

(ترجمہ: دوستوں نے کہا کہ دروس کی یہ پابندی ہم ہندوستانیوں اور روسیوں کے لیے کیوں کر قابل برداشت ہوسکتی ہے۔)

تو انھوں نے اپنے دوستوں کو ماضی کے جھروکے میں جھانک کر دیکھنے کو کہا کہ ہم مشرقی روایات کے پاسدار وامین ہیں۔ ہم استاد کی اُس ضرب وکوب کو اپنے لیے ننگ وعار نہیں سمجھتے جو ادب سکھانے کے لیے ہو۔

سیلی استاد می باشد برای بہتری
نی برای دشمنی یا بہر کینہ پروری

(ترجمہ: استاد کا طمانچہ شاگرد کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے، دشمنی یا کینہ پروری کی وجہ سے نہیں۔)

باشگاہ فرہنگیان کی لطافت، وہاں کے خوشنما مناظر اور عیش وعشرت کے ساز وسامان نیز عمارت کے حسن وفن کاری سے بہت متاثر تھے۔ اس جنت نظیر باشگاہ کے اندرونی مناظر کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

باشگاہ خوشنما در قلب آن تہران شہر
در تمامی راحت و آرام جان عنوان دہر
ہر کہ می آید ز خارج اندرون باشگاہ
جملۂ سامان عشرت در ہمی یابد بگاہ
ہر اتاق باشگہ آراستہ مثل نگار
در نظافت بی مثال و در لطافت چون بہار
اندرون ہر اتاقی رختخواب خوب و نرم
مستراح سنگ مرمر، ہست ہم حمام گرم

(ترجمہ: (1) شہر تہران کے مرکز میں ایک خوبصورت، روح پرور اور راحت بخش باشگاہ ہے جو مشہور زمانہ ہے۔ (2) بیرونی ممالک سے جب کوئی شخص باشگاہ میں آتا ہے تو اسے عیش وعشرت کے تمام ساز وسامان یکجا میسر آتے ہیں۔ (3) باشگاہ کے تمام کمرے معشوق کی طرح آراستہ ہیں، صفائی ستھرائی میں بے مثال اور لطافت میں بہار کی مانند ہیں۔ (4) ہر کمرے میں خوبصورت نرم بستر اور آرام کے لیے سنگ مرمر کی آرام گاہ اور گرم حمام ہے۔)

جب کوئی بھی سیاح کسی بستی سے گزرتا ہے تو وہ چشم دید واقعات کا واحد گواہ بن جاتا ہے۔ جب مجتبیٰ انصاری سعد آباد گئے اور وہاں کے کھنڈرات کا مشاہدہ کیا تو ان کی دوررس نگاہیں تاریخ کے اوراق پارینہ میں گم ہوگئیں اور انھوں نے انھیں اوراق سے شاہ کی شان وشوکت اور اس

کی قدرت کا اندازہ لگایا۔ لیکن بہت جلد ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سرائے فانی کو ثبات نہیں ہے۔ یہاں جو بھی آیا ہے اس کو ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ کاش یہ افراد اس حقیقت سے آگاہ ہوتے تو اتنے غرور و تکبر کا شکار نہ ہوتے۔ یہاں انھوں نے کسی ایک فرد کی بات نہیں کی ہے بلکہ درس عبرت کے طور پر دنیا کے تمام مکینوں کو اس جانب متوجہ کیا ہے کہ دنیا کی سرشت میں وفاداری نہیں ہے۔ اس لیے دنیاوی ساز و سامان کی فراہمی اور اس کی آسائش و آرائش میں گم ہو جانا سراسر دھوکا ہے بلکہ آخرت کا خیال بھی ہر آن ہونا چاہیے۔ کبھی بھی اپنی قدرت کا استعمال ظلم و جبر و تشدد کے لیے نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ یہ چیزیں خود بخود انسان کو غیر شعوری طور پر قعر مذلت میں ڈھکیل دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

کاخ ہای شاہ دیدم یاس و حسرت داشتہ
یاد کردم روزہا چون شاہ قدرت داشتہ
بی وفایی در نہاد ماست از روز ازل
کاش آن شہ آگہی از این حقیقت داشتہ

(ترجمہ:(1) بادشاہ کے محلات دیکھے جو یاس و حسرت میں ڈوبے ہوئے تھے تو میں نے ان دنوں کی یاد تازہ کی جب بادشاہ صاحب اقتدار تھا۔ (2) ہماری سرشت میں بے وفائی روز ازل سے ہی ڈال دی گئی ہے، کاش وہ بادشاہ اس حقیقت سے واقف ہوتا۔)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مجتبیٰ انصاری کی اپنی ذاتی ترجیحات ہیں۔ انھوں نے آزادانہ طور پر سماجی ومعاشرتی مسائل کو اپنے اظہار کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مناسب و موزوں اسلوب اور تخلیقی وسائل سے بھی کام لیا ہے۔ جب انھوں نے نیشاپور کا دورہ کیا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے وطن میں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی، خلوص، محبت، دوستی اور ایثار کو دیکھا تو رطب اللسان ہوئے۔

اہل نیشاپور را دیدیم بس مہمان نواز
نیک طینت نیک سیرت با مدارا دلنواز

(ترجمہ: اہل نیشاپور کو دیکھا کہ بہت مہمان نواز ہیں۔ اچھی فطرت والے، نیک کردار، مہربان اور مونس و غم خوار ہیں۔)

سماج کی تعمیر و ترقی میں طبقۂ نسواں کا اہم کردار رہا ہے۔ جس سماج کی عورتیں تعلیم یافتہ اور بلند فکر ہوں اس کی اڑان اوج ثریا تک ہوتی ہے۔ عورت کی کئی حیثیتیں ہیں، بیٹی، بہن، بیوی، بہو، ماں، ساس، دادی، نانی وغیرہ۔ وہ زندگی کے ہر پڑاؤ میں مردوں کی یار و مددگار رہی ہے۔ ایرانی عورتیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ شاعر کے بقول وہ شرم و حیا کا پیکر ہونے کے ساتھ شریعت کی پابند بھی ہیں۔ عفت اور پاکیزگی ان کے چہرے سے عیاں ہے، ساتھ ہی نرم رفتار وشیریں گفتار بھی ہیں۔ جب وہ لب کشا ہوتی ہیں تو آہنگی سے مخاطب کے دلوں کو جیت لیتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دختران از زیور شرم و حیا آراستہ
طرز شان نحوی کہ مذہب از زنان درخواستہ
روی شان از چادر مشکی ہویدا ہر کجا
ماہ کامل بود گویی درمیان ابرہا
عزت و پاکیزگی بودہ عیان از روی شان
اندرون چادر مشکی نہفتہ موی شان
چون کنم توصیف از اوصاف خانم گوہری
قدر گوہر شاہ داند یا بداند گوہری
نرم خوی و نرم گوی و نرم رو دلسوزتر
بہرہ ور از علم و دانش فارسی آموز تر

(ترجمہ:(1) بیٹیاں زیور علم و حیا سے آراستہ ہیں، بالکل اسی طرح جیسے اسلام نے عورتوں کو حکم دیا ہے۔ (2) ان کے چہرے کالی چادر کے اندر سے اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے بدلیوں کے درمیان ماہ کامل۔ (3) ان کے چہرے سے عزت و پاکیزگی ظاہر تھی۔ ان کے بال کالی چادر سے ڈھکے ہوئے تھے۔ (4) خانم گوہری کے اوصاف کیسے بیان کروں۔ گوہر کی قیمت یا تو بادشاہ جانتا ہے یا جوہری۔ (5) نرم خصلت، نرم گفتار، نرم رفتار، مہربان، علم و دانش سے مزین اور میٹھی فارسی بولنے والی۔)

اس سفرنامے میں قومی جذبات و احساسات کی طرف اشارے بھی موجود ہیں۔ شہر تہران کے خوشنما مناظر، شاہراہوں، لوگوں کے رہن سہن، طور طریقے، اخلاق و عادات اور بات چیت کے انداز کو خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قادر الکلامی کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔

شہر تہران است مثل نوعروس     خواستارش مردمان ہند و روس
مردمان شہر خیلی نرم دل     خوش جمال و خوش خصال و گرم دل
فارسی اہل تہران خوب تر     با لب و لہجہ بسی مرغوب تر
احقر ہندی بگوید برملا     شہر تہران است جان شہرہا

(ترجمہ:(1) شہر تہران نئی نویلی دلہن کی مانند ہے جس کے دیدار کے متمنی اہل ہند و روس ہیں۔ (2) شہر کے افراد بہت نرم دل، خوب صورت، خوب سیرت اور مہربان ہیں۔ (3) اہل تہران کی فارسی دوسروں کی بہ نسبت بہتر ہے، لب و لہجے کے اعتبار سے بھی شیریں تر ہے۔ (4) احقر ہندی علی الاعلان کہتا ہے کہ شہر تہران تمام شہروں کی جان ہے۔)

تہران سے محبت کا یہ جذبہ اشعار سے ہوتے ہوئے ان کے دل میں گھر کر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تہران کو نوعروس (نئی نویلی دلہن) کہا ہے۔ ایران کی عظمت کو نمایاں کرنے میں تہران اور اصفہان کی عظمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ وہاں کے جھرنوں، پرندوں اور پہاڑوں سے حظ اور کیف اٹھانا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ان کے سفرنامے میں وہ تمام فطری مناظر اپنی تمام تر حسن و خوبی کے ساتھ جلوہ گر ہیں جن کو پڑھتے ہوئے فطرت سے ہم آغوش ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں تہران کی شاہراہوں پر صف باندھے ہوئے چنار کے درختوں کا ایک حسین سماں پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے اور سلامی دینے کے لیے صف بستہ کھڑے ہوں۔

رفتم بہ خیابان دیار تہران
دیدم دو طرف بستہ چناری صف ہا
گفتم کہ چرا صف زدہ ہستید این جا
گفتا خوش آمدید و زدہ بس کف ہا

(ترجمہ:(1) میں شہر تہران کی شاہراہ پر گیا تو دیکھا کہ دونوں طرف چنار کے درخت صف باندھے کھڑے ہیں۔ (2) میں نے ان سے کہا کہ یہاں کیوں صف باندھے کھڑے ہو؟ تو انھوں نے خوش آمدید کہا اور تالیاں بجائیں۔)

اس منظوم سفرنامے میں سلاست و روانی کے ساتھ قدیم و جدید طرز کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایات کا تتبع کیا لیکن قدیم مضامین کو جدید لب و لہجے اور جدید اسلوب کا پیراہن بھی عطا کیا ہے۔

مجتبیٰ انصاری نے بعض مقامات پر مقامی الفاظ بھی دھڑلے سے استعمال کیے ہیں جو اب فارسی میں رائج نہیں ہیں، لیکن یہ ہمارے مشترکہ کلچر، زبان اور تہذیب کا پتا دیتے ہیں۔ ہاں اس بات سے چشم پوشی بھی ممکن نہیں ہے کہ بعض اشعار تعقید کا شکار نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے مفہوم اور مافی الضمیر کی ادائیگی صحت و سہولت کے ساتھ نہیں ہو سکی ہے۔ مضمون اور صورت خیال تو ان کے ذہن میں واضح ہے لیکن ان کو مناسب الفاظ اور پیرایۂ اظہار میسر نہ ہو سکا جس کی وجہ سے وہ معروضیت اور صداقت کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو لفظوں کا لباس عطا کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر ان کی نظر فنی رموز و نکات پر مضبوط نہیں رہتی۔ اس کے باوصف ان کا یہ منظوم سفرنامہ ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔

■

**Dr. Faizan Haider**
Editor Quarterly Faizan-e-Adab
Purana Pura, Pura Maroof,
Kurthijafarpur, Mau, U. P. - 275305,
Mob.:7388886628,
E-mail: faizanhaider40@gmail.com

عزیز احمد خان

# فراق گورکھپوری کی خطوط نگاری

فراق گورکھپوری کا نام علم وادب کے ان اکابر میں شامل ہے، جن کے خطوط سے ہم ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہوسکتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے خطوط کا ایک مجموعہ پاکستان میں رسالہ 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل نے 'من آنم' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ فراق نے اپنے احباب کو خاصی تعداد میں خط لکھے ہوں گے لیکن 'من آنم' میں محمد طفیل نے ان کے چند منتخب خطوط شائع کیے ہیں اور ہم انھیں کے وسیلے سے فراق کی مکتوب نگاری کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ان خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ فراق نے یہ سب خطوط محمد طفیل کے نام ہی لکھے ہیں۔ بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ محمد طفیل نے فراق سے لکھوائے ہیں۔ جیسا کہ محمد طفیل نے خود لکھا ہے:

''میں نے کئی بار سوچا کہ اس کتاب کا خالق کون ہے میں یا فراق؟ یہ بات میرے ذہن میں اس لیے آتی ہے کہ یہ خط فراق صاحب نے لکھا نہیں۔ میں نے لکھوائے ہیں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص نمبر 3، طابع، شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی، سنہ اشاعت 1997)

فراق گورکھپوری کے خطوط کا یہ واحد مجموعہ ہے۔ اس میں شامل خطوط سے ادب کے مختلف پہلوؤں پر فراق کے خیالات کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی زندگی بالخصوص ازدواجی زندگی اور جنس کے بارے میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ محمد طفیل کے مطابق کچھ خطوط میں تو وہ اتنے کھلے ہیں کہ کھل کر ہی رہ گئے ہیں۔ 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل نے جہاں اعلیٰ وضخیم نمبروں کا سلسلہ شروع کیا وہیں 'صاحب'، 'جناب' وغیرہ اہم تصانیف کے ذریعہ اردو کی اہم شخصیتوں سے ہمیں ملانے، ان کی خوبیوں اور خامیوں سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی فراق سے خط وکتابت کی ہے۔ فراق سے خط وکتابت کے ذریعہ ان کی زندگی کے حالات واقعات اور راز ہائے سربستہ سے واقف ہونے، ان کے جذبات واحساسات وخیالات سے آگاہ ہونے کی پوری کوشش کی۔ فراق نے بھی تشفی بخش جواب تفصیل کے ساتھ دیے اور اپنے بارے میں انہوں نے وہ سب کچھ بتایا جس کی امید عام طور سے عام لوگوں سے نہیں کی جاسکتی۔

فراق سے اس طرح کی خط وکتابت کا مقصد یہ تھا کہ ان خطوط کے ذریعہ فراق کی زندگی کے پوشیدہ لمحات اور بکھرے اوراق کو یکجا کردیا جائے تاکہ فراق شناسی میں مدد مل سکے۔ فراق نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ محمد طفیل خطوط بھی شائع کرسکتے ہیں اس لیے مطمئن ہوکر خطوط کے جواب دیتے گئے۔ جس کے نتیجے میں وہ کہیں کہیں اتنے بے باک ہوئے کہ وہ 'بے راہ روی' کے حدود میں بھی داخل ہوگئے۔ حالانکہ ان کے خلوص اور سچائی نے ان کی بے راہ رویوں کو قابل قدر بنادیا ہے۔ جب خطوط کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی اور قیمتی مواد یکجا ہوگیا تو مدیر نقوش، محمد

طفیل نے سوچا، کیوں نہ حالات زندگی مرتب کرنے کے بجائے ان خطوط کو ہی شائع کر دیا جائے۔ انھوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے اس ارادہ کا اظہار فراق گورکھپوری سے کسی خط میں کر دیا جس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا:

''پہلے تو آپ کا خیال تھا کہ میرے جوابات کی روشنی میں مجھ پر لکھیں گے اب آپ کا یہ کہنا کہ اگر اجازت ہو تو ان خطوط کو ہو بہو چھاپ دوں، میری طرف سے تو ان کی اشاعت کی اجازت ہے، اس دریافت کا بھی شکریہ کہ ان خطوط میں تاریخی مواد ہے اور انھیں حرف بہ حرف چھپنا چاہیے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دو ایک بار آپ نے لکھا تھا کہ میں نے بعض جگہوں پر بڑی روا روی میں لکھا ہے بس ان باتوں کا خیال رکھ لیجیے۔ لیکن یہ مت کیجیے گا کہ آپ مجھے انسان بھی نہ بننے دیں۔ میری کمزوریوں کا بھی اظہار ہونا ہی چاہیے۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا کہ آپ میرے ہی خط چھاپیں گے، تو میں صرف اپنی کمزوریاں ہی کمزوریاں بیان کرتا اس لیے کہ لوگ صرف اپنی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 107-106)

ایک خط میں انھوں نے مزید لکھا:

''یہ طعنہ مجھے نہ دیجیے کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ میں جیسا کچھ ہوں اسی طرح آپ کے اور سب کے روبرو آنا چاہتا ہوں۔ البتہ اتنی درخواست آپ سے کروں گا کہ میرے ان خیالات کو اپنے تک محدود رکھیے گا اور ان کا بقدر ضرورت خرچ ہو۔ معاف کرنا میں نے یہاں ایک بڑا بیہودہ فقرہ لکھ دیا ہے، اگر میرے آئینے میں میری ہی شکل نظر آتی ہے تو اس سے ڈرنا کیسا میں نے کوئی پیغمبری یا اوتاری کا دعویٰ کیا ہو تو لوگوں سے خطرہ، میں تو شاعر ہوں، بلکہ انسان ہوں، اس لیے میں شاعری بھی کروں گا اور اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دوں گا۔'' (فراق گورکھپوری، من آنم، ص 66-65)

فراق کے ان خطوط سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو عوام کے سامنے لانے میں کوئی تردد نہیں کرتے۔ اس سے ان کی عظمت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے لیکن محمد طفیل، فراق گورکھپوری کی جرأت کا ساتھ نہ دے سکے اور حالات کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے سارے خطوط ایک ساتھ شائع نہیں کیے بلکہ یہ لکھتے ہوئے انھیں الگ کر دیا:

''ان کے کچھ خط ابھی میں نے پیش نہیں کیے۔ اس لیے کہ ان میں یہ کچھ زیادہ ہی مخلص اور کچھ زیادہ ہی سچے ہو گئے ہیں۔ چونکہ زیادہ مخلص انسان اپنی تمام تر ہوش مندی کے باوجود پاگل اور اپنی تمام تر شرافت کے باوجود بدتمیز کہلاتا ہے۔ اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے اس پیارے دوست کو ان 'خرابیوں' سے بچا لے جاؤں۔ اس کے باوجود فراق، ان خطوط میں ہر طرح سے اور ہر رنگ میں سامنے آئے ہیں۔ یہی فراق کی وہ خوبی ہے جس پر مصلحت آمیز شرافت کے سارے غلاف نثار کیے جا سکتے ہیں۔'' (فراق گورکھپوری، من آنم ص 4)

چنانچہ محمد طفیل نے ان خطوط میں سے 19 خط اور اس کے ساتھ ایک مضمون جو کہ 'اسلامی ادب' کے نام سے نقوش میں شائع ہوا تھا، اور اس کے بعد ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی، کا انتخاب کر کے شائع کر دیا۔ ان خطوط میں فراق نے اپنی زندگی اور اس کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ان کی شخصیت مختلف پرتوں میں سے کبھی نمایاں کبھی دھندھلاہٹ کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

'من آنم' میں ابتداء میں جو خط ہیں ان میں فراق نے زیادہ تر اپنی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے، کہیں اپنے خیالات کا تجزیہ کیا ہے، کہیں جنسیت نگاری کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعد کے خطوط میں 'اسلامی ادب' پر اظہار خیال کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ شروع میں محمد طفیل کا مقصد تھا کہ فراق کے خطوط کے آئینے میں ان کی شخصیت پر مضمون لکھیں گے۔ لہٰذا انھوں نے فراق کی زندگی کے ان بہت سے پہلوؤں تک رسائی حاصل کر لی جو اب تک مخفی تھے۔ فراق بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ ہیں، اسی طرح سب کے روبرو آئیں۔ اپنے بچپن اور جوانی کا حال انھوں نے پہلے خط میں بہت تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے:

''بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظر قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کرتے تھے، اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے، میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔''

فراق گورکھپوری اپنی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اندازاً 18 برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت شکل وہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گزری جوان لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی ان پڑھ انسانوں سے میری بیوی میں کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شراف کی ہو قدریں مان چکا تھا ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔'' (فراق گورکھپوری، من آنم، ص 13-12)

فراق گورکھپوری شادی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ قرار دیتے ہیں اور انھیں کی زبان میں شادی نے ان کی زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ ایسے حالات میں جب انھوں نے شاعری شروع کی تو ان کی کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامی اور غم کو مندمل کرنے کے لیے اشعار کے ذریعہ مرہم تیار کریں بقول فراق گورکھپوری:

''میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 14-13)

اس طرح فراق نے اپنے پہلے خط میں اپنی زندگی کے حالات کو محور بنایا ہے۔ لیکن ان کی جس کمی کو بیشتر ناقدوں نے نشانہ بنایا ہے وہ پہلے ہی خط میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کلام کے بارے میں لکھنے کے ساتھ اپنے آپ کو شاعر نیم شبی کہلوانا چاہتے ہیں:

''رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہیں، وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعر نیم شبی کہا جا سکتا ہے۔'' (فراق گورکھپوری، من آنم، ص 14)

اپنی کمی کا اعتراف کرتے ہوئے اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''شاعر ہر وقت داد کا محتاج ہے، اور مجھے تو میرے فن نے باقی شعرا سے زیادہ ہی بھوکا بنا دیا ہے''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 16)

فراق گورکھپوری کے خطوط سے اگر کوئی ان کی زندگی

کے واقعات یکجا کرنا چاہے تو یقیناً یہ خطوط ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ ان خطوط میں فراق نے اپنی آپ بیتی بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے بیان کی ہے۔ ایک دوسرے خط میں اپنے لڑکپن کی چند خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لڑکپن ہی سے حسن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفتیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ قدروں، نیکی، خلوص، ہمدردی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی عظمت پرستی اور بعد کو اشتراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس یہ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 25)

18 سال کی عمر میں فراق کی شادی نے ان کی زندگی کو غم ناک بنادیا اور مغلوب الغضب بھی۔ فراق نے اپنے کردار کے منفی رجحانات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان پر روشنی ڈالی ہے۔ جوان کی سیرت اور نفسیات کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے ایک خط میں فراق لکھتے ہیں:

''بچپن ہی سے میں ایک مغلوب الغضب شخصیت و کردار کا اپنے آپ کو حامل پاتا رہا ہوں۔ بچپن ہی سے خاص موقعوں پر میرے اندر غصے کا جوالا مکھی پھوٹ جایا کرتا تھا۔ میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپ کو پاتا ہوں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 52)

فراق ان خطوط میں اپنی شخصیت کو لوگوں کو اسی طرح سمجھانا چاہتے ہیں جیسا وہ سمجھتے ہیں اور اپنی تمام تخلیقات کا اندازہ بھی اس طرح کرانا چاہتے ہیں جیسا کہ وہ خود کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے خطوط کے ذریعہ آئیڈیل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ عقیل رضوی فراق کی انھی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ خطوط، قاری کو فراق کی صحیح تفہیم سے روکتے ہیں۔ بہ حیثیت ایک انسان کے بھی اور ایک شاعر یا ادیب کے ناتے بھی، اپنے عشق اور ادراک حسن کو جس طرح فراق صاحب نے ان خطوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ بہت کچھ آئیڈیل ہے، حقیقی نہیں۔ اس طرح ان خطوں سے جو تصویر فراق صاحب کی بنتی ہے، وہ محض اکتسابی اور اک رخی ہے۔ ہر خط میں جو جا بجا انھوں نے اپنی بیماری، اپنی بیوی کی بدصورتی کا ذکر کیا ہے اور اس سے اپنی بدبختی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی آئیڈیل بننے کی کوشش ہے۔''

(فراق گورکھپوری فن اور شخصیت مرتبین علی احمد فاطمی، رفیع اللہ انصاری ص 44)

**بچپن ہی سے میں ایک مغلوب الغضب شخصیت و کردار کا اپنے آپ کو حامل پاتا رہا ہوں۔ بچپن ہی سے خاص موقعوں پر میرے اندر غصے کا جوالا مکھی پھوٹ جایا کرتا تھا میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپ کو پاتا ہوں۔**

عقیل رضوی نے فراق کے خطوط کی اس کوتاہی کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے لیکن وہ فراق کے خطوط کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ فراق کے خطوط کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال فراق صاحب کے خطوط، اس لحاظ سے اہم ضرور ہیں کہ وہ ان کی ایسی شخصیت کو پیش کرتے ہیں، جیسا کہ فراق صاحب خود کو سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان خطوں میں ادبی مباحث اور نکات و رموز ادب کا ایک ایسا خزانہ چھپا ہوا ہے جس پر کبھی کبھی ارسطو کی بوطیقا اور افلاطون کی فیدروس (Phaedros) کی پرچھائیاں گزرتی نظر آتی ہیں۔''

(فراق گورکھپوری فن اور شخصیت مرتبین علی احمد فاطمی، رفیع اللہ انصاری صفحہ 45)

فراق کے خطوط میں ان کے حالات زندگی، واقعات اور تجربات کے ساتھ ساتھ ان کے ادب، زندگی اور معاشرے سے متعلق افکار و خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ فراق نے ساری زندگی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے متعلق غور خوض کیا اور اپنے نظریات و خیالات قائم کیے اور پھر اعتماد و یقین کے ساتھ ان کا اظہار کیا۔ فراق نے ان خطوط میں فلسفیانہ مباحث اور ادبی نکات کو اس طرح سمو دیا ہے کہ قاری نہ صرف ان سے مستفید ہوتا ہے بلکہ اسے فراق کے تصور فن کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ فراق اپنے ایک خط میں شاعری کے مقصد اور اپنے شعری محرکات کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں کہ زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا ایک سچا جمالیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک وجدانی شعور حاصل کرنا، وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دکھ سکھ دونوں نامکمل رہتے ہیں۔ یہ احساس میرے محرکات شعری رہے ہیں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 18)

ابتدائی شاعری میں فراق سیاسی، سماجی یا وطنی موضوعات سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ شاعری میں حسن و عشق کے ہی جادو جگاتے رہیں اور جنسیت کو کمزور کیے بغیر اس کو زیادہ سے زیادہ رچا سکیں۔ فراق اپنے خطوط میں اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ وہ مغربی ادب خصوصاً ورڈ سورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور فارسی ادب سے متاثر ہوتے رہے اور ان کی شاعری اردو ادب کے مقابلے غیر اردو ادب سے زیادہ متاثر رہی۔

فراق گورکھپوری اپنے ایک خط میں اپنی دو نظموں 'آدھی رات' اور 'پرچھائیاں' کی تعریف کرتے ہیں اور اسی طرح کی مزید نظمیں لکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ اردو نظم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو کی نظمیں بھی غزلیت زدہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو نظموں کو نکھارنے کی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے بڑی ترکیب سے اپنا رشتہ بڑے شعرا کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ ورڈ سورتھ، کیٹس، شیلے، کولرج، ٹینی سن، میتھیو آرنلڈ، سون برن وغیرہ شعراء کے اسلوب اور تکنیک میں جو خلاقانہ صلاحیتیں ملتی ہیں اور گھلاوٹ اور نغمگی کے ساتھ جو سنجیدگی ملتی ہے اس نمونے کی کچھ نظمیں کہہ سکوں، کچھ ایسی نظمیں کہہ بھی چکا ہوں۔''

(فراق گورکھپوری، من آنم، ص 40)

فراق گورکھپوری 12 ستمبر 1953 جو کہ 'من آنم' کا ساتواں خط ہے، میں اپنی نثر نگاری اور نظم نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو ادیبوں میں بہت کم ایسے کر سکے ہیں کہ ادب کے کئی اصناف کو اپنا سکے ہوں جب کہ میں اپنی ادبی تخلیق میں بہت سارے اصناف سخن کو پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ فراق اپنی کتاب، انداز نے کو تاثراتی تنقید (Impressionistic Criticism) کا پہلا مجموعہ گردانتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس بات پر نالاں نظر آتے ہیں کہ لوگوں کی توجہ میرے تمام مساعی پر نہ ہو کر صرف عشقیہ غزل یا جمالیاتی رباعیوں تک محدود رہتی ہے۔ اس کے بعد فراق نے رباعی، نظموں میں تلاش حیات، دھرتی کی کروٹ، آدھی رات، ترانہ خزاں، عشق اور موت، رقص شب تار، اکبر الہ آبادی، ڈالر دیس اور شاہنامہ آدم سے مثالیں پیش کی ہیں۔

فراق نے اس خط میں لکھا ہے کہ اردو نظم کے مشاہر نظیر اکبر آبادی، سودا، انیس، اکبر الہ آبادی، چکبست، درگا سہائے سرور، اقبال، حفیظ جالندھری، حالی، اختر شیرانی کی سنجیدہ مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگا رنگی نہیں ملتی۔

فراق گورکھپوری اپنی فن کاری کو اپنے معاصرین

میں سب سے بلند دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے۔ فراق کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ اپنے کلام کی تعریف میں مضمون لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع کراتے تھے۔ اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے مطرب نظامی نے لکھا ہے:

''یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ اس بات کا چونکہ فراق صاحب نے خود اعتراف کیا ہے۔ اس لیے یہ بات صرف موصوف ہی کو نہیں معلوم ہے بلکہ عوام بھی اس سے واقف ہیں۔ ادبی دنیا میں شاید ہی کوئی فرشتہ صفت شاعر ہو جو اپنی شہرت کے راستے نہ فراہم کرتا ہو۔''

(مطرب نظامی، فراق گورکھپوری، ذہنی خاکوں میں، ص10)

فراق جس زمانہ میں ترقی پسندوں سے خفا تھے اسی دور میں ان کا اثر لکھنوی سے 'روپ میری نظر میں' کے ریویو پر مناقشہ چل رہا تھا اور فراق مغلوب الغضب ہو کر 'نقوش' لاہور میں اثر لکھنوی کے لیے اس طرح کے شعر غزلوں میں لکھ رہے تھے۔

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس دم
اثر بیٹھے ہوئے کرتے ہیں ہی ہی
قلم کا زور ناحق صرف کرتے ہیں
غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہے
اثر رو رو کے کہتے ہیں، فرقواراہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

فراق کے خطوط میں بھی اس طرح کی تحریروں سے وقتی طور پر ایک لطف و مزاح کی فضا بنتی ہے، لیکن یہ مذاق فراق کے خطوط کو ادبی بلندیوں سے نیچے اتار لیتا ہے۔ اس طرح کی تحریریں فکری بلندی و جمالیاتی اور شاعرانہ فضا سے محروم ہوتی ہیں۔ فراق شاعری پر بحث کرتے وقت ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بظاہر ایک معمولی لفظ یا ایک معمولی فقرہ ادب عالیہ بن جائے، میر کے علاوہ یہ بات مشاہیر اردو کے یہاں نہیں ملتی پھر میر کا شعر پیش کرتے ہیں۔

''ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اداس کیا

غالب کو اداس کے لفظ کا معجزہ انگیز استعمال کرنے کا ایک موقع ملا ہے اگر چہ پہلا مصرع غیر معمولی محاسن کا حامل نہیں ہے۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

لیکن جو جادو میر کے 'اداس' میں ہے وہ غالب کے اداس میں نہیں ہے'' (فراق گورکھپوری، من آنم، ص97)

اس کے بعد اپنے اشعار پیش کرتے ہیں۔

یہ سہانی اداس تنہائی
لیتی ہے پچھلی رات انگڑائی
زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

ان اشعار کو پیش کرنے کے بعد فراق نے کچھ اور معمولی الفاظ بھولنے اور یاد کرنے کو غیر معمولی تاثیر دینے کی کوشش کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے مزید اشعار پیش کیے ہیں۔

ہماری زندگی عشق کا وہ پہلا خواب
مجھے بھی بھول چکا ہے تمھیں بھی یاد نہیں
غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا ترے بھلانے میں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اس طرح 'خیر' جو کہ بول چال کا ایک معمولی لفظ ہے اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

آخر میں 'جاگنا' اور 'سونا' الفاظ کو اپنے شعر میں استعمال کرنے کے بعد ان کے پرتاثیر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ایک شب غم وہ بھی تھی جس میں نیند نہ آئی روئے بھی
ایک شب غم یہ بھی ہے جس میں کچھ جاگے کچھ سوئے بھی

فراق گورکھپوری کا یہ کہنا بجا ہے کہ احساس و جذبات کی معصومیت جب انتہا درجے کو پہنچ جاتی ہے، تب معمولی الفاظ بھی معجزہ بن جاتے ہیں اور معجزہ کر دیتے ہیں۔ لیکن فراق نے جس طرح اپنے اشعار پیش کیے ہیں اور تمام شعرا کو علاوہ میر کے، اس ہنر سے عاری قرار دیا ہے۔ یہ ان کی خود پرستی کو واضح کرتا ہے۔

فراق گورکھپوری کا یہ کہنا بجا ہے کہ احساس وجذبات کی معصومیت جب انتہا درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ تب معمولی الفاظ بھی معجزہ بن جاتے ہیں اور معجزہ کردیتے ہیں۔ لیکن فراق نے جس طرح اپنے اشعار پیش کیے ہیں اور تمام شعرا کو علاوہ میر کے۔ اس ہنر سے عاری قرار دیا ہے۔ یہ ان کی خود پرستی کو واضح کرتاہے۔

فراق کی زندگی کے مخفی پہلو سامنے آنے کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں فن کے متعلق ان کی سوچ کا اظہار بھی اسی طرح ہوا ہے جیسا کہ دیگر اہم ادیبوں کے خطوط سے ہوتا ہے۔ یہاں بس تھوڑا فرق یہ ہے کہ 'من آنم' میں شامل خطوط پڑھتے ہوئے بعض جگہوں پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فراق کا کوئی انٹرویو پڑھ رہے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو ایک خطوط کے بعد ہی محمد طفیل نے بتا دیا تھا کہ ان کے خطوط کا وہ کیا کریں گے۔ پھر بھی ان خطوط سے فراق کی نجی زندگی اور ادبی زندگی کے متعلق بہت سی معلومات اور ان کے تاثرات منظر عام پر آئے ہیں اس لیے اس کی ایک ادبی اور تاریخی حیثیت تو ہے ہی۔

استفادی کتابیات

(فراق گورکھپوری، اندازے، ادارہ انیس اردو، الہ آباد 1959
فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، ادارہ فروغ اردو لاہور 1955 ص124
فراق گورکھپوری اردو کی عشقیہ شاعری ص 11 مکتبہ عزم عمل کراچی بار اول 1966
فراق گورکھپوری، حاشیے، سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، س ن
فراق گورکھپوری، من آنم، طابع، شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی، سن اشاعت 1997
گورکھ پرشاد، عبرت، حسن فطرت، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1982
فضل حق، کامل قریشی (مرتبہ) فراق گورکھپوری، بزم ادب، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، 1967
امیر عارفی، مرتب، فراق اور نئی نسل، ساقی بک ڈپو، دہلی 1997
بھودیو پانڈے، سوویش کے فراق، وانی پرکاشن، نئی دہلی، 2008
رمیش چندر دویدی، فراق صاحب، رام نرائن لال، ارون کمار، الہ آباد۔ 1987
سید جعفر، فراق گورکھپوری، ساہتیہ اکادمی، دہلی۔ 2006
شمیم حنفی، (مرتبہ) فراق شاعر اور شخص، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1982
علی احمد فاطمی (مرتبہ) فراق گورکھپوری، فن اور شخصیت، نصرت پبلشرز لکھنؤ، 1986
گوپی چند نارنگ، فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور، ساہتیہ اکادمی، دہلی 2008
محمد طفیل، صاحب، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔ س ن
مخمور سعیدی، مرتب، فراق گورکھپوری، ذات و صفات، اردو اکادمی، دہلی۔ 1998
مشتاق نقوی، فراق صاحب، جلد اول، تقسیم کار نصرت پبلشرز، لکھنؤ 1984

**Dr. Aziz Ahmad Khan**
C/o Abdullah 151, First Floor,
Sarai Julena, New Delhi- 110025

امتیاز رومی

# ذوق کا رنگ سخن اعجاز و امتیاز

انیسویں صدی کے شعری منظرنامے پر جو نام سب سے روشن وتابندہ ہے وہ شیخ محمد ابراہیم ذوق (1789-1854) کا ہے۔ ذوق کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کے مکتب میں ہوئی۔ وہ خود شاعر تھے اور شوق ان کا تخلص تھا۔ شیخ محمد ابراہیم کے اندر جو ذوق نامی شاعر پوشیدہ تھا اسے شوق نے جلا بخشی۔ اپنے استاد کی مناسبت سے شیخ ابراہیم نے ذوق تخلص اختیار کیا۔ اس زمانے میں شاہ نصیر کی استاذی کا ہر طرف غلغلہ تھا، کچھ دنوں کے بعد ذوق بھی ان کی شاگردی میں داخل ہوگئے۔ تاہم زیادہ دنوں تک نہ نبھ سکی اور ذوق نے علاحدگی اختیار کر لی اور خود مشق سخن میں مصروف رہے۔ پیہم مشق و ممارست نے ذوق کی شاعری کو صیقل کر دیا جس کی تابندگی نے بہادر شاہ ظفر کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا اور انیس سال کی عمر میں ذوق 'استاذ شہ' کی حیثیت سے ہر طرف ممتاز ہوگئے۔ ذوق متعدد علوم وفنون کے ماہر تھے۔ علم رمل، علم نجوم اور موسیقی وغیرہ پر کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ لیکن شاعری ہی عزت وشہرت کا ذریعہ بنی۔ تاہم پھر بھی وہ اپنی قسمت کو کوستے ہوئے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے علم وفن کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

بہادر شاہ ظفر نے بھی استاد ذوق کی عزت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ملک الشعرا کا اعزاز عطا کیا۔ ذوق کے شاگردوں میں داغ دہلوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ داغ نے استاذ کی روایت کی توسیع کی اور زبان و بیان کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس کو بھی شامل کیا جس سے داغ کی شاعری میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوگئی۔ جہاں تک محمد حسین آزاد کی بات ہے تو ان کی شاگردی بھی مختلف فیہ ہے۔ اس تفصیل سے قطع نظر کہ آزاد نے ذوق کو آب حیات کا گھونٹ پلا پلا کر شہرت عام کو بقائے دوام بخشنے کی سعی لاحاصل میں ان کی شخصیت اور شاعری کو مزید مشتبہ بنا دیا۔ جمیل جالبی اس حوالے سے رقم طراز ہیں "انھوں نے نادان دوست کا کردار ادا کر کے ذوق کو الٹا نقصان پہنچایا ہے اور ذوق کی ہر بنیادی بات کو نزاعی بنا دیا ہے۔ نہ صرف ان کے حالات زندگی کو الجھا دیا ہے بلکہ ان کے دیوان کو بھی خراب کر دیا ہے۔"[1] حالانکہ ذوق اپنے علم و فضل اور فکر وفن میں خود ہی ممتاز اور یکتائے روزگار تھے۔ ان کو شہرت عام اور بقائے دوام کے لیے محمد حسین آزاد کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ بلکہ آزاد نے تو انھیں نقصان ہی پہنچایا۔ بہرحال جب ذوق کا رنگ سخن صیقل ہو کر سامنے آیا تو اس نے عوام وخواص سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ذوق کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ لوگ ان کے فن کے قدردان ہیں۔ چنانچہ ذوق خود کہتے ہیں۔

آیا ہوں نور لے کے میں بزم سخن میں ذوق
آنکھوں پہ سب بٹھائیں گے اہل سخن مجھے

ذوق کا یہ شعر ان پر سو فیصد صادق آیا۔ نوائے ذوق یقیناً نقارۂ وقت ٹھہرا۔ انھیں عوام وخواص نے اپنی آنکھوں پر بٹھایا، دل میں بسایا اور عظمت وشہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ نیز یہ عزت وشہرت محض استاذ شہ ہونے کے سبب نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے ان کی ذاتی قابلیت اور امتیازی رنگ سخن کار فرما تھا۔ ذوق کا رنگ سخن اس عہد کی تہذیبی فضا میں بازگشت کر رہا تھا اور سانسوں کے ذریعہ

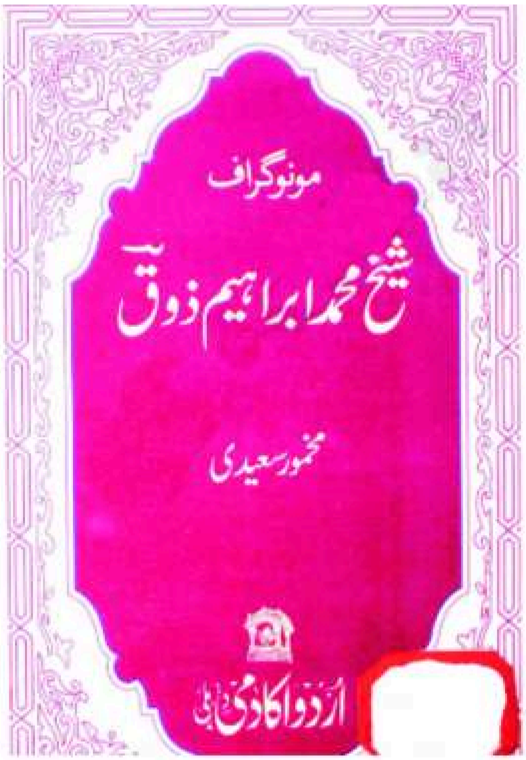


ہر ایک کے اندر سرایت کر رہا تھا۔ انیسویں صدی کے افق پر ذوق کا رنگ سخن چھایا ہوا تھا۔ ہر چہار جانب ذوق کی استادی کا غلغلہ بلند تھا۔ غالب و مومن کا دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا مگر بیسویں صدی آتے آتے پہلی ترتیب بدل گئی۔ اب غالب، مومن اور ذوق کی ترتیب رائج ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت سخن فہم لوگ نہیں تھے؟ یا پھر بعد میں لوگ غالب کے طرف دار ہوگئے؟ یا پھر ذوق کا کلام بعد میں تبدیل ہوگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عہد کی تہذیبی فضا یکسر تبدیل ہوگئی۔ نیز ذوق کے لیے ناموافق حالات بھی پیدا ہوگئے اور کچھ غالب کے طرف دار بھی ہوگئے۔ ہر شاعر کو غالب کے پیمانے سے ناپنے لگے۔ ان تینوں کا کلام آج بھی وہی ہے۔ البتہ انیسویں صدی کا تہذیبی نشان مٹ گیا۔ نیز ہمارا انداق سخن یکسر تبدیل ہوگیا۔ ذوق کی شاعری میں انیسویں صدی کی روح اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اس کے بغیر کلام ذوق کی معنویت کم ہو جاتی ہے۔ بقول جمیل جالبی ''ذوق اس تہذیب کا ترجمان تھا جو تھی اور اب نہیں ہے۔ غالب اس تصور حقیقت کا ترجمان تھا جو اس وقت نہیں تھی اور اب ہے۔''[2] دراصل غالب اور ذوق میں بنیادی فرق یہی ہے کہ غالب نے اپنے فن کو فکر و فلسفہ کا آئینہ بنا کر اس کو مستقبل کے لیے امر کردیا۔ جب کہ ذوق نے عہد رواں کے مزاج و معیار کو اپنے اندر سمیٹ لیا لیکن جب اس تہذیب کی سانس تھم گئی تو ذوق کی شاعری بھی پژمردہ ہوگئی۔

عام طور پر جہاں ذوق کی شاعری پر بات ہوتی ہے وہاں غالب اور مومن کا ذکر آ ہی جاتا ہے کیونکہ ناقدین نے ذوق کو غالب اور مومن کی آنکھوں سے ہی پڑھنے کی کوشش کی ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ غالب و مومن کے مقابلے ذوق کی غزل کو حد سے زیادہ مشق ستم بنایا گیا۔ کسی نے 'غالب و مومن کے مقابلے ذوق کا نام لینا ہی گناہ جانا' تو کسی نے ذوق کی غزل کو 'بے ذوق' بتایا جو کہ محض کج فہمی ہے۔ اول ذوق کا مطالعہ غالب و مومن کے پیمانے سے نہ کر کے اس عہد کے تہذیبی حوالے سے کرنا چاہیے۔ دوم ان کے مابین مقابلہ بے جا ہے۔ ان تینوں کی حیثیت جدا جدا ہے۔ غالب فکر و فلسفہ کا شاعر ہے، مومن معاملات عشق میں طاق ہے اور ذوق اس عہد کی تہذیب اور معاشرے کی آواز ہے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ غالب کو زبان کا علم نہیں، مومن معاملات عشق تک محدود ہے اور ذوق فکر و احساس سے بالکل عاری ہے۔ ''ذوق کو مضمون کے ہر پہلو پر جو گرفت حاصل ہے اس کا نشان تک غالب کے پورے کلام میں نہیں ملتا۔''[3]

محمد حسن عسکری کا یہ قول کلی طور پر جھٹلایا نہیں جا سکتا البتہ مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ اس سے غالب کی سبکی ہرگز مقصود نہیں۔ غالب کو بڑا شاعر ماننا غلط نہیں تاہم ذوق کو کمتر ثابت کرنا صحیح نہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ غالب نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا نہ کہ اپنا تمام کلام۔ تاہم ذوق نے خود یہ کام نہیں کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ محمد حسین آزاد نے ان کے قد کو بلند کرنے کے زعم میں مزید پست کردیا اور ان کی شاعری کو بھی مشتبہ بنا دیا۔ اگر ذوق بھی اپنا انتخاب کر کے باقی کلام کو دفن کر دیتے تو شاید آج حالات کچھ اور ہوتے۔ یہ تو غزل کا معاملہ ہے ورنہ ذوق کی قصیدہ نگاری غالب سے ارفع و اعلی ہے۔ غالب نے جو سہرا لکھا اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں اس کا بہترین جواب ذوق نے اپنے سہرے میں دیا۔ ذوق نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ دیوان ذوق میں غزل، قصیدہ، رباعی اور ایک نامکمل مثنوی بھی شامل ہے۔ تاہم وہ قصیدے کے امام ثانی اور خاقانی ہند ہیں۔ ان کے قصائد جلالت علمی سے پر ہیں اور فنی اعتبار سے کامل۔

محمد سلیمان نے 'انتخاب غزلیات ذوق' میں غالب اور ذوق کے بہت سارے اشعار درج کیے ہیں جو ایک طرح کے ہیں۔ ان دونوں کو ایک ساتھ پڑھنے کے بعد ہی دونوں کے معیار و مرتبے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک ہی زمین میں غالب اور ذوق دونوں نے بہت سی غزلیں کہی ہیں جن کو آپس میں ملا دیا جائے تو ایک ہی غزل میں شیر و شکر ہوجائیں گے اور ان میں فرق کر پانا تھوڑا مشکل ہوگا۔ ذیل میں ایک نمونہ ملاحظہ کریں۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انھیں کیا اضطراب میں

(ذوق)

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

(غالب)

ذوق نازک خیالی اور معنی آفرینی کی تگ و دو میں نہیں رہتے تھے بلکہ اپنے خیالات کو روز مرہ کے محاوروں کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ البتہ زبان و بیان کی شگفتگی پر ان کی گہری نظر ہوتی تھی۔ انداز بیان پرشکوہ، پرتاثیر اور کلام پر شعرائے لکھنو کا ساز ور ہوتا تھا اس لیے سامعین کو فوری طور پر متاثر کرتا تھا۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی ذوق بڑی آسانی سے پوری غزلیں کہہ ڈالتے تھے۔ ذوق در اصل لفظوں کے بازی گر ہیں۔ لفظوں کے انتخاب، تراش خراش اور حسن ترکیب پر انھیں کامل عبور ہے۔ وہ محاوروں کو بہ کثرت اور برمحل کلام میں لائے ہیں جن سے کلام کا ظاہری حسن دوبالا ہوگیا۔ آزاد کے خوب صورت الفاظ میں:

''کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین ستارے آسمان سے اتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھا دیا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہیے کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیب کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بو سے بساتے ہیں کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔''[4]

محمد حسین آزاد کی انشا پردازی اور حد سے زیادہ مبالغہ آرائی نے ذوق کی شخصیت اور شاعری کو مجروح کردیا۔ اس میں ذوق کا اپنا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ نادان دوست کا رول ادا کرنے والے محمد حسین آزاد نے ان کو

”مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی ذوق بڑی آسانی سے پوری غزلیں کہہ ڈالتے تھے۔ذوق در اصل لفظوں کے بازی گر ہیں۔ لفظوں کے انتخاب، تراش خراش اور حسن ترکیب پر انہیں کامل عبور ہے۔ وہ محاوروں کوبہ کثرت اور بر محل کام میں لائے ہیں جن سے کلام کا ظاہری حسن دوبالا ہو گیا۔“

ڈبویا۔ جب علمی حلقوں میں آزاد کی حقیقت عیاں ہوئی تو ذوق چوں کہ ان کے ممدوح تھے اس لیے ذوق پر بھی اس کا اثر ہوا اور آزاد کی تعریف تنقیص میں بدل گئی اور اس تعریف کا بدلہ نقادوں نے ذوق سے لیا۔ آزاد نے تاریخ وتنقید میں صحت اور عدم صحت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔ بس ذوق کو اپنا ممدوح بنایا اور دیگر شعرا کو نظر انداز کر دیا اگرچہ آزاد کا بیان مبالغہ آمیز ضرور ہے تاہم دروغ گوئی نہیں۔ مضمون آفرینی، معاملہ بندی، رندمشربی، طنز و مزاح اور بے ثباتی دنیا، غرض کہ ہر قسم کے مضامین نہایت خوب صورتی کے ساتھ ذوق نے باندھے ہیں۔ ذوق نے محاوروں کا استعمال جس خوبی سے کیا ہے، اس کی مثال پوری اردو شاعری میں کم یاب ہے۔ یہ اشعار دیکھیں۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

ہونا عاشق سوچ کر اس دشمن ایمان کا
دل نہ کر جلدی کہ جلدی کام ہے شیطان کا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

**کلا م ذوق کا سب سے گہرا رنگ اردو پن ہے۔اس میں اردو اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انہوں نے عربی وفارسی کے الفاظ سے ممکنہ حد تک احتراز کیا ہے۔ جس سے ان کے کلا م میں شیرینی پیدا ہو گئی ہے۔**

اُس عہد کے تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ ذوق اور ان کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی قادرالکلامی کے ایسے جوہر دکھائے کہ تمام اہل سخن عش عش کرنے لگے۔ سر سید جو اپنے وقت کے بہت بڑے مفکر و مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ادیب و نقاد بھی تھے۔ انھوں نے ذوق کے بارے میں 'تذکرہ اہل دہلی' میں لکھا ہے:

''مشق سخنوری اس درجہ کو پہنچی ہے کہ کوئی بات اس صاحب سخن کی غالب ہے کہ پیرایۂ وزن سے معرا نہ ہوگی۔ پرگو اور خوش گو غزل ویسی ہی اور قصائد ویسے ہی۔ غزل گوئی میں سعدی و حافظ و قصیدہ میں انوری و خاقانی۔ مثنوی میں نظامی کو اگر اس سخن گو کی شاگردی سے فخر ہو تو کچھ عجب نہیں۔ شماران کے اشعار گوہر نثار کا بجز عالم الغیب کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس قدر جامعیت کہ فصاحت عبارت اور متانت تراکیب اور تازگی اور حدت معنی اور غرابت تشبیہ اور حسن استعارہ اور خوش اسلوبی کنایہ اور لطف تلمیح اور پاکی الفاظ اور تنگ ورزی کلمات اور بست قافیہ اور نشست ردیف نظم ونسق کلام اور حسن آغاز و انجام ایک جائے میں جمع ہیں۔ متقدمین سے متاخرین تک کسی اور فرد بشر کو حاصل نہیں ہوئی۔''[5]

ذوق کی زبان و بیان پر قلعہ معلی کے اثرات اور زبان دہلوی کے محاوروں کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ اشعار سن کر لوگ بے ساختہ مچل جاتے تھے۔ جب قلعے میں مشاعرہ ہوتا تو ذوق مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ چونکہ مشاعرے میں ابلاغ وترسیل کا مسئلہ ہوتا ہے اسی لیے اس کا اپنا ایک اسلوب اور لب ولہجہ ہوتا ہے جس میں ذوق مکمل طور سے کامیاب تھے تاہم غالب کی مشکل ترکیبات اور عمیق خیالات ابلاغ وترسیل کی نارسائی کی وجہ سے دقت پیدا کرتے تھے۔ چناں چہ ذوق کو اپنی زندگی میں جتنی شہرت ومقبولیت ملی وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ کلام ذوق کا سب سے گہرا رنگ اردو پن ہے۔ اس میں اردو اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے عربی وفارسی کے الفاظ سے ممکنہ حد تک احتراز کیا ہے۔ جس سے ان کے کلام میں شیرینی پیدا ہوگئی ہے۔ بقول فراق:

''ذوق کا نام ہم غالب اور مومن کے پہلے لیں یا بعد میں اتنا تو ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ زبان کی شاعری کا بابا آدم ہے۔''[6]

تک بندی، معاملہ بندی، مضمون آفرینی اور عام بول چال کی زبان کو ذوق نے بہت عمدگی سے برتا ہے۔ حتیٰ کہ غالب و مومن بھی اس معاملے میں ان سے پیچھے رہ گئے۔ فراق کے نزدیک 'ذوق پنچایتی اور رائے عامہ کا شاعر ہے' یہی وجہ ہے کہ ان کے بے شمار اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جو برمحل بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
گرچہ ڈھونڈوگے چراغ رخ زیبا لے کر

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

ہر شاعر کے اپنے مزاج، عہد اور حالات ہوتے ہیں۔ جن سے وہ متاثر ہوتا ہے اور شعری اظہار کے پیکر تراشتا ہے۔ چونکہ ذوق کو کبھی ان پریشانیوں کا سامنا نہیں رہا جن سے دیگر شاعر متاثر ہوئے اور نہ ہی زندگی سے گلہ شکوہ، اس لیے ہزار کوشش کے باوجود میر اور درد کی سی داخلیت نہ آسکی جس کا اعتراف خود ذوق نے بھی کیا ہے کہ 'بہت زور آزمائی کے باوجود غزل میں میر کا انداز نصیب نہ ہوا'

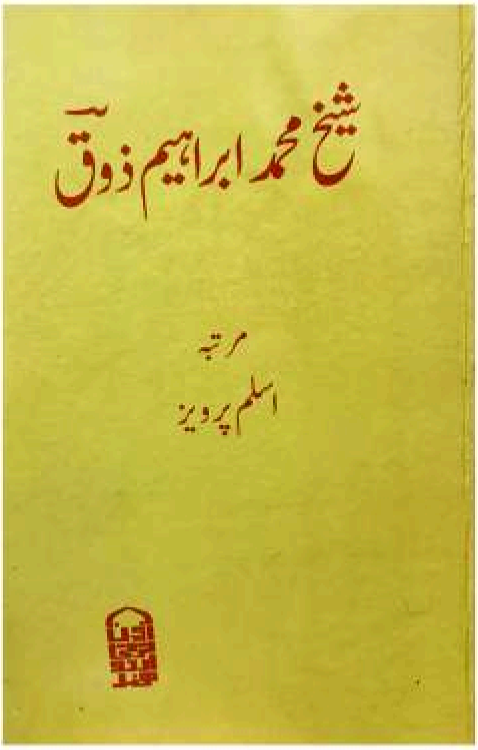


ذوق کی زندگی نہایت پرسکون اور خوش حال رہی۔ اعتدال وتوازن ان کی زندگی کا عنصر تھا۔ جتنا ملا اسی پر قانع رہے۔ طبعی طور پر وہ سیاست اور سیاسی حالات سے الگ رہے۔ اس لیے بھی ان کی شاعری میں وہ درد پیدا نہ ہو سکا جو میر کے یہاں ہے۔ اس کے برعکس میر و غالب زندگی بھر پریشان رہے۔ کبھی چین وسکون کی زندگی نصیب نہ ہوئی جس کی چھاپ ان کی شاعری پر بھی دکھائی پڑتی ہے۔ میر کا غم دوراں بن گیا اور وہ سدا بہار شاعر ہوگئے، غالب نے شاعری کو مستقبل اور فکر و فلسفہ عطا کیا اور ذوق نے حال کی شاعری کی اور اپنے عہد کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ بلاشبہ شاعر اپنے عہد کے حالات اور زندگی کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ سرد و گرم، زمانہ اور زندگی کا دکھ سکھ اس کی شاعری میں در آتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود اس عہد اور حالات کو نظر انداز کر کے بھی اس کی شاعری سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں ذوق ایک ایسے شاعر ہیں جن کی اپنے عہد سے وابستگی جزولاینفک کی طرح ہے "ذوق کے دیوان کا مطالعہ ذوق کی زندگی کے چوکھٹے میں رہ کر کیا جا سکتا ہے۔ وہی ایک ایسا شاعر ہے کہ جب تک آپ اس کی زندگی کے پیچ وخم سے آگاہ نہ ہوں اس کے اشعار سے لطف نہیں اٹھا سکتے۔''[7]

شمع ساں بزم سخن یوں تو ہے اوروں سے بھی گرم
ذوق پر سب سے نرالا ہے یہ انداز اپنا

صاحب کاشف الحقائق امداد امام اثر نے ذوق کو ممتاز شاعر تسلیم کیا ہے تاہم ان کی خارجیت کے باعث درد اور میر کے نیچے رکھا ہے۔ انھوں نے ذوق کو اہل لکھنؤ سے قریب تر بتایا ہے۔ امداد اثر کے بقول:

''اگر مومن اور غالب سے ذوق کو ملایئے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوق غزل سرائی میں اپنے ملکی مذاق کے پابند نہ تھے بلکہ ان کا مذاق غزل سرائی کا ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس سے وہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے ہم مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ قوت شاعری کے اعتبار سے ذوق ایک زور آور شاعر تھے۔ ان کی خلاقیِ سخن، بلند پروازی، نازک خیالی، نفیس مزاجی وغیرہ وغیرہ میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے۔ مگر غزل سرائی میں وہ اس روش کے پابند نہیں رہے ہیں جو درد اور میر کی تھی۔ اسی لیے ان کی غزلیں باوجود عالی خیال کے وہ تاثیر قلبی پیدا نہیں کرتی ہیں جس کی متقاضی غزل سرائی ہے۔''[8]

امداد امام اثر نے ذوق کو بحیثیت شاعر زور آور، بلند پرواز، نازک خیال اور خلاق سخن مانا ہے۔ تاہم ان کی غزل سرائی کو تاثیر قلبی سے خالی بتایا۔ ذوق خارجی معاملات میں طاق ہیں تاہم داخلی واردات بھی جستہ جستہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ داخلیت پر مشتمل ان کے اشعار کا انتخاب کرکے شائع کیا جائے۔ ذوق مکمل طور پر خارجیت زدہ بھی نہیں ہیں۔ ان کی خارجی شاعری میں بھی قلبی اور ذہنی واردات ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل پر برسوں گوارا ہوگیا
ترے آتے ہی آتے کام آخر ہوگیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا
ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا

ذوق کی شاعری جملہ موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی بہتات ہے۔ خارجی معاملات اور داخلی حالات کے ساتھ ساتھ بے ثباتی دنیا اور مسئلہ جبر وقدر کو بھی انھوں نے موضوع سخن بنایا ہے جو نظام کائنات اور احوال حیات وممات کے متعلقات ہیں۔ انسان کی خود غرضی اور موت کے سامنے انسان کی لاچاری وبے بسی اور فلسفہ زندگی کو بھی ذوق نے پیش کیا ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
موت نے کردیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

ذوق کی شاعری میں فارسی، اردو اور ہندی کے الفاظ و تراکیب اس خوبی سے ضم ہوگئے کہ ان کو جدا کرنا قبح کا باعث ہوگا۔ ذوق نے بیا ہے کے جملہ ممکنات کو قوت اظہار بخش دیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اردو کے ٹھیٹھ پن کو مستحکم کیا۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''ذوق نے زبان کی ایک نئی اکائی پیدا کرکے دکھائی۔ یہ اکائی مختلف اجزا سے مل کر وحدت تالیفی کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ذوق نے ٹھیٹھ اردو کی تمام ممکنات کو بے نقاب کردیا ہے اور جدید اردو شاعری کے لیے زمین تیار کی ہے۔''[9]

''آزاد کی مرصع زبان بھی ذوق کی زبان ہے اور حالی کی 'فریاد بیوہ' کی مٹھاس اور لوچ بھی ذوق ہی کی زبان کی ایک سطح ہے: اس اعتبار سے جدید اردو شاعری کی تاسیس کی جڑیں آخر ذوق کے خانوادہ جلیل سے جا ملتی ہیں۔''[10]

> **ذوق نے اپنے شاگردوں کی تربیت اور اصلاح سخن میں بہت دقت نظر سے کام لیا۔ ان کا اصل منصب یہی تھا، اسی لیے 'استاد ذوق' سے مشہور ہوئے۔ شعرو ادب میں استاد شاگرد کا جو رشتہ رہا ہے اور ان کا جو مقتدر اور مضبوط سلسلہ رہا ہے اس میں ذوق کے پائے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ ذوق نے اردو شاعری میں زبان وبیان اور فنی التزامات کا جو بیج بویا وہ داغ اور اقبال تک جاپہنچا۔**

ذوق نے اپنے شاگردوں کی تربیت اور اصلاح سخن میں بہت دقت نظر سے کام لیا۔ ان کا اصل منصب یہی تھا، اسی لیے 'استاد ذوق' سے مشہور ہوئے۔ شعروادب میں استاد شاگرد کا جو رشتہ رہا ہے اور ان کا جو مقتدر اور مضبوط سلسلہ رہا ہے اس میں ذوق کے پائے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ ذوق نے اردو شاعری میں زبان وبیان اور فنی التزامات کا جو بیج بویا وہ داغ اور اقبال تک جاپہنچا۔ ان باتوں کی اہمیت آج اس لیے کم ہوگئی کہ استادی اور شاگردی کا وہ سلسلہ نہیں رہ گیا۔ جہاں سے شعرا وابستہ ہوکر فخر کرتے تھے۔ خانقاہی سلسلوں کی طرح شعری سلسلے بھی ہوا کرتے تھے لیکن آج یہ سلاسل ناپید اور ان کی معنویت نابود ہوگئی۔ چونکہ زبان و بیان کا علم، قادرالکلامی اور استعاروں، کنایوں اور رموز و علائم ذوق سے داغ نے لیے اور پھر داغ سے اقبال تک منتقل ہوئے اس لیے بلاشبہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ذوق کا سلسلہ تمام سلاسل میں سب سے بلند وبالا اور بافیض ثابت ہوا۔

غرض کہ ذوق کی شاعری کا اعجاز یہ ہے کہ وہ زبان و بیان کو اپنی قدرت کاملہ سے اپنے مصرف میں لائے اور اردو، ہندی اور فارسی کو اس طرح مدغم کردیا کہ ٹھیٹھ اردو زبان کا جامہ پہنا دیا۔ ذوق کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی شاعری تہذیب وثقافت کی شاعری ہے، زبان وتہذیب کی شاعری ہے۔ تک بندی اور محاورہ بندی کی شاعری ہے۔ ان کا رنگ سخن اپنے عہد کے ذرے ذرے میں عیاں ہے اور اہل فکر وفن کی زبان پر نغمہ سرا ہے۔ یوں تو ہر شاعر کی بنیاد اس کے عہد سے وابستہ ہوتی ہے تاہم اس عہد کو پرے رکھ کر بھی ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ لیکن ذوق کا عہد ان کی شاعری سے اس طور پر وابستہ ہے کہ دونوں کو علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ بغیر اس عہد کی روح کو سمجھے ہوئے ذوق کی شاعری کو یکسر نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کے عہد سے جتنا ارتباط و انسلاک ہوگا، ان کی شاعری اتنی ہی پرلطف اور بلند مرتبہ نظر آئے گی۔ کیونکہ ذوق کی شاعری میں اس عہد کی روح اور قلعہ معلی کی تہذیب رچی بسی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ذوق کے عہد میں تنقید وتنقیح کے پیمانے الگ تھے اور بعد کے پیمانے الگ ہوگئے، اس لیے بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر گرد جم گئی جسے صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح وہ متوازن مزاج اور علم وفضل میں بلند قامت شخصیت کے حامل تھے، اسی طرح شاعری میں بھی ان کا اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام ومرتبہ ہے جس کا صحیح تعین کرنے کے لیے اس عہد کے تہذیبی اور سماجی حوالوں کو مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔

حوالہ جات


1. جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو جلد چہارم حصہ اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ص 241
2. ایضاً، ص 257
3. بحوالہ ایضاً، ص 256
4. محمد حسین آزاد: آب حیات، اتر پردیش اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن 2003، ص 455
5. سرسید احمد خان، تذکرہ اہل دہلی، انجمن ترقی اردو 1965 اشاعت دوم، ص 245-246
6. شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرتبہ اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو ہند، ص 293
7. سید عابد علی عابد، مقدمہ ذوق سوانح اور انتقاد، مرتبہ تنویر احمد علوی، مجلس ترقی ادب لاہور، 1963، ص 33-34
8. امداد امام اثر، کاشف الحقائق، ص 429
9. سید عابد علی عابد، مقدمہ ذوق سوانح اور انتقاد، مرتبہ تنویر احمد علوی، مجلس ترقی ادب لاہور، 1963، ص 56
10. ایضاً، ص 46



**Imteyaz Rumi**
Room No: 17, Mahi Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.: 09810945177

پی ایف رحمان

# حکومت کے اہم تعلیمی ڈیجیٹل اقدامات اور اردو

کرونا وائرس کی وجہ سے ملک میں لاک ڈاؤن کے دوران جہاں دیگر امور کو انجام دینا مشکل ہوگیا ہے وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا بھی ایک مشکل امر بن گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں درس و تدریس کا جو طریقہ رائج ہے اس میں ایک ہی جگہ پر طلبا اور اساتذہ کی موجودگی لازمی ہے، جسے لاک ڈاؤن میں جاری رکھنا ممکن نہیں۔ ان حالات میں تمام تعلیمی اداروں، اساتذہ اور طلبا کی نظریں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) اور وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند (ایم ایچ آر ڈی) پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسے میں یو جی سی و ایم ایچ آر ڈی نے آن لائن درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کی طرف توجہ دلائی اور اس سلسلے میں تمام اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کو احکامات بھی جاری کیے۔ ایسی صورت حال میں سوال یہ ہے کہ آخر طلبا اور اساتذہ اس کے لیے کتنا تیار ہیں، انھیں آن لائن درس و تدریس کا کتنا تجربہ ہے، اداروں کے پاس تکنیکی وسائل کی سہولت کتنی ہے اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے کون کونسے تکنیکی پلیٹ فارمس اور ریسورسیز موجود ہیں۔

اس سلسلے میں پچھلے چند سالوں پر نظر ڈالیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ایم ایچ آر ڈی پہلے سے ہی آن لائن کلاسیز کی تیاری کر رہی تھی۔ جولائی 2017 میں ایم ایچ آر ڈی نے تمام یونی ورسٹیز، آئی آئی ٹیز، آئی آئی ایمز اور این آئی ٹیز وغیرہ کے وائس چانسلرز و ڈائرکٹرز کے ساتھ اعلی تعلیم میں ڈیجیٹل اقدامات کے عنوان سے ایک اہم قومی کنونشن منعقد کیا جس میں کئی ڈیجیٹل اقدامات یعنی سویم، سویم پربھا، نیشنل ڈیجیٹل لائبریری اور نیشنل اکیڈمک ڈپوزیٹری کو لانچ کیا گیا۔ اس کا مقصد انفارمیشن و کمیونی کیشن ٹیکنالوجی کا امدادی حیثیت سے استعمال کرتے ہوئے تعلیم کو معیاری بنانا اور دور دراز تک پہونچانا تھا۔ جس کے لیے آن لائن درس و تدریس، آن لائن ٹریننگ، آن لائن آڈیو، ویڈیو، ای کنٹینٹ اور ورچول لیبس کے پلیٹ فارمس تیار کرنا تھا۔ اس کنونشن کے بعد ملک میں ڈیجیٹل اقدامات میں انقلاب برپا ہوا اور آئی سی ٹی کے کئی پلیٹ فارمس وجود میں آئے۔ ایم ایچ آر ڈی نے خود اپنی ویب سائٹ پر جن اہم انفارمیشن و کمیونی کیشن ٹیکنالوجی اقدامات کی معلومات دی ہے ان میں سویم، سویم پربھا، نیشنل ڈیجیٹل لائبریری، ای پی جی پاٹھ شالا، شودھ گنگا، ای شودھ شندھو، ای یتر، فوسی، اسپوکن ٹیوٹوریل، ورچول لیب، سمرتھ، ودوان اور شودھ شندھو شامل ہیں۔ ایم ایچ آر ڈی کے ان اہم اقدامات کو سمجھنے کے لیے ان کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کی جارہی ہے کہ آخر ان پلیٹ فارمس پر اردو میں کتنے مواد موجود ہیں، ان کی تفصیلات کیا ہیں اور اردو کے اساتذہ و طلبا ان پلیٹ فارمس کا درس و تدریس میں کس طرح استعمال کرسکتے ہیں۔ ان تفصیلات کو پیش کرنے سے قبل ایم ایچ آر ڈی اور یو جی سی نے لاک ڈاؤن کے بعد درس و تدریس کے سلسلے میں کیا کیا اقدامات کیے ہیں ان پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔

اس سلسلے میں لاک ڈاؤن کے چند دنوں بعد ہی 21 مارچ 2020 کو ایم ایچ آر ڈی نے اساتذہ کو لاک ڈاؤن کی مدت کے دوران آن لائن مواد تیار کرنے، ریسرچ پروجیکٹ مکمل کرنے، سوالات بینک بنانے اور تحقیقی مضامین شائع کرنے جیسے کاموں کے احکامات دیے۔ یو جی سی نے اپنے 28 مارچ 2020 کے نوٹس میں دکشارمبھ، کیر، اسٹرائڈ جیسے گیارہ اکیڈمک کاموں کو انجام دینے کا مشورہ دیا۔ 11 اپریل 2020 کو یو جی سی نے 'بھارت پڑھے آن لائن' پر تجویزیں مانگیں اور اہم تجاویز کو شامل کرتے ہوئے زوم، گوگل کلاس روم، گوگل میٹ، اسکائپ، وہاٹس ایپ، یوٹیوب الغرض ہر ممکن پلیٹ فارم اپناتے ہوئے آن لائن کلاس اور طلبا کی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کے سلسلے میں کئی رہنما یا خطوط و ہدایات جاری کیے۔ 22 اپریل 2020 کو یو جی سی چیئرمین نے ڈی ڈی نیوز پر پینل ڈسکشن کے ذریعہ اساتذہ و طلبا کے مسائل پر گفتگو کی۔ یو جی سی نے 29 اپریل 2020 کو اکیڈمک کلینڈر جاری کیا۔ یونی ورسٹی کے اسٹیک ہولڈرس کے لیے مینٹل ہیلپ ڈسک بنانے اور آروگیہ سیتو ایپ ڈاؤن لوڈ کرنے کی سفارشات کیں۔ الغرض ایم ایچ آر ڈی اور یو جی سی نوٹی فکیشن، ہدایات اور ویڈیو کانفرنسنگ کے علاوہ فیس بک، ٹیوٹر پر لگاتار لائیو آکر طلبا اور اساتذہ

کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے، ان کے سوالات کے جوابات دیے اور انھیں مختلف فیصلوں کے بارے میں آگاہ کیا تاکہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھا جاسکے۔

بہر حال حکومت پہلے سے ہی آن لائن کلاسیز کے لیے اقدامات کر رہی تھی اور کرونا کے سبب جب مجبوراً طلبا واساتذہ آن لائن درس وتدریس میں شامل ہوئے تو ان کے مسائل کو حل کرنا حکومت کی ترجیحات میں شامل رہا تاکہ اس سلسلہ کا نفاذ ممکن بنایا جاسکے۔ ایم ایچ آر ڈی نے ماضی میں آن لائن درس وتدریس کے لیے جو اہم آئی سی ٹی اقدامات کیے ہیں اور جن کا اثر مستقبل میں کافی پڑ سکتا ہے، ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

**سویم (SWAYAM):** اس پلیٹ فارم پر پانچ سو سے

زیادہ مختلف آن لائن کورسیز دستیاب ہیں۔ نویں کلاس سے لے کر انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ تک کے کورسیز کو کریڈیٹس کے لیے کبھی بھی، کہیں بھی بغیر کسی فیس کے کیے جاسکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص نوٹی فکیشن آتے ہی اپنے آپ کو ای میل و دیگر معلومات دیکر رجسٹریشن کرا کر آن لائن کورس کرسکتا ہے۔ اس پلیٹ فارم پر پیش کردہ کورسیز چار بنیادی پہلو پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں پرنٹ مواد، ویڈیو لیکچر، پروگریس کی جانچ بذریعہ ٹیسٹ اور آن لائن ڈسکشن فورم ہیں۔ https://swayam.gov.in/

سویم پر موجود اردو کورسیز پر نظر ڈالیں تو اب تک چھ کورسیز چلائے جاچکے ہیں جن میں اردو کلاسیکل غزل کا مطالعہ، جدید اردو شاعری، اردو ادب میں نثر اور شاعری، اردو زبان کی تدریس، اردو لینگویج اسکرپٹ لرنگ اور اساتذہ کے لیے اردو ریفریشر کورس (ARPIT) شامل ہیں۔ 'اردو کلاسیکل غزل کا مطالعہ' کے تحت بیس شعرا داغ دہلوی، فانی بدایونی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، غواصی، غالب، حسرت، جگر مراد آبادی، میر تقی میر، مومن خاں مومن، ناصر کاظمی، قلی قطب شاہ، سراج، ولی دکنی، یگانہ چنگیزی اور ذوق جیسے شعرا کے علاوہ غزل کی مقبولیت کے اسباب، غزل کی تاریخ وتنقید، اردو غزل کا آغاز وارتقا

موضوعات پر ای۔ٹیکسٹ موجود ہیں۔ 'جدید اردو شاعری' کورس میں اکتالیس ای ٹیکسٹس اور ویڈیوز دونوں موجود ہیں۔ جن میں جدید اردو نظم، اقبال کی شاعرانہ عظمت، اقبال کی نظم ساقی نامہ کی تدریس، اقبال اور حب الوطنی، جوش ملیح آبادی، نظم ایک لڑکا: اختر الایمان، ساحر لدھیانوی کی نظم تاج محل، ایک کلرک کا نغمہ محبت: میراجی، پروین شاکر کی نظم خواب کی تدریس، اردو شاعری میں ہندی عروض کا استعمال، جدید اردو غزل کا تعارف، تفہیم غزل: جگر مرادآبادی، ناصر کاظمی کی غزل گوئی، فراق گورکھپوری کی غزل گوئی، فانی بدایونی کی غزل گوئی، حسرت موہانی کی غزل کی تدریس، اقبال کی غزل کی تدریس، اصغر گونڈوی کی ایک غزل کی تدریس، فیض احمد فیض کی غزل کی تدریس، مجاز، شاذ تمکنت، مجروح سلطان پوری کی غزل کی تدریس، مخدوم محی الدین :محبت ومحنت کا شاعر، احمد فراز کی غزل گوئی، مجاز کی غزل گوئی، ندا فاضلی کی نظم نگاری، بلراج کومل کی نظم نگاری، جدید اردو شاعری میں ہیئت کا تجربہ، ماہیے، ہائیکو، ترائیلے، سنیٹ، قطعہ، علی سردار جعفری، اکبر الہ آبادی کی شاعری، آزاد نظم، نظم معریٰ، نثری نظم اور ایک مصرعہ نظم، آزاد غزل، نثری غزل، شہریار، مغنی تبسم اور محمد علوی کی شاعری، دلت اردو شاعری: جینت پرمار اور ڈاکٹر یوگ راج یوگ، مشاعرہ اور نظیر اکبرآبادی شامل ہیں۔

'اردو لینگویج ٹیچنگ' کورس میں کل بائیس ماڈیول شامل ہیں۔ اردو زبان وادب کا ارتقا، اردو زبان کی نشوونما، دکن میں اردو شعروادب، شمالی ہند میں اردو شاعری کا ارتقا، اردو کے ادبی دبستان، ادارے اور تحریکات، زبان دانی آموزشی سرگرمیاں، اردو قواعد اور فن شاعری، قصیدہ اور غزل کی تدریس، مرثیہ اور مثنوی کی تدریس، نظم کی تدریس، رباعی، قطعہ، چہار بیت، دوہا، بارہ ماسہ اور گیت کی تدریس، اردو کی دیگر شعری اصناف اور ہیئتوں کی تدریس، داستان کی تدریس، ناول اور افسانے کی تدریس، اردو ڈراما کی تدریس، مضمون، انشائیہ اور طنز ومزاح کی تدریس، مکتوب نگاری، خاکہ، رپورتاژ اور ڈائری کی تدریس، سفرنامہ، سوانح اور خودنوشت کی تدریس، تحقیق، تنقید، ادبی تاریخ، تبصرہ نگاری اور ترجمہ نگاری کی تدریس، زبان کی مہارتوں کی تدریس، زبان کی تدریس کے انداز و نظر کے علاوہ تدریس وامدادی اشیا جیسے مضامین شامل ہیں۔ 'اردو لینگویج اسکرپٹ لرنگ' میں کل بارہ ماڈیول شامل کیے گئے ہیں جو ای ٹیکسٹ اور ویڈیوز پر مشتمل ہیں۔ اردو زبان کی پیدائش، ارتقا اور رسم الخط، حروف تہجی 'ا' تا 'ے' ہکاری آواز والے حروف، اعراب اور علامتیں، رموز واوقاف، کلمہ، سابقہ، لاحقہ اور مرکبات، جملہ سازی، مطالعہ جاتی اور تحریری انشا، خط اور درخواست شامل ہیں۔ اس کورس میں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل ٹیکنالوجی بھی شریک رہا ہے۔ اساتذہ کے لیے اردو ریفرش کورس (ARPIT) بھی جاری ہے۔ اس میں بھی چھتیس موضوعات پر ویڈیوز موجود ہیں۔

https://swayam.gov.in/explorer?searchText=urdu

**سویم پربھا:** سویم پربھا 32 ڈی ٹی ایچ چینلز کا ایک گروپ ہے جہاں جی ایس اے ٹی 15 سیٹلائٹ کا استعمال کرتے ہوئے روزانہ 24x7 اعلی معیار کے تعلیمی پروگراموں کو ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ یہ 32 ڈی ٹی ایچ چینلز پر موجود مواد اعلی تعلیم، اسکولی تعلیم اور مسابقاتی امتحانات کی تیاری

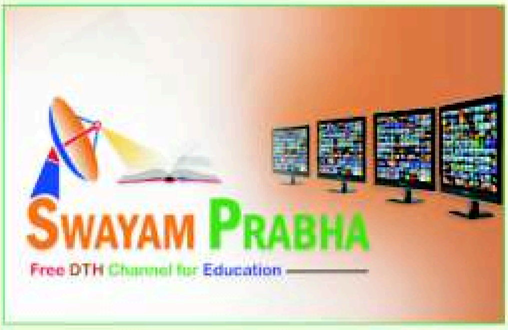


پر مبنی ہوتے ہیں۔ جن میں آرٹس، سائنس، تجارت، سماجی علوم، انجینئرنگ، ٹکنالوجی، قانون، طب وزراعت جیسے متنوع موضوعات شامل ہیں۔ پہلے سے رکارڈ شدہ ویڈیوز کے علاوہ ہردن کم از کم چار گھنٹوں کے لیے نئے مواد پیش کیے جاتے ہیں جو دن میں 5 بار مزید دہرایا جاتا ہے تاکہ طلبا اپنی سہولت کے مطابق استفادہ کرسکیں۔ سویم پربھا پر مواد فراہم کرنے والے اداروں میں این سی ای آر ٹی، یو جی سی، آئی آئی ٹیز، اگنو، این آئی او ایس وغیرہ شامل ہیں۔ سویم پربھا پر پیش کردہ اردو پروگراموں میں این آئی او ایس کے ذریعہ ریکارڈ کیا گیا سیکنڈری اور ہائیر سکنڈری کے سطح کا مواد زیادہ ملتا ہے جبکہ یو جی سی کے فراہم کردہ انڈر گریجویشن سطح کے پروگرام کم ہیں۔ ان پروگراموں میں اردو شاعری میں حب الوطنی، ترقی پسند افسانہ، اردو میں اسکرپٹ رائٹنگ، عیدگاہ، اداریہ نگاری، میر انیس اور مرثیہ، ماس میڈیا کا قدیم چہرہ اور مشاعرہ

جیسے موضوعات شامل ہیں۔سویم پر بھا پر اب تک اردو کے تقریباً پانچ سو پروگرام پیش کیے گیے ہیں جن میں کئی سیریز پروگرام بھی شامل ہیں۔

https://www.swayamprabha.gov.in

**نیشنل ڈیجیٹل لائبریری آف انڈیا:** دراصل یہ ایسی ڈیجیٹل لائبریری ہے جہاں سائنس، مذہب، زبان و ادب، ٹیکنالوجی، قانون، تاریخ اور ایجوکیشن جیسے موضوعات پر پانچ کروڑ کے قریب ڈیجیٹل ریسورسیز موجود ہیں جن میں

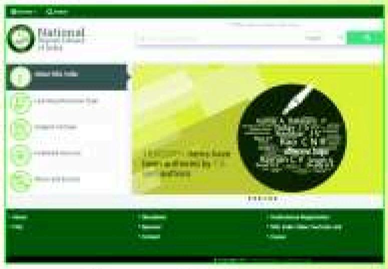


تین ہزار اردو کے مواد بھی شامل ہیں۔ڈیجیٹل ریسورسیز میں زیادہ تر ای -کتابیں و جرنل شامل ہیں۔اس پورٹل پر درجہ اول تا پوسٹ گریجویشن کی کتابوں مفت میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ https://ndl.iitkgp.ac.in/

**ای۔ پی جی پاٹھ شالا:** حکومت ہند کا ڈیجیٹل مواد فراہم کرنے کا یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں پوسٹ گریجویشن سطح کے نصاب پر مبنی ستر سبجیکٹ میں انٹریکٹیو ای۔مشمولات

موجود ہیں۔جن میں بیس ہزار سے زیادہ ای ٹیکسٹ اور انیس ہزار سے زیادہ ویڈیوز ہیں۔اس مواد کو تیار کرنے میں بتیس سو ماہرین شامل رہے ہیں۔ اردو کے مختلف اصناف وموضوعات جیسے اردو تنقید، مغربی تنقید، غالب، لسانیات، اردو افسانہ، غزل، مرثیہ، اردو ڈراما اور دکنی ادب پر 312 ڈیجیٹل ریسورسیز موجود ہیں۔ جن میں ای۔ٹیکسٹ اور ویڈیوز بھی شامل ہیں۔ یہ کافی کارآمد مواد ہیں جو ایم اے اردو اور یو جی سی نیٹ جیسے مقابلہ جاتی امتحانات میں طلبا کے لیے مفید ہوسکتے ہیں۔

https://epgp.inflibnet.ac.in/

**شودھ گنگا:** یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں مختلف یونی ورسٹیوں میں تکمیل شدہ پی ایچ ڈی کے تھیسیز موجود

ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں پچاس مرکزی یونی ورسٹیوں کو ملا کر دیکھا جائے تو کل 935 یونی ورسٹیاں موجود ہیں جہاں بڑے پیمانے پر تحقیقی کام ہوتا ہے۔ اس ویب سائٹ پر ان تمام تھیسیز کو دیکھا جاسکتا ہے جن پر یونی ورسٹیوں نے ڈگری ایوارڈ کی ہے۔اس ویب سائٹ پر اس وقت دو لاکھ ستر ہزار سے زیادہ تھیسیز موجود ہیں جن سے آسانی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔اردو میں سات سو سے زیادہ تھیسیز اس پلیٹ فارم پر موجود ہیں۔ان تھیسیز کے تمام ابواب اور فہرست کو الگ الگ دیکھا جاسکتا ہے اور انھیں ڈاؤن لوڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ریسرچ میں داخلہ لینے والوں یا ریسرچ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مواد نہایت ہی کارآمد ہے۔اس سے کس موضوع پر کیا کام ہوا ہے اس کا بآسانی پتہ چل سکتا ہے اور ریفرنس مل سکتا ہے۔

https://shodhganga.inflibnet.ac.in/

مذکورہ بالا آئی سی ٹی اقدامات کے علاوہ ای شودھ سندھو، فوسی، ای یتھرا، اسپوکن ٹیوٹوریل، سمرتھ، ودوان اور شودھ شدھی وغیرہ بھی حکومت کے اہم اقدامات ہیں۔ان سب تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت نے درس وتدریس کے لیے کئی ڈیجیٹل اقدامات کیے ہیں اور مزید کام کرنا اس کی ترجیحات میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا آئی سی ٹی پلیٹ فارمس پر اردو میں موجود کورس اور مواد کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر کورس اور مواد دونوں ہی تعداد میں کم ہیں اس لیے اضافہ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اردو ادب کے علاوہ اردو زبان میں سماجی علوم اور سائنس جیسے دیگر سبجیکٹ میں بھی کورس اور مواد تیار کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اردو میڈیم کے طلبا استفادہ کرسکیں۔ مذکورہ بالا گورنمنٹ پلیٹ فارمس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے مواد دیگر کئی ویب سائٹس پر بھی موجود ہیں جن میں nic.in, www.urducouncil.org, www.manuu.edu.in, www.rekhta.ac.in www.nios اور www.braouonline.in اہم ہیں۔

حکومت نے آن لائن درس وتدریس کی طرف کافی توجہ دی ہے مگر اس میں درپیش چند مسائل پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ آن لائن درس وتدریس کے لیے یونیورسٹی کے پاس آئی سی ٹی انفراسٹرکچر، اساتذہ وطلبا کے پاس کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، اسمارٹ فون وغیرہ کی موجودگی کو یقینی بنانے کے ساتھ سبھی کے پاس ہائی اسپیڈ انٹرنیٹ کی سہولت درکار ہے تا کہ انٹرنیٹ کی وجہ سے آن لائن درس و تدریس میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو۔اساتذہ وطلبا کو اس کی ٹریننگ دینا اور ذہنی طور پر انھیں اس کلاس روم ٹیچنگ سے فلیپڈ کلاس ٹیچنگ کی طرف مائل کرنا ہوگا۔ مجموعی طور پر اس آن لائن تدریس کے مسائل اور اس کی افادیت کے ہر پہلو پر غور کرکے حل نکالنا ہوگا۔

ایم ایچ آر ڈی اور یو جی سی کے آئی سی ٹی اقدامات کے پیش نظر مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کلاس روم درس و تدریس کا یہ سلسلہ اب بلینڈڈ لرننگ میں تبدیل ہونے کے امکانات ہیں۔ یعنی کچھ چیزیں کلاس روم میں آمنے سامنے پڑھائی جائیں گی اور دوسری چیزوں کو ویب سائٹس پر موجود مواد سے استفادہ کرنے پر زور دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ کورسیز جن میں اسکیل یا پریکٹکل ہیں ان کو صرف فیس ٹو فیس رکھا جائے اور دوسرے چند کورسیز کو مکمل طور پر آن لائن فراہم کیا جائے۔ یہ بھی امکان ہے کہ پچاس فیصد ہی کلاس ٹیچنگ ہو بقیہ ویڈیوز یعنی فلیپڈ کلاس، ڈسکشن فورم، آن لائن کوئز، اسائنمنٹ اور آن لائن ریسورسیز پر مبنی ہو۔اب اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ مستقبل قریب میں آن لائن درس وتدریس میں ہر سطح پر آئی سی ٹی کا کردار اہم ہوگا جن میں حکومت کے مذکورہ بالا ڈیجیٹل اقدامات کافی اہم کردار ادا کریں گے۔

■

**Prof. P.F. Rahaman**
Director, UGC-Human Resource Development Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032
Cell-09490105324
rahmanf65@gmail.com

# زندگی کی مہارتوں پر مبنی تعلیم کامیاب زندگی کی کلید

پٹھان محمد وسیم محمد شبیر

## تمہید:

ہماری زندگی میں تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تعلیم ہماری زندگی کا وہ جز ہے جس کے بغیر ہم اور آپ اپنی زندگی کا تصور ہی نہیں کرسکتے لیکن واقعی جو تعلیم ہم حاصل کر رہے ہیں کیا وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہے؟ کیونکہ مستقل ترقی پذیر ٹکنالوجی اور ڈیٹا سے چلنے والی دنیا کے نظام تعلیم میں بہت زیادہ توجہ سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی پر مبنی اقدامات کی طرف دی جارہی ہے، لیکن تعلیم کا مقصد صرف یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس بات پر بھی مرکوز ہے کہ سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی کی صلاحیتوں سے آراستہ طلبا اچھے فیصلے کرنے اور ان کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی میں درپیش مسائل کو حل کرنے میں بھی زیادہ سے زیادہ بہتر بنیں۔ پچھلے چند سالوں کے دوران عالمی معیشتوں میں ہونے والی ڈرامائی تبدیلیوں کا مقابلہ ٹیکنالوجی کی تبدیلیوں کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس کے اثرات تعلیمی، پیشہ ورانہ اور ذاتی زندگی پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کے نوجوانوں کے سامنے گلوبل وارمنگ، قحط، غربت، خودکشی، آبادی کے دھماکے جیسے بہت سے مسائل ہیں اور ساتھ ہی معاشرتی، جذباتی، جسمانی اور نفسیاتی مسائل بھی درپیش ہیں۔ یہی نہیں بلکہ غیر ضروری مقابلہ، بے روزگاری، ملازمت کا فقدان وغیرہ تعلیم یافتہ افراد کے لیے کچھ اہم خدشات بھی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں، وہ غیر ضروری دوڑ میں پھنس گئے ہیں۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ آس پاس کے ماحول سے ہمدردی اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرے۔

نوجوانوں کو ان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے معاشرے کا سب سے زیادہ نتیجہ خیز رکن سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں مناسب رہنمائی اور تحریک کی کمی کی وجہ سے ان میں سے بیشتر اپنی صلاحیتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ معاشرتی مسائل جیسے شراب نوشی، منشیات کا استعمال، جنسی استحصال، تمباکو نوشی، جرم، معاشرتی خلاف ورزیوں وغیرہ کے ان پر اور ان کے ہمراہ دوسروں پر بھی بہت حد تک منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ان نئے چیلنجز کے لیے معاشرتی طور پر ذمے دار نظام تعلیم سے فوری اور موثر حل کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں تعلیم بہت ضروری ہے، لیکن ایسی تعلیم کی قسم، جو انسانی زندگی کے لیے معاون ہو اور بہتر زندگی گزارنے میں اہم کردار ادا کرے۔ اس طرح تعلیم اس پر مرکوز ہونی چاہیے جو طلبا میں ایسی مہارتوں کو فروغ دے جو انھیں مستقبل کے مسائل اور چیلنجز کا بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کے قابل بناسکے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ شریک تعلیم (co-scholastic) علاقوں کی ترقی بھی ضروری ہے اور اسی وجہ سے، نصاب میں زندگی کی مہارت کی تعلیم کو ایک لازمی عنصر کے طور شامل کیا گیا ہے، تاکہ زندگی کی مہارتوں کی تعلیم کے بنیادی کام اور صلاحیتوں کے مابین فاصلے کو ختم کیا جاسکے۔ اس سے ایک فرد کی موجودہ معاشرے کی ضروریات اور مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت کو تقویت ملے گی اور اس طرح، متعلقہ زندگی میں مہارتوں کی تعلیم مطلوبہ رویے کو عملی شکل دینے کے لیے مذکورہ امور سے نمٹنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

## زندگی کی مہارتیں:

زندگی کی مہارت ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے اور مثبت رویہ اپنانے پر ہوتا ہے جو انسانوں کو زندگی کے مطالبات اور مشکل صورت حال کا موثر انداز سے مقابلہ کرنے میں مدد کرنے والی قابلیتوں پر ہوتا ہے۔ یہ موضوع سماجی طور طریقوں اور توقعات کی روشنی میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسی مہارتیں جو افراد کو خوش حال زندگی گزارنے اور معاشرے کے فعال اور تعمیری ارکان بننے میں معاون ہوں وہ زندگی کی مہارتیں سمجھی جاتی ہیں۔

زندگی کی صلاحیت/مہارت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "حسب منشا اور مثبت طرز عمل کی مہارتیں جو افراد کو روزمرہ کی زندگی کے مطالبات اور چیلنجوں سے موثر انداز میں نمٹنے کے قابل بناتی ہیں۔" (UNO)

اس سلسلے میں WHO (عالمی ادارہ صحت) زندگی کے مہارتوں کو سازگار اور مثبت طرز عمل کی صلاحیتوں کے طور پر بیان کرتا ہے جو افراد کو روزمرہ کی زندگی کے مطالبات اور چیلنجوں سے موثر طریقے سے نمٹنے کے اہل بناتی ہیں۔

## اہم زندگی کی صلاحیتیں/مہارتیں:

یونیسیف، یونیسکو، اور ڈبلیو ایچ او جیسے عالمی اداروں نے دس بنیادی زندگی کی مہارتوں کی فہرست اس طرح دی ہیں:

(1) خود آگاہی (2) تنقیدی سوچ/فکر (3) تخلیقی سوچ (4) فیصلہ سازی (5) مسئلے کا حل (6) موثر مواصلات

(7) باہمی تعلقات (8) ہمدردی (9) تناؤ کا مقابلہ کرنا (10) جذبات کا مقابلہ کرنا

**1. خود آگاہی:** خود آگاہی آپ کی شخصیت کا واضح تاثر ہے، جس میں قوتیں، کمزوریاں، خیالات، عقائد، ترغیب اور جذبات شامل ہیں۔ خود آگاہی آپ کو دوسرے لوگوں کو سمجھنے کی اجازت دیتی ہے کہ آپ اپنے رویوں اور دوسرے لوگوں کے ردعمل کو اس وقت کیسے سمجھتے ہیں۔

**2. تنقیدی سوچ/فکر:** تنقیدی سوچ سے مراد معلومات کا معقول تجزیہ کرنے اور معقول فیصلے کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس میں اعداد و شمار، حقائق، مشاہدہ کرنے والے واقعات اور تحقیق کے نتائج جیسے ذرائع کا جائزہ شامل ہے۔ اچھے تنقیدی مفکرین معلومات کے ایک سیٹ سے مناسب نتائج اخذ کرسکتے ہیں اور مسائل کو حل کرنے یا فیصلے کرنے کے لیے مفید اور کم مفید تفصیلات کے درمیان امتیاز کرسکتے ہیں۔

**3. تخلیقی سوچ:** تخلیقی سوچ مختلف انداز میں سوچنے کی صلاحیت ہے۔ کسی مسئلے کو دیکھنے کے لیے یا کسی نئے زاویے سے یا تناظر میں مسئلے کو سمجھنے کے لیے اس مہارت کا اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ اکثر آپ کو نیا حل تلاش کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے یا یہاں تک کہ یہ بھی دیکھنا کہ مسئلے کے حل کی ضرورت ہے یا نہیں، اس سے بھی آگاہ کراتی ہے۔ تخلیقی سوچ چیزوں کو دیکھنے یا کرنے کا ایک نیا طریقہ ہے جس کی خصوصیت کے چار اجزاء ہوتے ہیں۔

بہاؤ (نئے خیالات پیدا کرنا)، لچک (آسانی سے نقطہ نظر کو تبدیل کرنا) اصلیت (کسی نئی چیز کا تصور) اور توسیع (دوسرے خیالات کی تشکیل)۔

**4. فیصلہ سازی:** فیصلہ سازی دستیاب اختیارات میں سے ایک منطقی آپشن/ متبادل کو منتخب کرنے کا عمل ہے۔ یہ فیصلہ کی شناخت، معلومات اکٹھا کرنا، اور متبادل قراردادوں کا اندازہ کرکے انتخاب کرنے کا عمل ہے۔ مرحلہ وار فیصلہ سازی کے عمل کا استعمال آپ کو متعلقہ معلومات اور متبادل اختیارات کا اہتمام کرکے، مزید سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے میں مدد کرتا ہے۔ مختلف اختیارات کی تشخیص کے سلسلے میں ان کے اقدامات کے بارے میں اور مختلف فیصلوں کے مضمرات ہونے کے کیا امکانات ہوسکتے ہیں؟ اس سے آگاہ کراتی ہے۔ یہ مہارت ہماری زندگی کے مختلف فیصلوں سے تخلیقی انداز میں نمٹنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ مہارت ہمیں مؤثر فیصلے کرنے کا طریقہ سکھاتی ہے۔

**5. مسئلہ کا حل:** بغیر کسی رکاوٹ کے مؤثر طریقے سے اور وقت پر مسائل کے حل کرنے کی صلاحیت مسئلے کو حل کرنے کی مہارت کہلاتی ہے۔ اس میں مسئلے کی نشاندہی کرنا اور اس کی وضاحت کرنا، متبادل حل تیار کرنا، بہترین آپشن کا اندازہ اور انتخاب کرنا، اور منتخب کردہ حل پر عمل درآمد کرنا شامل ہے۔ مسئلہ کا حل کرنے سے ہمیں اپنی زندگی میں جو پریشانی پیش آتی ہے ان سے تخلیقی طور پر نمٹنے میں مدد ملتی ہے۔ اہم مسائل جو حل طلب نہیں ہیں وہ ذہنی تناؤ اور جسمانی دباؤ کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس لیے مسئلے کے حل کی مہارت ہماری زندگی میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

**6. موثر مواصلات:** موثر مواصلات کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں، زبانی اور غیر زبانی طریقوں سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے قابل ہوں۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ رائے اور خواہشات کا اظہار کرنے کے قابل ہونا، ضرورتوں اور خوبیوں کا مطالبہ کرنا۔ ساتھ ہی ضرورت کے وقت مشورے اور مدد کی درخواست کرنے کی بھی اہلیت ہونا۔

**7. باہمی تعلقات:** باہمی تعلقات میں وہ مہارتیں شامل ہیں جو ہم ہر روز استعمال کرتے ہیں، جب ہم دوسروں سے انفرادی یا اجتماعی طور پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس مہارت میں صلاحیتوں کی ایک وسیع رینج شامل ہے، خاص طور پر مواصلات کی مہارتوں میں جیسے سننا اور موثر انداز میں گفتگو کرنا ہی شامل ہے۔ اس کے برعکس باہمی تعلقات کی مہارت میں آپ کے جذبات کو قابو کرنے اور ان کو منظم کرنے کی اہلیت بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کا آغاز گھر کے افراد سے اچھے تعلقات قائم کرنے سے ہوتا ہے جو ایک اہم ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم معاشرے کے ایک اہم رکن بنتے ہیں۔ باہمی تعلقات کی مہارتیں ہمیں مثبت طریقوں سے وابستہ کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ کیونکہ ہماری ذہنی اور معاشرتی بہبود کے لیے دوستانہ تعلقات کا قیام اور اسکی برقراری بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

**8. ہمدردی:** ہمدردی، آسان لفظوں میں، دوسرے لوگوں کے احساسات اور جذبات سے آگاہی کا نام ہے۔ یہ جذباتی ذہانت کا ایک کلیدی عنصر ہے جو خود کو دوسروں سے جوڑتا ہے۔ ہمدردی وہ صلاحیت ہے جو اپنے آپ کو 'کسی اور کی جگہ' درست طریقے سے ڈھالتی ہے۔ یہ دوسرے کی صورتحال، خیالات اور احساسات کو ان کے نقطہ نظر سے سمجھنے اور اس کی تفہیم کو دوسرے شخص تک پہنچانے کی بھی اہلیت ہے۔ ایک قائد کی حیثیت سے آپ کی شخصیت میں ہمدردی کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ آپ کے اطراف کے افراد اور ان کے تاثرات اور خدشات کی درست تفہیم میں آپکے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس سے آپ کی مواصلات کی مہارت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے آپ سے کیا جاننا یا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حاصل کر بھی رہے ہیں یا نہیں؟ ہمدردی، بحیثیت ایک مہارت آپ کی زندگی کو بہت زیادہ موثر بنا سکتی ہے۔

**9. تناؤ کا مقابلہ کرنا:** "Coping" ذاتی اور باہمی پریشانیوں کو حل کرنے کے لیے شعوری کوشش اور توانائی خرچ کرنے کا عمل ہے۔ اس نظام/ میکانزم کو عام طور پر مقابلہ کرنے کی مہارت یا مقابلہ کی حکمت عملی کہا جاتا ہے۔ اصطلاح 'Coping' عام طور پر تناؤ سے نمٹنے کے لیے ہوتی ہے جو تناؤ ابھرنے کے بعد پیش آتی ہے، لیکن بہت سے لوگ تناؤ کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کرنے یا اس سے بچنے کے لیے اس کا عملی انداز میں مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس حکمت عملی کا استعمال فرد تناؤ سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ذاتی انتخاب کا تعین، شخصی خصائص اور اقسام، معاشرتی تناظر اور اس میں شامل تناؤ کی نوعیت کے اعتبار سے کرتا ہے۔ دباؤ کو کم کرنے یا ان سے نمٹنے کی تمام تر حکمت عملیوں کا مثبت یا سازگار مقصد ہوتا ہے، لیکن کچھ حکمت عملی دراصل خراب (غیر صحت مند) یا غیر موثر ہوسکتی ہے۔

تناؤ کی صورت میں، مقابلہ کرنے کے طریقہ کار سے یہ بات طے ہوتی ہے کہ طلباء روزمرہ کی زندگی میں پائے جانے والے تناؤ کو کم سے کم کرنے کے لیے اس مہارت کا استعمال کیسے کریں اور اپنی زندگی کو تناؤ سے دور کیسے رکھیں اور خوشگوار زندگی کیسے بسر کریں۔

**10. جذبات کا مقابلہ کرنا:** جذبات کا مقابلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہمارے اور دوسروں کے اندر موجود جذبات کو پہچاننا۔ جذبات رویہ کو کس طرح متاثر کرتے ہیں اس سے آگاہ ہونا۔ ہمیں مختلف حالات میں جذبات کا مناسب اور موثر جواب دینے کا اہل بننا چاہیے۔ اگر ہم نے مناسب جواب نہ دیا تو غصہ یا افسردگی جیسے شدید جذبات ہماری صحت پر منفی اثرات مرتب کرسکتے ہیں۔

جذبات کا مقابلہ کرنے میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- تاثرات پر احساسات کے اثر کو سمجھنا۔
- رویوں پر اثر انداز ہونے والے جذبات کے اثر کا ادراک کرنا اور دوسروں پر اس کے اثر کا اندازہ کرنا۔
- جذبات کے ظہور کے پیچھے جسمانی یا جسمانی تبدیلیوں کے کردار کو سمجھنا۔

اصل میں جذبات سے اچھی طرح واقف ہونا زندگی کی مہارت ہے جو صحت مند اور خوشحال زندگی کا باعث بنتی ہے۔

**زندگی کی مہارتوں/ صلاحیتوں پر مبنی تعلیم:**

زندگی کی مہارتوں پر مبنی تعلیم، (LSBE) تعلیم کی ایک قسم ہے جو ذاتی زندگی کی مہارتوں جیسے خود پسندی،

تنقیدی سوچ، مسئلے کو حل کرنے اور باہمی مہارتوں کی نشوونما پر مرکوز ہے۔ زندگی کی مہارت کی تعلیم یا تربیت نفسیاتی قابلیت اور باہمی تعلقات کو مدنظر رکھتی ہے جو طلباء کو صحیح فیصلے لینے، مسائل کا حل کرنے، تنقیدی اور تخلیقی انداز میں سوچنے، مؤثر طریقے سے بات چیت کرنے، تعمیری کام کرنے، صحت مند تعلقات قائم کرنے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے، مثبت اور نتیجہ خیز انداز میں ان کی زندگی کے چیلنجز کا مناسب انداز میں انتظام اور مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

### کمرہ جماعت میں زندگی کی مہارتوں کی تعلیم کی فراہمی:

کمرہ جماعت میں زندگی کی مہارتوں کی تعلیم کی فراہمی ایک محتاط تحقیقی موضوع رہا ہے۔ ماضی کے تحقیقی نتائج کی روشنی میں، یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ نصاب ایک اہم حصے کے طور پر زندگی کی مہارت کی تدریس کا مثبت نتیجہ نکلتا ہے۔ ایسی تحقیق کے متعدد اشارے موجود ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زندگی کی مہارتوں کو تربیتی پروگرام کے طور پر نافذ کیا جانا چاہیے، جو نوعمروں کی صحت مند نشوونما میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اس طرح زندگی کی مہارتوں پر مبنی تعلیم کی اہمیت کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے اور درج ذیل حصے میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح آسان سرگرمیوں کی مدد سے اس تعلیم کو کمرہ جماعت میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔

طلبا میں زندگی کی مہارت کو بڑھانے کے لیے مختلف تعلیمی سرگرمیوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

### کمرۂ جماعت میں بحث ومباحثے

یہ ایک ایسا عمل ہے، جس میں اساتذہ کے ذریعہ یہ سہولت فراہم کی جاتی ہے کہ کمرہ جماعت میں طلبا آزادانہ نظریہ سے کسی موضوع پر اپنے تاثرات پیش کریں۔ اس سے طلبا میں باہمی روابط کو فروغ اور نئے خیالات کی تحریک مل سکتی ہے۔ ساتھ ہی طلبا کو ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ بحث ومباحثے کے دوران، طلبا کو مختلف نقطہ نظر سے تنقیدی جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے۔ اس عمل سے طلبا میں اپنے ساتھی طلبا کے تاثرات کو سننے، سمجھنے اور ان سے ہمدردی کرنے کی مہارت کو فروغ ملتا ہے۔

### دماغی مشق

اس سے طلبا کو فوری اور بے ساختہ خیالات کی تخلیق کرنے کی سہولت ملتی ہے۔ یہ عمل طلبا کو ان کے تخیل کو استعمال کرنے میں مدد اور روایتی انداز سے ہٹ کر سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس عمل میں یہ ضروری ہے کے ہر ایک خیال کی خوبیوں اور کمیوں کا اندازہ کریں یا خیالات کو مخصوص معیار کے مطابق درجہ بند کریں۔ اس عمل سے طلبا میں تنقیدی اور تخلیقی سوچ کو فروغ ملتا ہے جو ان کی زندگی کو بہتر اور کامیاب بنا سکتی ہے۔

### کردار کی ادائیگی

عام طور پر کردار کی ادائیگی کسی مخصوص شخص یا کردار کی نقل کرنے سے وابستہ ہے۔ یہ ایک ایسی تکنیک ہے جس کی مدد سے طلبا معاون ماحول میں مختلف حکمت عملیوں کو آزمانے کے لیے منظم طریقے سے دوسرے لوگوں کے ساتھ بات چیت کر کے حقیقت پسندانہ حالات کو تلاش کرتے ہیں۔ کردار ادا کرنا کسی صورت حال، منظر نامے، یا کسی مسئلے سے متعلق کردار ادا کرنے اور کسی مخصوص حالت یا مسئلے سے گزرنے کا ایک طریقہ ہے۔

کمرہ جماعت میں تصوراتی کردار ادا کرنے سے بچوں میں معاشرتی پریشانیوں کو حل کرنے کی قابلیت بڑھے گی، جب بچے کردار ادا کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں تو یہ طریقہ ان کے سوچنے کے انداز اور ہمدردی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔

### باہمی تعاون کو ایک قدر اور مہارت کے سیٹ کے طور پر سکھائیں

آج کے نوجوانوں کو نئی مہارتوں کی ضرورت ہے جو انھیں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار کرے، نہ صرف ان کے کلاس روم یا کام کی جگہ میں بلکہ ممکنہ طور پر دنیا کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی طلبا کو ایک تخلیقی چیلنج پر مل کر کام کرنے کی ترغیب اور ان تجربات سے حاصل ہونے والی تعلیمات پر غور کرنے کے مواقع ملیں۔ اس سے انھیں باہمی تعاون اور مربوط دنیا کا حصہ بننے اور اسے بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

### تعین قدر اور تجزیہ پر مبنی تدریس

تدریس ایسی ہونی چاہیے جہاں طلبا نہ صرف یہ جانیں کہ درست معلومات کیسے حاصل کی جائیں، بلکہ ان کے قابل اعتماد ہونے کی اہلیت اور افادیت تنقیدی تجزیہ کرسکیں، اس قابل بھی ہو جائیں۔ ہم اگر 21 ویں صدی کی مہارتوں پر مبنی تدریس کو کچھ معاملات کے مطالعے کے لیے آزماتے ہیں تو طلبا ان ہنروں کو عملی جامہ پہنانے کے طریقوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ہماری تعلیم میں تحقیق پر مبنی کاموں اور منصوبوں کی تشکیل ہمارے طلبا میں اکیسویں صدی کی ضروری مہارتوں کو فروغ دینے کی ایک بنیاد فراہم کرسکتی ہے جو انھیں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے میں مدد کرے گی۔

### رواداری اور رویہ میں لچک کے لیے تعلیم

کمرہ جماعت میں رواداری اور لچک سکھانا آسان نہیں ہے لیکن یہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ رواداری اور لچک کی تعلیم، حفظ، حساب کتاب اور دیگر روایتی تدریسی طریقوں سے بالاتر ہے۔ اس میں شرکت اور مشغولیت کی ضرورت ہے۔ آج ایک بڑھتے ہوئے باہمی تعاون اور عالمی برادری میں ہم ان لوگوں کی تلاش کر رہے ہیں جو نامعلوم ثقافتوں اور نظریات کے ساتھ بات چیت کرنے کی اہلیت اور کھلے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان مہارتوں کو تیار کرنے میں طلباء کو کھلی گفتگو اور تجربات کے مواقع حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی جو انھیں دوسروں کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے گفتگو کرنے میں مدد فراہم کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے اسکول کے دورے، مباحثے کے سیشن، دوسرے تعلیمی اور سماجی اداروں کا دورہ یا مقامی حکام کے ساتھ سوال جواب وغیرہ کا انعقاد کرنا طلبا کو عملی طور پر کھلی ذہنیت کا مظاہرہ کرنے کے طریقے ہو سکتے ہیں جو طلبہ میں رواداری اور لچک فروغ دے سکتے ہیں۔

### اختتام:

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کی مہارتوں کی تعلیم موجودہ دور میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے جو طلبا کی انفرادیت اور مخصوص صلاحیتوں کی نشوونما پر زور دیتی ہے جیسے ہر فرد کے پاس حالات سے نمٹنے کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔ سوچنے کی مہارت طلبا کو زندگی کے چیلنجز سے نمٹنے میں مدد دیتی ہے۔ مسئلے کو حل کرنے اور فیصلہ سازی سوچنے کی مہارت کے کلیدی تصورات ہیں۔ طلبا کو اپنی مشکلات سے آگاہی اور ان سے نمٹنے کے لیے صحیح فیصلے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس نظام تعلیم سے ممکن ہے۔ اس تعلیم سے طلبا کو تخلیقی اور عملی طور پر سوچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ طلبا کو معاشرے میں ان کی شراکت اور ان کی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ کراتی ہے۔

زندگی کی مہارتیں 10-18 سال کی عمر کے طلبا کو نظر میں رکھتی ہیں اور ان مہارتوں کے فروغ پر زور دیتی ہیں، جو طلبا کے مختلف جذباتی، معاشرتی، جسمانی مسائل اور عوارض جیسے، کیریئر کی پریشانیوں، تعلقات کی پریشانیوں سے نمٹنے میں معاون ہوتی ہیں۔ زندگی کی مہارت کی تعلیم کردار کی تعمیر میں سہولت فراہم کرتی ہے اور معاشرے کے اقدار کو محفوظ رکھتی ہے اور ایک مضبوط اور مثبت مستقبل کے شہری پیدا کرنے میں معاون ہے جو معاشرے میں اپنا کردار بخوبی ادا کریں گے۔

■

**Dr. Pathan Md Wasim Md. Shabbir**
MANUU CTE, Darbhanga, Ilyas Ashraf Nagar
Chandan Patti, Laheria Sarai
Darbhanga - 846001 (Bihar)

شمیم احمد صدیقی

# رباعی کی نشاۃِ ثانیہ

اہل فن فرماتے ہیں کہ کسی خاص موضوع پر چار باہم مربوط مصرعوں پر مشتمل وہ مختصر نظم جس کے مصرعے بحر ہزج کے چوبیس متفقہ اوزان میں سے ایک یا زائد اوزان کا پابند رہ کر کہے گئے ہوں رباعی کہلاتی ہے۔ لفظ رباعی عربی لفظ 'ربع' سے ماخوذ ہے جب کہ غزل کی طرح اُردو رباعی بھی فارسی شاعری کی ہی دین ہے البتہ اہل فارس اس کو 'ترانہ' یا 'دوبیتی' کہہ کر پکارتے رہے ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح ایک اچھی رباعی بھی اپنے موضوع کی فکری بلندی کے ساتھ نغمگی، رعنائی اور دلگدازی سے لبریز الفاظ کو سلیقے سے برتنے پر ہی وجود میں آتی ہے۔ اپنی مخصوص بحر اور اوزان کی قید کی بنا پر رباعی گوئی غزل، قطعہ یا دیگر اصنافِ سخن سے قدرے مشکل ہے۔ اسی لیے اکثر شعرائے کرام نے برسوں کے ریاضِ سخن کے بعد ہی رباعی گوئی کا قصد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا خیال تھا کہ ''شاعر جب بوڑھا اور کامل الفن ہو جاتا ہے تب رُباعی کہتا ہے، رُباعی کہنا آسان نہیں'' اور جوش ملیح آبادی نے اعلان کیا تھا کہ ''یہ وہ کمبخت صنفِ سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس و متفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں اُلٹ دیتی۔'' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر فن اُسی وقت تک مشکل رہتا ہے جب تک انسان اس کو مشکل تصور کرتے ہوئے سیکھنے سے گریز کرتا ہے۔ اسی لیے داناپور (صوبۂ بہار) کے بزرگ فارسی استاد اور مشہور رُباعی گو شاعر پروفیسر طلحہ رضوی برق نے کشمیری نوجوان شاعر سلیم ساغر کے مجموعۂ رُباعی 'رقص طاؤس' پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ اگلوں نے رُباعی کو ہوّا بنا کر کیوں رکھ دیا تھا۔ کہتے رہے بہت دشوار صنف ہے، بڑے مشکل اوزان ہیں۔'' مزید یہ کہ دورِ حاضر کے مشہور ترین رباعی گو استاد ناوک حمزہ پوری اپنی ایک تقریظ میں اس طرح رقم طراز ہیں کہ ''یہ قول جسے اکثر ناقدین نے دہرایا ہے کہ رباعی گوئی سخت مشکل فن ہے، بے حد گمراہ کن ہے۔ جہاں تک مشق و مزاولت کا سوال ہے تو وہ ہر فنی مہارت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے، خواہ غزل ہو خواہ رباعی۔''

رباعی میں عموماً پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ مقفّٰی یعنی ہم قافیہ رکھا جاتا ہے جب کہ تیسرا مصرعہ غیر مقفّٰی ہوتا ہے۔ چوتھا مصرعہ دیگر تین کے مقابلہ زیادہ چُست ہوتا ہے اور ابتدائی تین مصرعے ضروری زمین تیار کرتے ہیں تاکہ آخری مصرعہ میں بات مکمل کی جاسکے۔

اردو رباعی ابتدا میں صرف حمد و نعت تک محدود تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں عارفانہ، اخلاقی، اصلاحی، رثائی اور دیگر موضوعات کی شمولیت ہوئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک بیشتر اساتذۂ سخن نے رُباعی کو سنجیدہ موضوعات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا لیکن دورِ حاضر کی رُباعی ہر قسم کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً 19 ویں صدی میں کہی گئی مولوی اسماعیل میرٹھی اور بہاری لال رمزکی اور 20 ویں صدی میں کہی گئی جوش ملیح آبادی کی ایک ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہر خواہش و عرض و التجا سے توبہ
ہر فکر سے ذکر سے دعا سے توبہ
از بس کہ محال ہے سمجھنا اُس کا
جو آئے سمجھ میں اس خدا سے توبہ

(اسماعیل)

دھوکے میں گئی ہماری دنیا افسوس
دنیا کے مزے میں دین بگڑا افسوس
ان شیخ و برہمن نے دیا دھوکہ رمز
مفت آپ کو اس آگ میں جھونکا افسوس

(رمز)

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

(جوش)

رباعی کے تیسرے مصرعہ کو غیر مقفّٰی رکھنا لازمی نہیں ہے۔ رُباعی گو کو اپنی بات کہنے

میں آسانی فراہم کرنے کے لیے اس کو غیر مقفّٰی رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر کسی رباعی کے چاروں مصرعے مقفّٰی ہوں اور اس انداز پر تخلیق کیے گئے ہوں کہ اُن کی ترتیب بدل دینے پر بھی رباعی کے معنی اور حسن میں فرق نہ آئے تو ایسی رباعی کو مدوّر رباعی کہتے ہیں مثلاً یہ رباعی دیکھیں۔

یہ موج یہ دریا یہ کنارہ کیا ہے — یہ پھول یہ شبنم یہ شرارہ کیا ہے
ہم خوب سمجھتے ہیں اشارہ کیا ہے — یہ چاند یہ سورج یہ ستارہ کیا ہے
(ظہور منصوری نگاہ)

محض چھ رباعیات میں تمام چوبیس اوزان کے حامل مصرعے تخلیق کرنے والے شاعر کو فنِ رُباعی گوئی میں مشاق ہونے کی سند دی جاتی ہے۔

شعرائے قدیم میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، عادل شاہ، سراج وغیرہم کے یہاں خاصی تعداد میں رباعیات ملتی ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے شعرا میں میر انیس، مرزا دبیر، حالی، اکبر الہ آبادی، جوش ملیح آبادی، امجد حیدر آبادی، جگت موہن لال رواں، فراق گورکھپوری وغیرہ نے کثیر تعداد میں رباعیات کہی ہیں اور اُن کی رباعیات میں اُن کے مزاجِ شاعری کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً میر انیس اور امجد کی بیشتر رباعیات میں فلسفۂ حیات اور فکرِ آخرت کو نظم کیا گیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی رُباعیات میں رنگِ ظرافت نمایاں ہے البتہ محشر عنایتی، جاں نثار اختر اور فراق نے خصوصیت سے عورت کے مختلف روپ، اور اس کے جذبات کو رباعیات کا پیکر عطا کیا ہے۔ محشر عنایتی نے دیہات کی عورت کے خیالات اور اعمال کی عکاسی کی ہے۔ جاں نثار اختر نے گھر آنگن کی عمدہ مصوری کی ہے جب کہ فراق نے مشرقی عورت کے رنگا رنگ روپوں کو بیان کرنے میں ہندو اساطیر کو اجاگر کیا ہے۔ چونکہ مذکورہ تینوں شعرا نے مشرقی عورت کو محور بنا کر رباعی کی اوّلین نشاۃ ثانیہ کی ہے لہٰذا ہم ذیل میں اُن کی ایک ایک رباعی بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

موسل دھمکے ہر ایک چوڑی کھنکے — دانوں کے سمیٹنے میں پائل چھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ — جس طرح پکھاوج پہ مجیرا جھنکے
(محشر عنایتی)

دیکھے مرے شانے پہ چپاں کوئی بال — اس لمحے کو اس کا غیر ہو جاتا ہے حال
یکبارگی اُس کے سوکھتے ہونٹوں پر — رہ جاتے ہیں کپکپاتے کتنے ہی سوال
(جاں نثار اختر)

چہرے پہ ہوائیاں نگاہوں میں ہراس — ساجن کے برہ میں روپ کتنا ہے اداس
مکھڑے پہ دھواں دھواں لٹاؤں کی طرح — بکھرے ہوئے بال ہیں کہ سیتا بن باس
(فراق)

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل گو شعرا کے مقابلے رُباعی گو شعرا کی تعداد پانچ فیصد بھی نہیں ہے۔ بعض شعرا نے غزلیات کے کئی کئی مجموعے شائع کرائے جن میں سے ہر ایک میں پچاسوں غزلیات اور ہزاروں اشعار شامل ہیں لیکن جہاں تک رباعیات کا تعلق ہے انھوں نے معدودے چند رباعیات تخلیق کر کے خود کو رباعی گو شعرا کی فہرست میں شامل کرالیا۔ چنانچہ ہمارے ناقص علم کے مطابق کلیاتِ فیض میں ایک بھی رباعی نہیں ہے۔ کلیاتِ جگر مراد آبادی میں اتفاقاً قطعات کے ساتھ ایک رباعی بھی راہ پا گئی ہے۔ حسرت موہانی کے تیرہ مجموعہ ہائے کلام اور بہادر شاہ ظفر کے ضخیم کلیات میں محض تین تین رباعیات ہی ملتی ہیں۔ رباعی کے تئیں اس قدر بے اعتنائی کے باوجود بعض شعرا نے ربّ کائنات کی عطا کردہ صلاحیت کو دیگر اصنافِ سخن کی تخلیق پر صرف کرنے کے ساتھ رباعی کے ساتھ بھی خوب انصاف کیا ہے۔ چنانچہ دورِ حاضر میں ناوک حمزہ پوری، عادل اسیر (مرحوم)، کوثر صدیقی، ظفر کمالی، عبدالحق امام اور عبدالمتین جامی اب تک ایک ہزار سے زائد رباعیات کہہ چکے ہیں جبکہ حافظ کرناٹکی بلا مبالغہ آٹھ ہزار سے زائد رباعیات کی تخلیق کر کے تمام رباعی گو شاعروں کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں اور ان کے قلم کی روانی ہنوز روز افزوں ہے۔ جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے تو انھوں نے بھی رباعیات کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ صدی میں جے پور کی اُمّ مشتاق پروین، ممبئی کی مریم غزالہ اور حیدر آباد کی رحیمہ بانو نے بھی خاصی رباعیات کہہ کر اس قول کو باطل ثابت کیا تھا کہ ”رباعی بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے۔“ موجودہ دور میں بریلی کی ڈاکٹر شگفتہ غزل نے پولیس محکمہ کی سخت ڈیوٹی نبھاتے ہوئے نہ صرف اپنی غزلیات کے ذریعہ سخن شناس قلوب کو متاثر کیا ہے بلکہ اپنی رباعیات کے ذریعہ بھی اپنی سخن دانی کا لوہا منوایا ہے۔ ہم اُن کی ایک رباعی نذرِ ناظرین کر رہے ہیں۔

ہستی کو کچھ اس طور سنوارا جائے — کردار کو شیشے میں اتارا جائے
جس وقت پرکھنے کا سوال آئے غزل — سچائی پہ ہر جھوٹ کو وارا جائے

راقم الحروف نے 2011 کے آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ایک استاد کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے مدارس کے طلبا کے مابین ہونے والے بیت بازی مقابلوں میں کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے رباعیات کا ایک ایسا انوکھا مجموعہ مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا جس میں تمام حروفِ تہجّی کو بطور حرفِ ردیف بھی پیش کیا جانا تھا اور بطور ابتدائی حرف بھی اور ساتھ ہی اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا تھا کہ زیادہ تر رباعیات سنجیدہ عناوین کی حامل ہوں۔ عاشقانہ یا رومانی موضوعات والی رباعیات کو انتہائی مجبوری میں ہی شامل کیا جائے۔ بہ الفاظِ دیگر صاف ستھری اور متین رباعیات پر مشتمل اُولاً دیوان مرتب کرنے کی نیت کی تھی۔ اس وقت قدیم و جدید شعرا کے دستیاب دواوین رباعیات نیز مجموعہ ہائے کلام میں شامل رباعیات کو کھنگالنے اور ان کو اوّل و آخر حروف کا لحاظ کرتے ہوئے ترتیب وار درج کرنے کا صبر آزما کام کرنا پڑا تھا۔ اپنی مطلوبہ رباعیات کی کھوج و جستجو کے دوران بندے پر یہ بات آشکار ہوئی تھی کہ اُس وقت تک شائع ہوئے دواوینِ رباعیات کی مجموعی تعداد کم و بیش ایک درجن ہی تھی۔ اُن دواوین اور دیگر مجموعہ ہائے کلام سے اپنی مطلوبہ رباعیات منتخب کرنے کے بعد بھی خاصی تعداد میں اُن رباعیات کو تخلیق کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایسے حروف سے شروع ہونے والی یا اُن پر تمام ہونے والی تھیں جن پر شعرائے کرام برائے نام ہی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مثلاً ث، ڈ، ذ، ط، ظ، ع، غ وغیرہ۔ لہٰذا بندے نے کم و بیش دو درجن رباعی گو شعرا سے درخواست کر کے کئی سو مطلوبہ رباعیات تخلیق کرائیں۔ اپنی فرمائش پر تخلیق کرائی گئی اس طرح کی چار رباعیات درج ذیل ہیں۔

ٹکرایا نظر سے نور کا اک منبع — اور پھوٹ پڑا سرور کا اک منبع
دنیا کی خبر رہی نہ کچھ ہوش اپنا — کیا کر گیا کوہِ طور کا اک منبع
(ڈاکٹر راشد عزیز سنبھلی)

ثابت ہے کہ بد نظر بھی ہیں انساں بعض — اس میں ہیں قدیم ہی سے سرگرداں بعض
گر نفس کے چنگل میں پھنسے عقلِ سلیم — ہو جاتے ہیں جان بوجھ کر انجاں بعض
(شاہ حسین نہری اورنگ آبادی)

ڈھونڈو مرے اشعار میں کوئی تنقیص — دے گی مجھے راہیں نئی مری تنقیص
تم اپنی ہی تسکیں کے لیے پیش کرو — شہرت کا جو باعث بنے ایسی تنقیص
(ظفر نسیمی بھوپالی)

ظلم اور جفا کا کبھی انجام بھی سوچ　　مٹ جائے گا دنیا سے ترا نام بھی، سوچ
احسان کے بدلے ہیں خدا کے احسان　　وعدہ ہے یہ قرآن میں انعام بھی سوچ
(ناز پرتا بگڈھی)

2015 میں شائع کرائے گئے مذکورہ اولان و دیوان رُباعیات کا نام 'گنجینۂ رُباعیات' رکھا گیا اور اس میں 'ژ' اور 'ڑ' کو چھوڑ کر تقطیع کے بقیہ 33 حروف سے شروع ہوکر ہر حرف پر تمام ہونے والی کم از کم دو رُباعیات ضرور شامل ہیں۔ اس طرح ڈھائی سو شعراء کی ڈھائی ہزار سے زائد رُباعیات ہیں۔ خاکسار کی اس تگ و دو کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کئی وہ رباعی گو شعرا جو برسوں سے رباعی کہہ رہے تھے انھوں نے اپنی رباعیات کے مجموعے شائع کرانے کی نیت کی اور کئی شعرا نے جنھوں نے بندے کی درخواست پر غیر مانوس حروف سے شروع ہونے والی یا ان پر تمام ہونے والی رباعیات تخلیق کر کے خاکسار کی مدد کی۔ اُن کو اپنی رباعیات کے دواوین شائع کرانے کی تحریک ملی۔ یہی وجہ ہے کہ 2012 اور 2018 کے قلیل دورانیہ میں کئی عدد مجموعہ ہائے رباعیات اور دواوین رباعیات منظر عام پر آئے۔ نیز یہ کہ حافظ کرناٹکی کی فکر سے کرناٹک کے مدارس میں منعقد ہونے والے بیت بازی مقابلوں میں رُباعیات کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ لکھنؤ کے مدارس اور کالجوں کے بیت بازی مقابلوں میں بھی رُباعی گوئی فروغ پا رہی ہے۔ اسی لیے اورنگ آباد کے بزرگ شاعر شاہ حسین نہری نے برملا اعتراف کیا ہے کہ 'گنجینۂ رُباعیات' کی بدولت رباعی کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے۔ ہم ذیل میں 2012 اور 2018 کے وقفہ میں صرف ہندوستان میں منصۂ شہود پر آئے مجموعہ ہائے رباعیات اور دواوین رباعیات کے نام مع تخلیق کار شاعر کے نام و مقام نیز اُن میں پیش کی گئی رباعیات کی تعداد کو فہرست وار درج کر رہے ہیں۔

## فہرست اوّل - مجموعہ ہائے رباعیات

| شمار | مجموعۂ رباعی | شاعر | مقام | سن اشاعت | تعداد رباعیات |
|---|---|---|---|---|---|
| (1) | طلسموں کے چراغ | طہور منصوری نگاہ | ریوا (ایم پی) | 2012 | 332 |
| (2) | جگنوؤں کے چراغ | طہور منصوری نگاہ | ریوا (ایم پی) | 2015 | 348 |
| (3) | گلبدن کی یاد میں | شاہ حسین نہری | اورنگ آباد (مہاراشٹر) | 2012 | 76 |
| (4) | صفر | ڈاکٹر ساغر جیدی | کڈپا (مہاراشٹر) | 2012 | 214 |
| (5) | رباعیات ظفر | ظفر کمالی | سیوان (بہار) | 2013 | 541 |
| (6) | چہکاریں (بچوں کے لیے) | ظفر کمالی | سیوان (بہار) | 2014 | 267 |
| (7) | شام کے قریب | ڈاکٹر قمر رئیس | بہرائچ (یوپی) | 2014 | 299 |
| (8) | بساطِ سخن | عبدالمتین جامی | کٹک (اڑیسہ) | 2014 | 460 |
| (9) | مونسِ سخن | عبدالمتین جامی | کٹک (اڑیسہ) | 2016 | 465 |
| (10) | رشحات اصغر | اصغر ویلوری | چنئی (تامل ناڈو) | 2014 | 212 |
| (11) | حمدیہ رُباعیات | اصغر ویلوری | چنئی (تامل ناڈو) | 2014 | 68 |
| (12) | آسماں اور بھی ہیں | اصغر ویلوری | چنئی (تامل ناڈو) | 2016 | 90 |
| (13) | لفظوں کی زبان | اصغر ویلوری | چنئی (تامل ناڈو) | 2018 | 152 |
| (14) | رباعیات حافظ (دوم) | حافظ کرناٹکی | شکاری پور (کرناٹک) | 2015 | 1680 |
| (15) | رباعیات حافظ (سوم) | حافظ کرناٹکی | شکاری پور (کرناٹک) | 2016 | 950 |
| (16) | رباعیات حافظ (چہارم) | حافظ کرناٹکی | شکاری پور (کرناٹک) | 2016 | 1071 |
| (17) | فانوس | کوثر صدیقی | بھوپال (ایم پی) | 2015 | 381 |
| (18) | قندیل | کوثر صدیقی | بھوپال (ایم پی) | 2016 | 452 |
| (19) | رقصِ طاؤس | سلیم ساغر | پانپور (کشمیر) | 2017 | 253 |
| (20) | ناقیاں (بچوں کے لیے) | ڈاکٹر التفات امجدی | سیوان (بہار) | 2013 | 140 |
| (21) | خوشبو کی آواز | خوشبو پروین | بھاگلپور (بہار) | 2018 | 101 |
| (22) | باتیں | ابو اُسامہ آدم | مالیگاؤ (مہاراشٹر) | 2018 | 183 |

## فہرست دوم - دواوین رباعیات

| شمار | دیوان رباعی | شاعر | مقام | سن اشاعت | تعداد رباعیات |
|---|---|---|---|---|---|
| (1) | ہزار رنگ (اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن) | ناوک حمزہ پوری | شیرگھاٹی (بہار) | 2013 | 1296 |
| (2) | دواوین رباعیات | ڈاکٹر صابر سنبھلی | سنبھل (یوپی) | 2013 | 333 |
| (3) | رباعیات کے چار دیوان | ڈاکٹر صابر سنبھلی | سنبھل (یوپی) | 2015 | 252 |
| (4) | رباعیات کے تین دیوان | ڈاکٹر صابر سنبھلی | سنبھل (یوپی) | 2017 | 362 |
| (5) | احساس و ادراک | ڈاکٹر مقبول احمد مقبول | اودگیر (مہاراشٹر) | 2015 | 244 |
| (6) | ترانۂ جاوید | عبدالمتین جامی | کٹک (اڑیسہ) | 2016 | 465 |
| (7) | انجیلِ خیال | سراج العارفین سراج | بنارس (یوپی) | 2016 | 786 |
| (8) | نیرنگ رُباعی | ڈاکٹر عبدالحق امام | گورکھپور (یوپی) | 2017 | 2810 |
| (9) | خاکِ جستجو | ظفر کمالی | سیوان (بہار) | 2017 | 719 |

مذکورہ بالا دونوں فہرستیں اس امر کی غماز ہیں کہ گذشتہ پانچ چھ برس کے وقفہ میں رباعی کی جانب شعرا کے التفات میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ دورِ حاضر کے کئی شعرا ہزار سے زائد رباعیات تخلیق کر چکے ہیں جب کہ حافظ کرناٹکی کے کھاتے میں آٹھ ہزار سے زائد رباعیات جمع ہو چکی ہیں اور تا حال اُن کے قلم پر کسی قسم کی تھکن ظاہر نہیں ہوتی۔ بہ الفاظ دگر رباعی گوئی کو ہوّا بنانے والے ناقدین کو انھوں نے آئینہ دکھا دیا ہے۔ اگر صنفِ رباعی انتہائی مشکل صنف ہوتی تو آج کی نوجوان نسل قطعی اس میدان میں قدم نہ رکھتی۔ ہمارے علم کے مطابق بھاگلپور کے ڈاکٹر اسلم پرویز، سیوان کے ڈاکٹر التفات امجدی، کشمیر کے سلیم ساغر، بنارس کے سراج العارفین سراج، رائے بریلی کے سدھیر بیکس اور نگینہ کے اطہر شکیل ایسے نوجوان ہیں جو اُردو درس و تدریس سے وابستہ نہ رہ کر بھی شمع رباعی کی لو کو تیز تر کرنے کے لیے اپنا خونِ جگر جلا رہے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام حقائق کے باوجود یہ بھی ایک المیہ ہی کہا جائے گا کہ ہماری دانش گاہوں کے نصابِ تعلیم میں رباعی کے ساتھ بڑی نا انصافی کی گئی ہے۔ چنانچہ بعض جامعات کے نصابِ تعلیم میں اس اہم صنفِ سخن کے ساتھ Persona non grata (یعنی انتہائی ناپسندیدہ شخص) جیسا سلوک کیا جاتا ہے اس کی تعلیم واجبی سی ہی ہوتی ہے۔

■

**Dr. Shameem Ahmad Siddiqui**
Naseem Manzil, Madag Ganj
Police Chowki, Seetapur Road
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.:09307065182

# حماد انجم کی رباعی نگاری

شمس کمال انجم

حماد انجم ایڈووکیٹ نے مشرقی یوپی کے قصبہ لوہرن بازار ضلع سنت کبیر نگر میں 1956 میں ایک پڑھے لکھے گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد محترم مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم (1932-2013) ایک متنوع الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ حماد انجم نے اپنے والد کے زیر سایہ 1972 میں اس وقت میدان شعروسخن میں قدم رکھا جب وہ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ شاعری کا آغاز حمد ونعت سے کیا۔ اس کے بعد شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ 'بہار حمد' کے نام سے آپ کا سب سے پہلا شعری مجموعہ دسمبر 1981 کے اخیر میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد 'شمع حرا' کے عنوان سے 1989 میں ان کا دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا جو نعتوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد 'خوشۂ کشت حرم' کے عنوان سے حمد ونعت اور نظموں کا تیسرا مجموعہ 2006 میں اور 'شاخ گل تر' کے نام سے 2008 میں ایک اور شعری مجموعہ منظر عام پر آیا جس میں حمد ونعت کے علاوہ میر وغالب کی زمینوں میں کہی گئی غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ 2014 میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ 'نورنادیدہ' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ آپ پیشے سے وکیل تھے مگر شعروشاعری ہی آپ کی اصل شناخت تھی۔ آپ کے مقالات کا مجموعہ 'مقالات حماد انجم' کے نام سے اسی سال 2020 میں منظر عام پر آیا ہے۔ فروری 2015 میں مختصر علالت کے بعد انسٹھ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہوجانے سے آپ کا انتقال ہوا۔

آپ نے حمد ونعت، غزلیں، نظمیں (پابند اور آزاد)، گیت، رباعی، قطعات، ثلاثی، دوہے، ہائیکو، ماہیے اور ترانے جیسی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ رباعی کا ایک مجموعہ آپ نے 'ربط بردوش' کے عنوان سے مرتب کیا تھا مگر وہ ابھی بھی تشنۂ طباعت ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم حماد انجم کی رباعیات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

رباعی اردو شاعری کی ایک معتبر صنف سخن ہے۔ قطعہ کی طرح رباعی بھی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ قطعہ کے برخلاف رباعی کے اپنے مخصوص اوزان ہیں جن میں رباعی کہی جاتی ہے۔ یہ ایک مشکل صنف ہے جو ہر کس وناکس کے زیر دام نہیں آتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کے بقول ''رباعی چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد ہی قابو میں آتی ہے۔'' رباعی کے بارے میں حماد انجم اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''رباعی شاعری کی مشکل ترین اور دشوار صنف ہے۔ یہ کوزے میں دریا کو سمونے کا کام ہے۔ رباعی کا پیکر بڑا ٹھیٹھ اور آرٹ بہت دقت طلب ہوتا ہے۔ لفظوں کے برتاؤ، نزاکت وموسیقیت میں توازن قائم ہونا چاہیے۔ چاروں مصرعوں کو باہم

مربوط اور ایک سانچے کا ڈھلا اور ایک کانٹے کا تلا ہوا ہونا چاہیے ورنہ لطافت زائل ہوسکتی ہے۔ تیسرے مصرعے میں اسی عروج کی طرف لطیف اشارہ ہونا چاہیے جسے چوتھے مصرعے میں بے نقاب کیا جاتا ہے۔ جو شاعر تیسرا مصرع جتنی قوت سے کہے گا وہ رباعی کے آرٹ کا اتنا بڑا ماہر ہوگا۔ اردو کے مشہور رباعی نگاروں کے یہاں یہ جمال وجلال درجۂ کمال پہ نظر آتا ہے''۔ (مقالات حماد انجم ص 182) مزید لکھتے ہیں: ''شروع سے لے کر آج تک بہت سارے شاعروں نے اس فن میں ہنر آزمائی کی اور نام بھی کمایا۔ بہت سارے رباعی نگاروں کی طرح حماد انجم نے بھی بہت ساری رباعیاں کہی ہیں۔''

حماد انجم کی رباعیاں مختلف موضوعات ومضامین کو محیط ہیں۔ حمد و نعت، سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے مختلف مسائل وموضوعات کو انھوں نے اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا ہے۔ کچھ رباعیاں ایسی ہیں جنھیں انھوں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ مقالات حماد انجم میں 'میری رباعی' کا نام دیا ہے۔ یہ رباعیاں گویا فی نفسہ رباعی کی تعریف وتوصیف بھی ہیں۔ ان کی رباعی گوئی کے فکروفن کا اشاریہ بھی ہیں۔ کہتے ہیں۔

برگِ گل و لالہ ہے رباعی میری!
مہتاب کا ہالا ہے رباعی میری
پھولوں کا ستاروں کا ہے سنگم اس میں
خوشبو ہے، اجالا ہے رباعی میری

.............

الہام ہے آمد ہے رباعی میری
بے ساختہ سر زد ہے رباعی میری
تم جو بھی کہوگے وہ سنائی دے گا
آواز کا گنبد ہے رباعی میری

.............

غالب کی غزل ہے کہ رباعی میری
کاغذ پہ کنول ہے کہ رباعی میری
اک حسن پہ سو حسن فدا ہے انجم
یہ تاج محل ہے کہ رباعی میری

یہ رباعیاں حماد انجم کی رباعی گوئی کے معیار کا تعین کرتی ہیں۔ یہ سادی رباعیاں نہیں ہیں۔ ان میں شعریت ہے، معنویت ہے، تہہ داری ہے۔ یہ رباعیاں حماد انجم کی رباعیوں کا قصیدہ بھی ہیں اور ان کی رباعی گوئی پر قدرت کا تعلیانہ اظہار بھی۔

پہلی رباعی میں حماد انجم کہتے ہیں کہ ان کی رباعیاں یوں ہی سادی سی نہیں ہوتیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی رباعی کو عام درختوں کے پتوں سے نہیں بلکہ گل ولالہ کی پتیوں سے تشبیہ دی ہے۔ گل ولالہ خوشبو سے بھرے ہوتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں انھوں نے اپنی رباعیوں کو چاند کے ہالے سے تشبیہ دی ہے۔ چاند تو فی نفسہ حسن وجمال کا استعارہ ہے۔ اور اگر چاند کا ہالہ ہی کہیں بنا دیا جائے تو موسم کتنا کیف آگیں بن جاتا ہے۔ یہی حال ان کی رباعیوں کا ہے۔ یہ رباعیاں نہیں مہتاب کا ہالہ ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعے میں رباعی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ ان دونوں مصرعوں میں لف ونشر مرتب کی صنعت پائی جاتی ہے۔

دوسری رباعی میں شاعر نے اپنی رباعی کو الہام اور آمد کہا ہے۔ اسے آواز کے گنبد سے تشبیہ دی ہے۔ اپنی رباعیوں کو الہام اور آمد کہہ کر شاعر نے دو باتیں کہنی چاہی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ رباعیاں اللہ تعالی کی طرف سے الہام ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان میں بڑا فنی کمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان رباعیوں کو کہنے کے لیے کسی غور وفکر یا شاعرانہ ماحول اور فضا بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ برجستہ نازل ہوتی ہیں اور پھر تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں اس رباعی کا خلاصہ یوں پیش کیا گیا ہے کہ میری یہ رباعیاں جام جمشید کی طرح آواز کے گنبد سے عبارت ہیں۔ ان میں آپ جو بولیں گے وہی سنائی دے گا۔

تیسری رباعی میں شاعر نے اپنی رباعی کو غالب کی غزل اور تاج محل سے تشبیہ دی ہے۔ آپ بتائیے کہ اردو شاعری میں غالب کی غزل اور ہندوستان کی تاریخ میں تاج محل سے بھی بڑی کوئی اور چیز ہوسکتی ہے؟ شاعر کہتا ہے کہ میری رباعیاں بالکل غالب کی غزلوں کی طرح بے انتہا معنی خیز اور شعریت سے معمور ہوتی ہیں۔ میری رباعیوں کا ایک ایک لفظ کاغذ پہ اس طرح کھلا کھلا سا لگتا ہے جیسے کنول کھلا ہوا ہو۔ اور پھر اس کی معنویت دیکھیے کہ یہ بالکل تاج محل کی طرح بے انتہا حسین وجمیل ہیں اتنی حسین وجمیل اور ذو معنی کہ ان پر ساری دنیا کا جمال فدا ہوجائے۔

ایک نعتیہ رباعی بھی ملاحظہ کریں۔

وہ مہرِ عرب ماہِ عجم نجمِ ہُدیٰ
وہ ابرِ کرم کالی گھٹا بادِ صبا!
سرسبز ہے شاداب ہے موسم اس کا
وہ نکہتِ گل بُوئے ختن رنگ حنا

اس رباعی میں شاعر نے رسول اکرمؐ کی نعت کے پیرائے میں آپ کی تعریف وتوصیف کی موتیاں بکھیری ہیں اور مہر عرب، ماہ عجم، نجم ہدیٰ، ابر کرم، کالی گھٹا، باد صبا، نکہت گل، بوئے ختن اور رنگ حنا کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ چار مصرعوں میں دس استعاروں کا استعمال شاعرانہ ہنرمندی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ شاعر کہتا ہے کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اتنے خوب صورت ہیں کہ وہ عرب وعجم کے چاند ہیں، ہدایت کا ستارہ ہیں۔ عرب وعجم کے چاند سے شاعر نے رسالت مآب کی جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ کسی خاص خطے کے نہیں، کسی خاص طبقے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی روشنی سارے عالم کے لیے ہے۔ آپ پوری دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ جس طرح چاند جب نکلتا ہے تو عرب وعجم ہر جگہ طلوع ہوتا ہے، اسی طرح مہر رسالت بھی عرب وعجم سب کو محیط ہے۔ دوسرے مصرعے میں آپ کو ابر کرم، کالی گھٹا اور باد صبا کہہ کر یہ مراد لیا گیا ہے کہ آپ کی رحمت وسیع تر تھی۔ ہر کس وناکس، اپنے اور غیر سب کے لیے اسی طرح تھی جس طرح کہ بارش جب برستی ہے تو کائنات کی ہر شے اس سے مستفید ہوتی ہے۔ تیسرے مصرعے میں شاعر نے کہا کہ آپ کی بعثت کے بعد موسم انسانیت سرسبز وشاداب ہوگیا۔ اور آپ نکہت گل، بوئے ختن بن کر ساری دنیا کو مہکا گئے۔ رنگ حنا کی طرح ساری دنیا کی ہتھیلیوں کو رنگ ونور سے آراستہ کر گئے۔ نکہت گل، بوئے ختن اور رنگ حنا کا استعارہ بھی بے انتہا بلیغ ہے۔

حماد انجم کی رباعیوں کے موضوعات عصری حسیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے شاعر جس سماج میں سانس لیتا ہے اسی سماج کے مسائل کو آئینہ دکھاتا ہے۔ شیخ وبرہمن پر طنز کے تیر برسانے کی ایک قدیم روایت رہی ہے۔ حماد انجم کی غزلوں میں بھی ہم نے اس موضوع پر کئی اشعار دیکھے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے ایسی کئی رباعیاں کہی ہیں جن میں شیخ وبرہمن، علماء اور داعیوں پر طنز کیا گیا ہے۔ کچھ رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ لہو و لعب ہے میاں فتویٰ تو نہیں
مذہب ہے کوئی کھیل تماشہ تو نہیں
دنیا کے لیے دین کا سودا انجم
فتنہ ہے، خبردار! یہ تقویٰ تو نہیں

.............

وہ عیب سے آگاہ بھی ہو سکتا ہے
ضیغم کوئی روباہ بھی ہو سکتا ہے
ناصح نہ داعی ہو تو مدعو انجم
خطرہ ہے کہ گمراہ بھی ہو سکتا ہے

حماد انجم نے جہاں سماج کے نہایت معتبر طبقے شیخ وملا پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔ وہیں آج کے شاعروں کی بھی انھوں نے خبر لی ہے۔ ادب کے گرتے معیار پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اور اس حوالے سے انھوں نے کئی رباعیاں کہی

ہیں۔ کچھ رباعیات اس طرح ہیں۔

لفظوں میں غزالوں کا تو رم رہنے دو
پھولوں کے تبسم کا بھرم رہنے دو
ہر بات سلیقے سے کہو تم ورنہ
یہ پرورشِ لوح و قلم رہنے دو

............

محفل میں وہ یارائے تحمل نہ رہا
چہروں پہ تو غازہ ہے تجمل نہ رہا
ہیں میر تقی میر پشیماں انجم
غزلوں میں ذرا سا بھی تغزل نہ رہا

............

بلّور کے ساغر کو ذرا چھلکا دو
نافے کو نئے ڈھنگ سے تم مہکا دو!
ہے آج نمائش سرِ بازار ہنر
الفاظ کو معنی کی قبا پہنا دو!

یہاں 'لفظوں میں' استعارہ ہے۔ اصناف شعر و سخن کا اور غزالوں کا رم استعارہ ہے تخیل کی بلندی اور احساس کی نزاکت وندرت کا۔ پھولوں کا تبسم استعارہ ہے شعر کے اسلوب اور اظہار کے طریقے کا۔ شاعر شعرا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ شاعری ایسی کرو کہ اس کے مضامین دل میں گھر کر جائیں۔ پڑھنے یا سننے والے کو لگے جیسے یہ کوئی شعر نہیں غزالوں کا نافہ زار کھل گیا ہے اور شعر کو سن کر یا پڑھ کر مشام جاں معطر ہوگیا ہے۔ احساس کے ساتھ اظہار میں فکر کے ساتھ اسلوب میں ایسی کشش ہو کہ شعر سن کر ہر کوئی اس کی بھینی بھینی خوشبو سے مدہوش و سرمست نظر آئے۔ وہ یہ سمجھے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر کوئی شاعر اس طرح شعر کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ سلیقے سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا ہے تو پرورش لوح و قلم اس کے بس کی بات نہیں۔ اسے یہ مشغلہ چھوڑ دینا چاہیے۔ وقت کے ضیاع کے علاوہ اسے کچھ ہاتھ آنے والا نہیں۔ آج کی شاعری دیکھ کر حیرت زدہ ہیں۔ شکوہ کناں ہیں کہ آخر یہ کیسی شاعری ہے۔ کیسا کلام تخلیق کیا جارہا ہے جسے غزل تو نام دیا جاتا ہے لیکن وہ تغزل سے عاری اور خالی ہوتا ہے۔ اسی بات کو شاعر نے دوسری رباعی میں کہنے کی کوشش کی ہے۔

آج جس طرح کورونا کا قہر سارے عالم پر طاری ہے ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب سونامی نے مختلف علاقوں میں قیامت کا سماں باندھا ہوا تھا۔ ایسے خوفناک اور پُر ہول مناظر سے آنکھوں کا سامنا ہوا تھا جو صور اسرافیل کا ٹریلر لگ رہا تھا۔ ساحل سمندر پر شور تھا۔ خوفناک نظاروں سے نظر کانپ رہی تھی۔ پانی کی لہریں اٹھتی تھیں اور آس پاس کی تمام اشیاء کو خس و خاشاک کی طرح نگل لیتی تھیں۔ بڑے بڑے مکانات اور گاڑیاں سونامی کے طوفان میں کاغذ کی ناؤ کی طرح تیرتی نظر آئیں۔ اللہ نے وہ عذاب نازل کیا کہ تہذیب و تمدن کا غرور خاک آلود ہوگیا تھا۔ انھیں سب خیالات کا اظہار حماد انجم نے متعدد ایسی رباعیات میں کیا ہے جنھیں انھوں نے سنامی رباعی کا نام دیا ہے۔ بطور نمونہ چند رباعیات یہاں آپ کی ظرافت طبع کے لیے پیش ہیں۔

تھا شور سونامی کہ سرافیل کا صُور
کس مس ڈے نہیں بلکہ وہ تھا یومِ نشور
ساحل پہ سمندر کے تھا محشر برپا
اللہ نے توڑا ہے تمدن کا غرور!

............

ساحل کے نظارے سے نظر کانپ گئی
خاموش سمندر کی لہر کانپ گئی!
بے پردگی آوارہ ہوئی یوں انجم!
غُصے میں مشیت تھی بھنور کانپ گئی

............

سیلاب سونامی نے غضب ڈھایا ہے
اک نوح کا طوفان نظر آیا ہے
اب جا کے کھلی آنکھ نظر والوں کی
کیا مار کے اللہ نے سمجھایا ہے

ان رباعیات میں شاعر کا احساس بڑا گہرا ہے۔ اس کا تخیل بڑا ندرت آمیز ہے۔ سونامی کو صور اسرافیل سے تعبیر کرنا۔ اسے یوم نشور کی طرح نفسا نفسی کی تصویر بتانا، ساحل پر محشر کا عالم ہونا، ساحل سمندر کے نظارے سے نظر کا کانپنا، خاموش سمندر کی لہروں کے لیے کانپنے کی تعبیر استعمال کرنا۔ مشیت کا غصے میں ہونا بھنور کا کانپنا، سونامی کا غضب ڈھانا، اسے طوفان نوح سے تشبیہ دینا۔ سونامی کو اللہ کی ضرب اور مار سے تشبیہ دینا وغیرہ ایسے استعارے ہیں جو ان تینوں رباعیات میں شعریت، معنویت اور تہ داری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ قاری ان تمام پر ہول مناظر کو دیکھ کر لرز جاتا ہے، کانپ جاتا ہے۔ وہ ایک بار پھر اسی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے جس سے اس وقت دوچار ہوا تھا۔ اور یہی شعریت حماد انجم کے تمام کلام کی خصوصیت اور خوبی بن کر جلوہ گر نظر آتی ہے۔

مشہور رباعی نگار فرید پربتی کے انتقال پر حماد انجم نے کئی رباعیاں لکھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ دونوں میں عالمانہ مراسلت تھی۔ ایک دوسرے سے علمی وادبی اخذ وعطا اور افادے واستفادے کے تعلقات ان کے درمیان قائم تھے۔ ان کے انتقال سے حماد انجم کا غم والم سے دوچار ہونا اور رباعی کے اس شاعر کو رباعی ہی کے آہنگ اور اسٹرکچر میں خراج عقیدت پیش کرنا فطری تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان پر کئی رباعیاں کہیں۔ جن میں سے چند یوں ہیں۔

کچھ کہنے کا یارا نہ رہا، اف نہ رہا
منہ پھیر لیا، گویا کہ تعارف نہ رہا
اے یوسفِ کنعانِ رباعی ہیہات
وہ وادی کشمیر کا یوسف نہ رہا

............

پابستہ شب و روز کی زنجیر سے تھا
وابستہ کفِ دستِ عناں گیر سے تھا
رکنا ہی نہیں تھا اسے تا دیر یہاں
عقبیٰ کا سفر وادی کشمیر سے تھا

حماد انجم کی رباعیات میں اکثر ایسی ہیں جن پر گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ مجھے رباعی کی صنف بڑی خشک لگتی ہے۔ مجھے اس میں کوئی خاص لطف اور حظ محسوس نہیں ہوتا لیکن اس مضمون کے قلمبند کرنے سے قبل میں نے حماد انجم کی رباعیات کا مجموعہ 'بربط بردوش' ایک نشست میں پڑھ ڈالا اور اپنی پسند کی چند رباعیات کا آپ کی ضیافت طبع کے لیے انتخاب کر ڈالا۔ ان کی اکثر رباعیات میں شعور واحساس کی گہرائی بھی ہے اور اظہار کی جمالیات بھی۔ فن کی پختگی بھی ہے اور فکر کی بالیدگی بھی۔ موضوعات کا تنوع بھی ہے اور مضامین کی تازگی بھی۔ عصر حاضر کی ترجمانی بھی اور عصری حسیت کی گھن گرج بھی۔ ان کی رباعی گوئی کی لو بڑی تابندہ اور روشن ہے۔ 'ان کی تخلیقی جودت اور فنکارانہ ہنر مندی کی لو ان کے آبگینے میں جھلملاتی رہتی ہے'۔ میں نے ان کی رباعیوں کے مجموعوں کو کبھی بغور نہیں پڑھا تھا لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو ان کی رباعیوں کے حسن و جمال میں کھو کر رہ گیا۔ ان کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہوگیا، روح سرشار ہوگئی، دل بہل گیا، جاں فدا ہوگئی، داد دینے کو جی چاہا لیکن اب داد بھی دی تو کیا دی، جب داد سننے والا ہی نہ رہا۔ وہ جو کل فرید پربتی کو اپنی رباعیوں سے خراج عقیدت پیش کر رہا تھا وہ خود بھی انہی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ خراج عقیدت کا محتاج بن گیا۔ یہی کارخانۂ ازل کا قانون لافانی ہے۔ جب تک یہ کائنات ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لوگ آتے اور جاتے رہیں گے۔ خراج عقیدت پیش کیے جاتے رہیں گے۔

■

**Dr. Shams Kamal Anjum**
Head, Dept of Arabic
Ghulam Shah Badshah University
Rajouri - 185234 (J&K)

محمد اقبال جاوید

# جدیدیت اور جدید افسانہ

ہر عہد اپنے فکری رجحان، معاشرتی طرز زندگی، معاشی نظام، تہذیبی و ثقافتی خصوصیات، سیاسی تحریکات کے اثرات سے تشکیل پاتا ہے، انھی خصوصیات کی بنا پر وہ سماج بھی پہچانا جاتا ہے۔ جب سماج میں یکسانیت در آتی ہے، ذہنوں پر جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، لوگ صف آرائی و حلقہ بگوشی کے دائرے میں سمٹ جاتے ہیں تو نئی نسل یا کچھ باغیانہ صفت رکھنے والے افراد اس جمود کو توڑنے کے لیے شعوری کوشش کرتے ہیں۔ سماج کے مروجہ ڈھانچے اور ذہنی سطح سے انحراف کرتے ہوئے نئے انداز فکر اپناتے ہیں۔ اس نئے انداز فکر کو جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عام طور پر جدید کی اصطلاح قدیم کے ضد کی طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ زمانے اور فیشن پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے فیشن جو رائج ہوتا ہے وہ جدید ہے۔ زمانہ حال جدید ہی کہلاتا ہے لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ کب مزاج بدلے اور جدید قدیم ہو جائے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت دراصل ایسا رویہ یا رجحان ہے جس کے ہر لمحہ بدلنے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ جدیدیت کے لیے۔ لازم ہے کہ وہ کسی نئی بات یا فکری رجحان کو بنائے رکھے اس کے علاوہ جدید حسیت کو بھی جدیدیت کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسرے معنی میں یہ کہا جائے کہ جدیدیت کوئی تحریک یا رجحان ہی نہیں بلکہ زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کا فکری و منطقی عمل ہے۔ جدیدیت کو عالمگیر رویہ یا رجحان بھی کہا جاتا ہے جس میں تمام عالم انسانیت کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں کا اور خارجی و داخلی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس پس منظر میں اگر غور کیا جائے تو جدیدیت دراصل کل انسانیت کی تفسیر کا کام کرتی ہے۔ کیونکہ مذکورہ پہلوؤں سے ہی ادبی تخلیق کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اردو شعر و ادب نے انقلاب روس کے بعد کی عالم گیر فضا سے متاثر ہو کر فرسودہ پامال مضامین کو خیر باد کہا۔ نئے موضوعات اپنائے، کارل مارکس اور اشتراکی نظریہ سے متاثر ہو کر ادب تخلیق کیا اور ادبی تحریک کی شکل دے کر نئے انداز فکر کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی اسی تحریک کو ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا درحقیقت یہ بھی جدیدیت ہی تھی۔

آزادی کے بعد ایک طرف ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ اشتراکیت اور واقعیت کا حامل ادب پروان چڑھ رہا تھا تو دوسری طرف ایک آزادانہ فضا بھی رفتہ رفتہ قائم ہوتی جا رہی تھی۔ اجتماعی مقاصد و مفادات کے بجائے انفرادی احساسات و خیالات اور نجی تجربات ادب میں جگہ پا رہے تھے۔ اس کی کئی وجوہات بھی تھیں۔ مثلا دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی نسل اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اشتراکی نظریات کو محدود تصور کرنے لگی تھی کیوں کہ زندگی اس قدر پیچیدہ ہو گئی تھی کہ انھیں اپنے سوالات کا دوٹوک جواب نہیں مل پا رہا تھا۔ آزادی کے بعد کے حالات کی وجہ سے اشتراکیت پر سے بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ خود ترقی پسند تحریک تعطل کا شکار ہو گئی تھی۔ اُردو ادب کے لیے یہ وقت مشکل ترین تھا۔ ادب میں جمود کی کیفیت طاری تھی بقول مظفر حنفی:

''لوگ ترقی پسند تحریک کی غلط نوازیوں اور نعرہ بازیوں سے بے زار ہو چکے تھے اور ہر قسم کی گروپ بندی اور نظریاتی جکڑن سے بالاتر ہو کر کھلی فضا میں شعر کہنا پسند کرتے ہیں۔'' (مظفر حنفی: جدیدیت تجزیہ و تفہیم، ص 88)

اسی زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، بلراج کومل، محمود ایاز، وحید اختر وغیرہ نے ترقی پسندوں سے اختلاف کیا اور جدید طرز پر اپنی تخلیقات کو عملی جامہ پہنایا۔ کئی نئے ادبی رسالوں نے نئے طرز احساس پر مبنی تخلیقات کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ سوغات نے خاص طور پر مغربی ادیبوں کی تحریروں کے ترجمے شائع کیے۔ ان عوامل کے زیر اثر اُردو میں جو نیا ادب تخلیق ہوا، وہ ہر لحاظ سے پہلے کے اُردو ادب سے مختلف تھا۔

اس دور میں اس وقت کی ادبی خصوصیات کو فلسفیانہ بنیاد فراہم کرانے کی کوشش کی گئی اور اس کا نام جدیدیت رکھا گیا۔ جدیدیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جو نیا ہے اور فلسفیانہ بنیادوں پر عالمگیر فضا سے متاثر ہو کر نئے موضوعات اور دور جدید کے انفرادی، خارجی داخلی اور نفسیاتی پہلوؤں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ادب تخلیق کیا گیا جس میں کل انسانیت کی تفسیر شامل ہے۔

جدیدیت کی تعریف مختلف مفکرین اور ناقدین نے الگ الگ انداز سے کی ہے۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ جدیدیت کی تعریف پر بھی از سر نو غور کیا جائے۔ جدیدیت کی تعریف میں یوسف جمال خواجہ رقمطراز ہیں:

''وسیع تر معنی میں جدیدیت کے معنی یہ رہے ہیں کہ ہم عصر جدید رجحانات و میلانات کو روایتی قدیم انداز زندگی کے ہر شعبہ میں فوقیت دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے جدید رجحانات کی غمازی کرنے والی ادبی تخلیقات کو جدیدیت کا علمبردار تصور کیا جانا چاہیے۔ جدیدیت حیات و کائنات کے لیے ایک مخصوص رویہ یا تصور ہے۔ ماضی سے ناآسودہ ہو کر

ردِعمل کے طور پر کسی نئی ڈگر کی سمت رواں ہوجانا ہی جدیدیت نہیں ہوسکتی کیونکہ ردعمل تو جذباتی اور احتجاجی بھی ہوسکتا ہے اور جہاں جذبات اور احتجاج کا غلبہ ہو وہاں سوچ اور فکر کے عناصر کی کمی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس بات پر غور کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہ عمل کہاں تک درست ہے اور مستقبل میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر ہم صرف روایت کی تقلید کرتے رہیں تو ارتقاء کا عمل بند ہو جائے گا اس لیے جدیدیت ہمیشہ ہی نئی روایت قائم کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔''

(جدیدیت کیا ہے: جدیدیت اور ادب، مرتبہ: آل احمد سرور، ص 30)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جدیدیت کی تعریف کچھ اس طرح کی ''صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے کہ وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں ادیب کے اپنے احساس اور تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ جدیدیت خلاء میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں اپنی روایات میں ہوتی ہیں۔'' (مضامین نو، نئے شعری رجحانات، ص 67)

درج بالا تعریفات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وقت اور ماحول کے فطری تقاضے ادیب کو اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اس کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اپنے رویہ کی بدولت وہ روایتوں کے پس منظر میں احساس اور جذبات کو پیش کرتا ہے۔ جدیدیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اساس ماضی کے اقدار سے کوئی رشتہ رکھے تاکہ وہ دیرپا ثابت ہو اور جو جدیدیت ماضی سے اپنا رشتہ استوار نہیں رکھتی وہ دیرپا نہیں ہوسکتی ہے بلکہ لمحاتی ہوتی ہے۔

جمیل جالبی جدیدیت کو اضافی چیز مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر زمانے اور ہر دور کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ روایتوں کے باعث اس میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جو اس دور کی پہچان ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اضافی ہیں۔ سرسیّد کے دور میں کچھ اصلاحی پہلو سامنے آئے انھیں اپنایا گیا۔ 1920 میں ٹیگور نے کچھ خیالات کو جدید مانا اور ادب تخلیق کیا، ترقی پسند تحریک نے بھی روایتوں سے مکمل بغاوت نہیں کی۔ کئی باتوں کو ادبی تخلیقات کے لیے بنیاد ٹھہرایا۔ اس لیے اس کی تمام باتیں نئی نہ ہوکر کچھ نئی باتوں کا اضافہ ہی ہیں۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے جدیدیت کے تعلق سے کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''جدیدیت وقت کی طرح فعال، ارتقا پذیر اور متحرک ہے۔ آج جدید ادب کی براہِ راست مقصدیت نظریاتی، وفاداری اور سیاسی محکومیت سے انحراف کرتا ہوا ایک خالص ادبی رویہ ہے اس میں لکھنے والا اپنی شخصیت کے وسیلے سے خارجی مسائل کو داخلی طور پر محسوس کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر بشیر بدر: آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، ص 23)

پروفیسر آل احمد سرور بھی جدیدیت کے بارے میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی یا مایوسی۔ اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں، اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان دوستی کا ایک جذبہ بھی ہے مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آئیڈیالوجی سے بیزاری۔ فرد پر توجہ، اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کا عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہیں۔'' (آل احمد سرور نظر اور نظریہ، ص 179)

اُردو ادب پر جن تحریکات نے اثر ڈالا ان میں جدیدیت کی تحریک کو بنیادی طور پر سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ کوئی بھی زبان کا ادب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ چاہے نثر ہو یا شاعری۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تاریخی واقعات ادبی تخلیقات کے محرک ہوتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

لہٰذا جدیدیت کی تحریک کو جاننے سمجھنے کے لیے ان اسباب کا مطالعہ مفید ہوگا جو اس تحریک کے فروغ میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ وہ کون سے افکار و نظریات تھے جنھوں نے جدیدیت کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا جن کے سہارے جدیدیت کی تحریک ثمر آور ہوئی اور اپنی علیحدہ شناخت بنائی۔

اُردو میں جدیدیت کی اصطلاح 1960 کے بعد رائج ہوئی۔ سب سے پہلے اس اصطلاح کو کس نے اور کب استعمال کیا اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن جس نے اس اصطلاح کو استعمال کیا اس کے نزدیک مغرب کی تحریک موڈرن ازم کافی اہمیت رکھتی ہوگی کیونکہ اس تحریک پر مغربی مفکرین کے اثرات واضح نظر آتے ہیں اور شاید جو بحث جدیدیت کی تحریک سے متعلق ہوتی ہے، وہ مغرب کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔ بقول آل احمد سرور:

''تاریخی اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ہمارے ملک میں مجموعی طور پر جدیدیت انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔'' (آل احمد سرور: جدیدیت اور ادب، ص 81)

آل احمد سرور جدیدیت کو قدامت کی ضد قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جدیدیت انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔

سرسیّد تحریک بھی اپنے دور کی جدیدیت کی تحریک تھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی وقت اور ماحول یعنی زمانہ حال کے تجربوں سے وابستگی اور اس کے اظہار دونوں کو جدیدیت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ ماضی کی تحریکوں کا اثر جدیدیت کی تحریک نے قبول کیا۔ ہندوستان کی کئی تحریکیں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل جدیدیت کی تحریک کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو جدیدیت کی اساس کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر مغربی تعلیم و افکار کا اثر نمایاں نظر آنے لگا تھا جس کے نتیجہ میں روایتی سماجی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ دوسری طرف سماجی بیداری کے لیے بھی تحریکیں چل رہی تھیں جس کے اثرات ہندوستانی معاشرے اور سماج پر پڑے۔ سماج کے فرسودہ رسم و رواج پر کاری ضرب پڑی۔ ستی کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ ہوا، عورتوں کی تعلیم کی تائید وحمایت ایسے جدید تصورات تھے جنھوں نے ہندوستانی سماج کو بدل کر رکھ دیا۔ سوامی ویویکانند نے خدمت خلق کو نصب العین بنا کر رام کرشن مشن کے ذریعہ سماج کے معزور اور مفلس و بے سہارا افراد کی خدمت کی طرف خاص توجہ دی۔

اُردو ادب میں بھی جدیدیت کی تحریک مغرب سے متاثر ہوکر شروع ہوئی۔ اس تحریک کو وجودیت اور سرریلسٹ کے فلسفہ نے متاثر کیا۔ یہ تحریکی رجحان چونکہ ایسے وقت میں پروان چڑھ رہا تھا۔ جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ساتھ ہی جنگ آزادی کی انقلابی تحریک اور قیام پاکستان اور دوقومی نظریات سے عام آدمی فکرمند نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب 'اُردو ادب کی مختصر تاریخ' میں اس نکتے کی نشاندہی کچھ اس طرح کی ہے:

''تاریخی لحاظ سے دیکھیں تو غلامی کی نصف صدی نے انگریز کو ناقابل تسخیر قوت کے روپ میں پیش کردیا تھا۔ مگر سیاسی بیداری کو بھی لہروں کی صورت میں محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ادھر سرسیّد کی تحریک کے اثرات اب بھی کسی حد تک برقرار تھے بلکہ موضوعاتی تنوع کے باوجود مولوی عبدالحق کے مانند بعض حضرات تو سرسیّد تحریک کا تتمہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سیاست کی طرح ادب میں بھی انقلاب کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں غزل کی

مخالفت کرتے ہیں:

''پریم چند اپنے سماجی اور طبقاتی تصور کی بناء پر ترقی پسند تحریک کے لیے ہراول دستے کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، حسرت سرخ انقلاب کے داعی کی حیثیت سے شہرت پاتے ہیں۔ شرر ناول نگار تھے مگر سب سے پہلے نظم معرا لکھنے والے بھی وہی تھے بحیثیت مجموعی یہ نئے خیالات اور تجربات کا دور تھا اور آج یہ اتنے باغی یا انقلابی نہیں معلوم ہوتے لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی کے ثمرات اور ادب میں انقلاب پسندی کی فصل کے بیج بوئے اور کھاد کا کام کیا''

(اردو ادب کی مختصر تاریخ،ص 112)

دنیائے ادب کی ایک دلچسپ صنف نثر افسانہ ہے۔ کہانی کی تاریخ دراصل انسانی زندگی اور اس کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کی تاریخ ہے۔ انسان میں فطرتاً جتنی قوتیں کارفرما ہیں ان میں ''جبلت'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ نسان کی سماجی زندگی کا وجود ایسے ہی فطری تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی کوشش سے ہی ہے۔ جبلی تقاضوں میں بھوک اور آفات ناگہانی سے خود کو محفوظ رکھنا دو ایسے تقاضے ہیں جن کے لیے انسان کو روز اول سے عمل پیرا ہونا پڑا۔ حصول معاش اور کارگاہ ہستی کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرتے وقت پیش آنے والے تجربات کا بیان بھی انسانی جبلت ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے ہی ملتا ہے اور یہی دراصل کہانی یا افسانہ کی بنیاد ہے۔ اس بات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ افسانہ کا تعلق بھی انسانی جبلت ہی سے ہے اور انسان جبلی طور پر کہانیوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے۔

بقول احسن فاروقی: '' قصہ سے لطف اندوز ہونا ہماری فطرت میں داخل ہے'' (ناول کیا ہے،ص 17)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قصوں کے لیے انسانی سرشت میں یک لگن ہے اور ساتھ ہی ازلی تشنگی بھی۔ بقول کلیم الدین احمد:

''انسان تہذیب یافتہ ہو یا وحشی، بچہ ہو یا بوڑھا، کہانیوں کا فطری طور پر شائق نظر آتا ہے۔ جس طرح اس کی آنکھیں کسی نئے غیر معمولی دلچسپ تماشے کی مشتاق رہتی ہیں بجنسہ اسی طرح اس کے کان نئے نئے قصوں، نوکھی کہانیوں، رنگین داستانوں کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ ن قصوں کہانیوں، رنگین داستانوں کے فیض سے اس کی سادہ معمولی بے رنگ زندگی رنگین وخوش گوار ہو جاتی ہے۔''

(دیباچہ منظر و پس منظر،ص 10)

چونکہ کہانیوں کا سلسلہ ہماری فطرت اور جبلت سے ابستہ ہے، اس لیے دنیا کا قدیم ترین فن کہانی ہی ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی قوت تخلیق نے سب سے پہلے قصہ کی تخلیق کی۔ فنون لطیف، رقص، موسیقی، بت تراشی مصوری وغیرہ کا تصور بھی نہ تھا، اس وقت کہانیاں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ملکوں میں ابتدا ہی سے قصہ اور کہانیوں کی روایت ملتی ہے۔ ہندوستان میں لوک کتھائیں، عرب کے صحرائی قصے، یونان و ایران کی صنمیاتی داستانیں وغیرہ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تحریری اعتبار سے دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں ابتدا سے قصے کہانیاں نہیں ملتی ہوں۔ تمام ملکوں کی ابتدائی کہانیوں کے مطالعہ سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے انسان جبلی طور پر ایک ہیں اور کہانیوں کا تعلق جبلت سے ہے، اس لیے ان کہانیوں کے موضوع بالعموم ایک ہی طرح کے ہیں۔ خوف، حیرت، مسرت اور جذبہ عبودیت وغیرہ موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے قدیم قصوں میں گہری مشابہت نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

''جذبی کمزوریاں اور ذہنی کشمکش، خواہشیں اور تمنائیں اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش ہر جگہ موجود ہے۔ اسی طرح جوانی کی سرمستیاں اور جنسی جذبہ کا اظہار الجھنوں اور مسرتوں کے نقوش بھی ہر جگہ یکساں ہی نظر آتے ہیں۔ گناہ، پاکیزگی، کامرانی اور موت کے تصورات بھی قصوں میں بنیادی طور پر ایک ہیں۔ ہر قبیلہ کی کہانیوں میں ان باتوں کی یکسانیت نظر آئے گی۔

(شکیل الرحمٰن شیرازہ شمارہ جنوری 1962،ص 40)

وقت کے تقاضے نے انسان کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ نت نئی ایجادات نے جہاں انسانی زندگی کے رخ کو تبدیلی کر دیا جس کے نتیجے میں ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ شاعری میں مثنوی۔ قصیدہ، مرثیہ، غزل، رباعی اور نظم وغیرہ تخلیق کی گئی۔ اسی طرح نثری اصناف میں داستانیں وجود میں آئیں جو بے حد طویل ہیں۔ داستانوں کی طوالت اس عہد کے سماجی اور معاشی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ مافوق الفطرت عناصر، رومان و تخیل اور حیرت و بوالعجبی اس عہد کے ذہن و تصور کی خصوصیات ہونے کی وجہ سے داستانوں کی خصوصیت بن گئی۔

لیکن اس نظام زندگی کو جلد ہی زوال پذیر ہونا پڑا۔ فرنگی اقتدار میں آتے ہی ایک تہذیب کا خاتمہ ہوا اور دوسری تہذیب پروان چڑھنے لگی۔ نئے ذہن کی تعمیر و تشکیل ہونے لگی۔ ساتھ ہی سماجی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ فرصت کے لمحات مفقود ہوئے اور سماجی حالات نے زندگی کو پیچیدہ بنا دیا۔ رومان اور تخیل کے بجائے حقیقت اور صداقت سے ناول کے ذریعہ زندگی کی مکمل اور حقیقی عکاسی کا رجحان پروان چڑھا۔ ناول نگاری کا فن ترقی کرتا رہا اور زندگی کی پیچیدگیاں اس میں جگہ پاتی رہیں۔

سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک صورت حال بدلنے لگی اور رفتہ رفتہ مشینوں کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ آمد و رفت کے ذرائع وسیع ہونے لگے اور صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ جو سائنسی ترقی کا عظیم کارنامہ ہے۔ سائنس و تکنالوجی کے فروغ کے نتیجے میں انسانی ذہن کو قدامت پرستی سے نجات ملی۔ آزاد ماحول میں فطری طور پر انسان کا ذہنی ارتقا ہونے لگا۔ ان تمام تبدیلیوں سے وقت کی اہمیت بڑھ گئی۔ لوگوں کو وقت کی قلت ہونے لگی، لیکن انسان تو فطری طور پر تفریح پسند ہے۔ اس لیے اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ناول سے بھی کم کوئی ایسی صنف ایجاد کی جائے جو کم وقت میں انسانی پیاس بجھا سکے۔ گویا صنعتی دور کے سماجی اور معاشی حالات کے سبب مختصر ترین اور کم وقت میں پڑھی جانے والی صنف نثر مختصر افسانے کا وجود عمل میں آیا۔ بقول ڈاکٹر نگہت ریحان:

''شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام کی عیش کوشیوں نے داستان کو جنم دیا تھا تغیر پذیر زمانہ، حقائق کی تلخیوں اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل ناول کی تخلیق کا سبب بنے تھے، بدلتے ہوئے حالات، وقت اور انسان کی ضرورت یہ سب افسانہ کی پیدائش کا محرک بنے جو صنعتی دور میں رہنے والے انسان کے ماحول، ذہنی کیفیات اور افتاد طبع سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا اور انسان کے ادبی ذوق اور ہر قسم کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بھی بن سکتا تھا۔''

(ڈاکٹر نگہت ریحان: اردو افسانے کا فنی اور تکنیکی مطالعہ،ص 49)

اُردو افسانہ آج کے دور کی سب سے مقبول ترین صنف نثر ہے جو آج کے انسان کی خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے مختصر افسانے میں انسان کی مجبوریاں اور پابندیاں بھی موضوع بنی ہیں۔ اور مختصر افسانہ زمانے کی نزاکتوں اور لطافتوں سے مطابقت اور مناسبت بھی رکھتا ہے۔ دور جدید کی بے حسی تشکیک۔ لایعنیت، خود غرضی، بے رحمی، دہشت پسندی، ریاکاری، جابرانہ حکمرانی اور انسانیت سے بعید سیاسی رقابتیں، عالمی صورت حال، سائنس اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے پیدا شدہ بحران وغیرہ کو جدید افسانے میں موثر طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

■

**Prof. Dr. Mohd Iqbal Javed**
Head, Dept. of Urdu
Shivaji College
Hingoli- 431401 (MS)

# ہندوستانی ڈراما پر مغربی ڈراما کے اثرات

لیاقت علی

مغربی ممالک میں ڈرامہ وہاں کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے بلکہ یوروپ کے تمام ممالک میں اس فن کو ادبی وتہذیبی زندگی کا ایک اہم حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی دولت اور شہرت کا چرچہ سن کر سب سے پہلے پرتگالی قوم 9 جولائی 1497 میں (Lisbon) سے واسکوڈی گاما کی قیادت میں ہندوستان پہنچی۔ مئی 1497 میں پرتگالی قوم کالی کٹ کے مغربی ساحل پر اتری، لیکن یہاں کے راجہ نے ان کی ڈٹ کر مزاحمت کی اور دونوں قوموں کے درمیان جنگ ہوئی۔ آخر کار واسکوڈی گاما کو اپنے 160 سیاحوں سمیت جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1499 میں وہ 55 ساتھیوں کے ہمراہ (Lisbon) لوٹ گیا۔ دوسری مرتبہ واسکوڈی گاما نے فروری 1506 میں ہندوستان پر یلغار کی اور کالی کٹ کے راجہ کو شکست دے کر ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے اور دھیرے دھیرے پرتگالی قوم تجارت کے بہانے اپنے مقبوضات بنانے میں کامیاب ہوگئی اور ان کی ایک کثیر تعداد یہاں رہنے لگی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں پرتگالی قوم کی مستحکم حکومت 1542 میں قائم ہوئی۔ ان لوگوں میں جفاکشی کے ساتھ ساتھ تفریح کی طلب بھی تھی۔ اس بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ وطن سے دور ایک اجنبی ملک میں اس قوم نے سختیوں اور احساس بے وطنی کو بھولنے کے لیے تفریح میں پناہ ڈھونڈنی شروع کی۔ چنانچہ انھوں نے تفریح گاہیں قائم کیں، ڈرامے لکھے اور اسٹیج کرنے کا ہنر اپنایا جس سے لوگ اپنا دل بہلا سکیں اور اپنے ملک کی تہذیبی اور ادبی زندگی کی جھلکیاں بھی دیکھ سکیں۔ ان ڈراموں کی زبان کیا تھی، یہ طے کرنا تو مشکل ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً اپنی زبان میں ہی پیش کیے ہوں گے یا ہندوستانی اور پرتگیز زبان کے امتزاج سے بھی پیش کیے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پرتگالی زبان کے بہت سارے الفاظ اردو میں ملتے ہیں۔ مثلاً بوتام، گودام اور تمبا کو وغیرہ۔ بعض محققین نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنے ڈرامے ہندوستانی زبان میں پیش کرتے تھے، بہر حال یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو ڈرامانے شعوری طور پر نہ سہی لیکن غیر شعوری طور پر پرتگالی ڈراموں کا بھی اثر قبول کیا ہے۔

ہندوستان کی بساط سیاست پر جب انگریزوں نے دوسری یورپی قوموں کو پست کردیا اور ان کے قدم یہاں مضبوطی سے جم گئے تو ان کی زندگی کے جز کی حیثیت سے ہندوستان میں ڈرامے کیے جانے لگے۔ یہ ڈرامے زیادہ تر چھاونیوں یا ایسے مقامات پر ہوتے تھے جہاں انگریزوں کی بڑی تعداد مقیم ہوتی تھی۔ انگریزوں کے

باقاعدہ تھیٹر قائم کرنے کا قدیم ترین ثبوت ڈیکس کی کتاب (Bombay and Western India) جلد اول، ص 121 ہے۔ جس کے ساتھ تقریباً 1750 درج ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ممبئی میں 1750 میں ایک تھیٹر موجود تھا۔ لیکن ممبئی گزٹ میں وہاں کے سب سے پہلے تھیٹر کی تعمیر کا سال 1770 درج ہے جو عوام سے چندہ لے کر قائم کیا گیا تھا۔ اس تھیٹر میں جسے 'ممبئی تھیٹر' کہا جاتا ہے ڈراموں کے کھیلے جانے کی تفصیل بقول ڈاکٹر نامی 1797 کے پہلے نہیں ملتی۔

22 مارچ 1800 سے یہ تھیٹر نیلام گھر کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا مگر 1806 سے اس تھیٹر میں پھر تماشے دکھائے جانے لگے۔ 1818 میں اس تھیٹر کو دوبارہ بنوایا گیا اور پہلی جنوری 1819 سے اس میں باقاعدہ ڈرامے کیے جانے لگے۔ یہ سب ڈرامے انگریزی کے ہوتے تھے جن میں شوقیہ ڈرامہ کرنے والے حصہ لیتے تھے لیکن اخراجات کے مقابلے میں آمدنی کم ہوتی تھی۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس کی مجلس منتظمہ نے 1835 میں اس کی عمارت کو نیلام کر دیا۔ 1845 میں کچھ لوگوں کی تحریک پر دوبارہ ایک تھیٹر قائم کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ چنانچہ جگن ناتھ شنکر سیٹھ کی تحریک پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ممبئی تھیٹر کے نیلام سے بچی ہوئی رقم نئے تھیٹر ہال کے لیے دینا منظور کر لی اور گرانٹ روڈ پر نیا تھیٹر ہال تعمیر ہوا جس میں 1846 سے باقاعدہ طور پر انگریزی ڈرامے دکھائے جانے لگے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بامبے تھیٹر کی ابتدا سے اس کے نیلام ہو کر کھدنے تک یعنی 1835 تک اس میں ہندوستانیوں کے داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ اس لیے ممبئی تھیٹر میں جو ڈرامے ہوئے تھے ان کا براہِ راست اثر ہندوستانیوں کی زندگی پر نہیں پڑ سکا۔ 'گرانٹ روڈ تھیٹر' جب تعمیر ہوا تو اس کے لیے جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے اپنی زمین معاوضے پر دی۔ اس کے علاوہ اس میں دوسرے ہندوستانیوں نے بھی چندے دیے تھے۔ چنانچہ مجلس منتظمہ میں جگن ناتھ شنکر سیٹھ کی آواز کافی اہمیت رکھتی تھی۔ ان کی خواہش یہ ہوئی کہ نئے بامبے تھیٹر میں مراٹھی ڈرامے بھی اسٹیج لیے جائیں۔ اس لیے 1853 میں جگن ناتھ شنکر کی قائم کردہ انجمن نے جس کا نام 'ہندو ڈرامیٹک کور' تھا کچھ ڈرامے پیش کیے۔

مالی حیثیت سے ان ڈراموں میں کافی نقصان ہوا۔ اس لیے جگن ناتھ شنکر نے سوچا کہ اردو ڈرامے بھی پیش کیے جائیں تاکہ اس نقصان کی کچھ تلافی ہو سکے، اس لیے انھوں نے بھاو داجی لاڈ سے 'راجہ گوپی چند اور جلندھر' نام کا ڈرامہ لکھوا کر 6 نومبر 1853 کو پیش کیا اور اس طرح بقول ڈاکٹر عبدالعلیم نامی 'بامبے تھیٹر' کے اسٹیج پر اردو کا پہلا ڈرامہ کھیلا گیا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ 1871 تک اردو ڈراما دکھانے کی جو کوششیں بمبئی میں ہوتی رہیں۔ مگر اس دور کا کوئی ڈراما دستیاب نہیں ہے، ورنہ اس سے ان ڈراموں کے فنی ارتقا کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ ابھی تک بمبئی کے جدید اردو اسٹیج سے جو قدیم ترین اردو ڈراما ملتا ہے وہ 'خورشید' ہے اس ڈرامہ کو 'وکٹوریہ ناٹک منڈلی' نے سب سے پہلے پیش کیا۔ ڈرامہ بڑی کامیابی سے کھیلا گیا اور بہت پسند بھی کیا گیا۔ ممبئی میں جو ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے ان میں 'خورشید' سب سے قدیم بتایا جاتا ہے۔

**انگریزی ڈراموں کا اثر:**

اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں یورپین قوموں کے تسلط کے بعد بہت سے انقلاب برپا ہوئے جن سے ہندوستانیوں کے ذہن میں انگریزی زبان و ادب کے ذریعہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوستانی زبان و ادب پر انگریزی زبان و ادب کے اثرات مرتب ہوئے، نئے رجحانات اور میلانات اپنی جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ خوشگوار اور حیات بخش عناصر بھی شامل ہو رہے تھے۔ سید عبداللطیف نے اپنی کتاب 'دی انفلوینس آف انگلش لٹریچر آن اردو لٹریچر' میں لکھا ہے کہ:

''انگریزی کا زبردست خزانہ جو مغربی زندگی اور تہذیب کے صحت مند عناصر کا آئینہ دار تھا، ہندوستانیوں کے ہاتھ آیا''

ہندوستان بھر میں یہ اثرات نمایاں تھے، چونکہ اس وقت ہندوستان کی عام زبان اردو بن چکی تھی جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی انگریزی ادب کی چھاپ اردو ادب کی ہر صنف پر گہری نظر آتی تھی۔ صنف شاعری سے لے کر ڈرامہ تک اردو ڈراموں نے مغربی اثرات سب سے زیادہ قبول کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد ہی اردو ڈرامے کا آغاز ہوا۔ اردو ڈرامے کی تاریخ مغربی ڈراموں کے ذکر کے بنا مکمل نہیں ہو سکتی، شیکسپیئر اور دوسرے مصنفین کے جو ڈرامے اردو کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں ان میں ترجمے کم اور ماخوذات زیادہ ملتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ کسی دوسرے ملک کی تہذیب و معاشرت کو اپنی زبان میں پیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔

دی انڈین تھیٹر میں پروفیسر یاجنک نے ایک جگہ لکھا ہے:

''وہاں بھی جہاں زندگی کا ایک عام بین الاقوامی معیار ہے جیسے یورپ' ڈرامائی ادب کی کیفیات میں مختلف تبدیلیوں کے بغیر بجنسہٖ منتقل کر دینا اکثر ناممکن ہو جاتا ہے''

اردو ڈراما کے سلسلے میں یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ انگریزی ڈرامے کو اس کی اوریجنلٹی برقرار رکھ کر ترجمہ کرنا بہت مشکل تھا اور اردو کے ڈرامہ نگاروں کو انگریزی زبان پر اتنی دسترس نہیں تھی۔ لہٰذا انھوں نے ترجمہ کرنے سے اعراض کیا بلکہ مرکزی خیال اور نفسِ مضمون کی تلخیص ہندوستانی معاشرت کی خصوصیات سامنے رکھ کر کی۔

اردو میں منتقل مغربی ڈراموں کی تفصیل اور مختلف رائیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔ زیادہ تر ان مغربی ڈراموں کا ذکر کیا جائے گا جو عرصۂ دراز تک اسٹیج کی زینت بنتے رہے ہیں:

**1. شی اسٹوپس ٹو کانکیر ( She Stoops to Conquer):** اولیور گولڈاسمتھ کے اس مشہور و معروف ڈرامہ کا منشی جے نارائن نے 'تسخیر' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسمتھ کا یہ ڈراما شوخی اور ظرافت حسن اور طنز کے امتزاج کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔

**2. شلر (Schiller):** اولیور گولڈ اسمتھ کا یہ ڈراما کئی زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ الگزنڈر ورما نے اس ڈرامے کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسمتھ کے اس ڈرامے کا باقی صاحب نے اردو میں 'مجبور جرمن' کے نام سے ترجمہ کیا۔

**3. ہارٹ لیس آنٹ( Heartless Aunt):** گولڈ اسمتھ کے اس مشہور اور مقبول ڈراما heartless aunt کو بھی اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ آغا حشر کاشمیری نے اپنے اس ترجمے کا نام 'دل کی پیاس' رکھا ہے لیکن ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی جو متن میں تھی۔

**4. سلور کنگ (Silver King) :** اردو میں اس کا ترجمہ 'سلور کنگ' عرف 'نیک پروین' عرف 'اچھوتا دامن' کے ناموں سے آغا حشر کاشمیری نے کیا اور 'نیو الفریڈ کمپنی' بمبئی نے اسٹیج کیا۔ ایچ اے جونیر اور ایچ ہرمن نے مل کر اس ڈرامہ کو لکھا تھا۔ اس تخلیق کو یورپ اور امریکہ کے بہت سارے ممالک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

**5. دی ورجن مارٹیر(The virgin Martyr):** میسینجر Messenger اور ڈیکر Dekker اس ڈرامے کو منشی غلام محی الدین نازاں دہلوی نے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا، جس کو 1913 میں 'پارسی امپیر ل کمپنی' نے پیش کیا تھا۔

**6. دی جیوئس (The Jewess):** یہ ڈراما ڈبلیو ٹی مان کریف کا لکھا ہوا ہے۔ اس ڈرامے کو ہندوستان میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے دو ماخوذات منظر عام

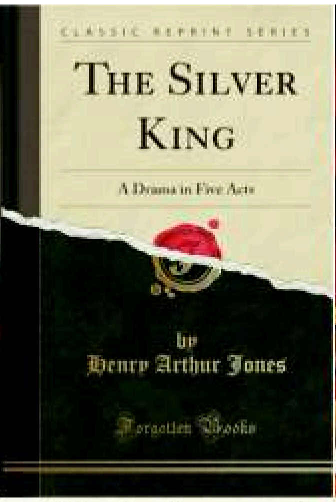


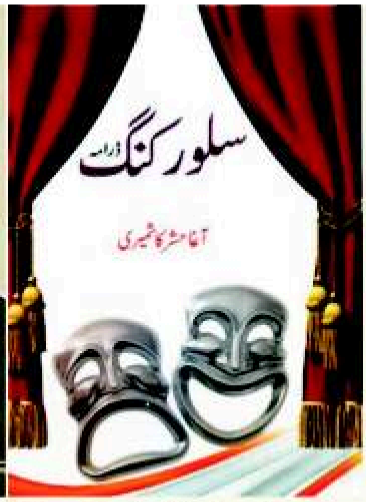


پر آئے۔ ایک منشی طالب کا لکھا ہوا 'کرشمہ قدرت عرف اپنی یا پرائی' جس کو وکٹوریہ کمپنی' ممبئی نے 1912 میں اسٹیج کیا۔ دوسرا مشہور و معروف ڈراما 'یہودی کی لڑکی' ہے جس کو آغا حشر کاشمیری نے اس کے پلاٹ پر لکھا اور 'کھٹاؤ الفریڈ کمپنی' ممبئی نے 1918 میں اسٹیج کیا تھا۔

**7. پزار (Pizarro):** شیریڈن کے اس مشہور المیہ (ٹریجڈی) ڈرامے کو آغا حشر نے 'اسیر حرص' کے نام سے اردو میں پیش کیا اور 1900 میں پارسی کمپنی نے اسٹیج کیا اور اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ڈراما پزار کے ایک اور ماخوذے کا پتہ ڈاکٹر علیم نامی کی کتاب سے چلتا ہے۔ جو افسوں شاہجہاں پوری نے 'اول جلول' کے نام سے لکھا۔ یہ ڈراما پزار کے بنیادی قصہ پر ہی لکھا گیا تھا۔

**8. دی لیڈی آف لائنز (The lady of Lyons):** اردو زبان میں سب سے پہلے لارڈ لٹن کے اس رومانی ڈرامے کا منشی مراد علی نے 'دھوپ چھاؤں' کے عنوان سے ترجمہ کیا اور 'نیو پارسی وکٹوریہ کمپنی' نے اسے پیش کیا۔ ایک اور ترجمہ 'پیمہ' کے نام سے بھی شائع ہوا۔ اخبار لاہور میں ایک ترجمہ "شہر لائنز کی بیگم" کے عنوان سے بھی منظر عام پر آیا۔

**9. نائٹ اینڈ ڈے (Night And Day):** طالب بنارسی نے 'نائٹ اینڈ ڈے' کے پلاٹ پر 'لیل ونہار' عرف تماشائے خوش گلو ڈراما اردو زبان میں لکھا جسے 'نیو الفریڈ تھیٹر کمپنی' نے اسٹیج کی زینت بننے کا موقعہ فراہم کیا۔

**10. دی ٹاور آف نیسل (The Tower Of Nasle):** منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی نے نیو یارک ڈرامیٹک کمپنی ممبئی کے لیے الگزنڈر ورما کے اس ڈرامے کو 1911 میں 'خون جگر' عرف 'شام جوانی' کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔

ولیم شیکسپیئر کے پچاس سے زیادہ ڈراموں کے ترجمے اور ماخوذات اردو میں ملتے ہیں۔ سارے ڈراموں کا ذکر ممکن نہیں، البتہ ان کے چند اہم ڈراموں کا ذکر مناسب ہے۔

**1. میکبتھ (Macbeth):** آغا حشر کاشمیری نے ولیم شیکسپیئر کے اس مقبول ترین ڈرامے کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ ڈراما 'خواب ہستی' کا پلاٹ اس ڈرامے سے اخذ کیا ہے۔ عنایت اللہ دہلوی نے 'میکبتھ' کے ہی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

**2. کنگ جون (King John):** بقول ڈاکٹر عبدالعلیم نامی آغا حشر کاشمیری نے 'کنگ جان' اور 'رچرڈ دی تھرڈ' دونوں سے پلاٹ لے کر 1907 میں 'صید ہوس' ڈراما لکھا تھا۔

**3. لو لیبر لاسٹ (Love Labour Lost):** اس ڈرامے کا ترجمہ اردو میں 'یاروں کی محنت برباد' کے عنوان سے محمد سلیمان نے 1899 میں کیا تھا۔

**4. آل از ویل دیٹس اینڈ ویل (All's Well Thats End Well):** پروفیسر یاجنک کے خیال کے مطابق 'حسن آرا' کے نام سے اس کا ترجمہ ملتا ہے جو پارسی کمپنی نے 1900 میں اسٹیج کیا تھا۔

**5. کنگ ہنری ففتھ (King Henry V):** ولیم شیکسپیئر کے اس ڈرامے کا ترجمہ اردو زبان میں دو مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی بار 'تسخیر فرانس' کے نام سے سید تفصیل حسین ناشر نے اور دوسری بار سعید الحق عاشق دسنوی ایم اے نے 'ہنری پنجم' کے عنوان سے کیا ہے۔

**6. پیری کلس (Pericles):** منشی کریم الدین نے اپنا اردو ڈراما 'خداداد' پیری کلس کے پلاٹ پر لکھا جس کو ممبئی کی پارسی کمپنی نے 1891 میں اسٹیج کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور ماخوذے کا پتہ چلتا ہے جس کا نام 'وادی دریا' ہے۔

**7. مچ اے ڈو اباؤٹ نتھنگ (Much A Do About Nothing):** پروفیسر یاجنک اور ڈاکٹر نامی کے یہاں ایک ہی ترجمے کا پتہ چلتا ہے۔ مترجم کا نام لالہ سیتا رام ہے۔ مگر ترجموں کے عنوانات مختلف دیئے ہیں یاجنک کے یہاں 'دام محبت' نام دیا ہوا ہے جب کہ ڈاکٹر نامی کے یہاں 'جام الفت' ملتا ہے۔ لیکن ان ڈراموں کو کچھ خامیوں کی وجہ سے اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

**8. میژر فار میژر (Measure For Measure):** آغا حشر کاشمیری نے اس کے پلاٹ پر 'شہید ناز' ڈراما 1902 میں لکھا ہے۔ اس ڈرامے کو ہندوستان بھر میں بے حد کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی اور بہت پسند کیا گیا۔

**9. سمبلین (Cymbeline):** اس ڈرامہ کے لگ بھگ تین ترجمے اردو میں ملتے ہیں۔ پہلا ترجمہ 'ظلم ناروا' کے نام سے، دوسرا منشی مصطفےٰ سید علی نے کیا اور تیسرا ترجمہ 'سمبلین' کے عنوان سے عبدالعزیز نے 1902 میں کیا لیکن سب سے زیادہ شہرت اور کامیابی 'میٹھا زہر' کے حصے میں آئی۔ جس کی ہندوستان بھر میں بہت پذیرائی ہوئی

**10. دی ونٹرس ٹیل (The Winter's Tale):** پروفیسر یاجنک کے نزدیک منشی حسن نے 1998 میں اور محمد شاہ حشر کاشمیری نے 1900 میں اس پلاٹ پر ڈراما 'مرید شک' رقم کیا اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے خیال میں بھی آغا حشر نے اس پلاٹ پر 1992 میں مرید شک تحریر کیا۔

**11. دی کامیڈی آف ایرز (The Comedy Of Errors):** ولیم شیکسپیئر کے اس ڈرامے کے اردو میں دو تراجم اور ایک ماخوذے کا پتہ چلتا ہے۔ 1992 میں فیروز شاہ خان نے بعنوان 'بھول بھلیاں' ترجمہ کیا۔ عبدالکریم نے بھی 1913 میں اسی نام سے ترجمہ کیا تھا۔ بیتاب بنارسی نے اس پلاٹ کی بنیاد پر 'گورکھ دھندا' نام سے ڈراما تحریر کیا ہے۔

**12. اوتھیلو (Othelo):** ولیم شیکسپیئر کے اس معروف اور دل دہلانے والے حزنیہ کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں کافی سراہا گیا ہے۔ پروفیسر یاجنک نے اس کے چار تراجم کا ذکر کیا ہے۔ منشی مہدی حسن نے 'شہید وفا' کے نام سے، نظر دہلوی نے 'شیر دل' کے نام سے اور احمد حسن خان نے 1895 میں 'جعفر' کے عنوان سے اردو ترجمہ کیا۔

**13. ہیملٹ (Hamlet):** ہندوستانی اسٹیج پر ہیملٹ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ ولیم شیکسپیئر کے کسی دوسرے ڈرامے کو نہ مل سکی۔ مشرقی ہندوستان میں اردو اسٹیج پر اس کا خوب بول بالا رہا۔ منشی مہدی حسن نے 'خون ناحق' کا پلاٹ اسی سے لیا ہے۔ 1895 میں امراؤ علی لکھنوی نے 'جہاں گیر' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔ نظیر بیگ نے 'واقعہ جہانگیر ناشاد' اس ڈرامے سے اخذ کیا ہے۔ 1902 میں افضل خان نے 'ہیملٹ' کے نام سے ہی اس کا اردو ترجمہ کیا ان ترجموں میں مہدی حسن خان کا ترجمہ سب سے زیادہ مشہور اور مقبول رہا۔

**14.انتونی اینڈ کلیو پیٹرا(Antony And Cleopatra):** پروفیسر یاجنک نے دو ترجموں کا ذکر کیا ہے، دونوں کافی ردو بدل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا 'کالی ناگن' جو جوزف ڈیوڈ نے لکھا اور نیو پارسی وکٹوریہ کمپنی ممبئی نے 1906 میں اسٹیج کیا اور دوسرا ترجمہ 'زن مرید' ہے۔ الگزینڈر کمپنی ممبئی نے 1909 میں دکھایا، یہ ڈراما ہندوستان کے مختلف حصوں میں کھیلا گیا مگر کچھ وجوہات کی بنا پر اسے زیادہ شہرت نصیب نہ ہو سکی۔

**15. کنگ لیر(King Lear):** اس ڈرامے کے بھی اردو میں دو ترجمے ملتے ہیں۔ پہلا ترجمہ منشی مراد علی بنام 'ہار جیت' جو 1905 میں وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی ممبئی نے پیش کیا اور دوسرا ترجمہ 'سفید خون' آغا حشر کا 1960 میں پارسی تھیٹریکل کمپنی نے دکھایا۔

**16.رچرڈ تھرڈ(Richard 3rd):** پروفیسر یاجنک کا کہنا ہے کہ آغا محمد شاہ کاشمیری نے کنگ جان اور رچرڈ تھرڈ سے پلاٹ اخذ کر کے 'صید ہوس' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا۔ جو پارسی تھیٹریکل کمپنی ممبئی نے 1906 میں پیش کیا۔ڈاکٹر نامی نے آغا حشر کے 'صید ہوس' کی تاریخ 1910 بتائی ہے۔اس کے علاوہ دو ترجموں کا ذکر ان کے یہاں ملتا ہے۔ پنڈت بیتاب دہلوی نے 'کنگ رچرڈ سوم' کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ ماہنامہ شکسپیئر ممبئی میں 1906 اکتوبر سے جون 1907 تک برابر شائع ہوتا رہا۔ 1907 میں 'کنگ رچرڈ' کے نام سے کیقباد پستن نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔

**17.ایز یو لائک اٹ(As You Like It):** کچھ کیوں کی وجہ سے ولیم شیکسپیئر کا یہ ڈرامہ اردو اسٹیج کی رونق نہ بن سکا۔ حالانکہ اس کے کئی ترجمے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ڈاکٹر یاجنک کے یہاں ایک ترجمہ کا ذکر ملتا ہے جو 'دل پذیر' کے عنوان سے چرن داس نے 1990 میں کیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے کئی ترجموں کے بارے میں لکھا ہے۔ پنڈت دہلوی نے 1907 میں 'جو آپ پسند کریں' کے نام سے ترجمہ کیا جو ماہنامہ شیکسپیئر ممبئی میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ 1927 میں ولایت حسین نے 'پسند خاطر' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ 'عالم محبت' کے نام سے راجہ رشید احمد نے 1928 میں اس کا ترجمہ پیش کیا۔ 'من کی چاہ' کے عنوان سے سعید الحق عاشق دہلوی نے کیا۔ان ترجموں کے علاوہ چرن داس کا ترجمہ 'دل پذیر' کا بھی ذکر ملتا ہے۔

**18. اے مڈسمر نائٹس ڈریم (A Mid Summer Night's Dream ):** پروفیسر یاجنک نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے ایک اردو ترجمہ کا ذکر کیا ہے، مگر وہ اسٹیج نہیں ہوا۔ 'علی جام الفت' کے نام سے محمد اظہر نے 1903 میں اس کا ترجمہ کیا۔ڈاکٹر نامی کے نزدیک اس کے تین ترجمے ہیں 'خواب پریشاں' کے عنوان سے امیر احمد دہلوی نے کیا دوسرا ترجمہ احسن لکھنوی 1900 میں اور تیسرا ترجمہ محمد اظہر علی آزاد کا ہے۔ جو 'بہار لنسا' کے نام سے 1902 میں کیا گیا تھا۔

**19. مرچنٹ آف وینس(Merchant Of Venice):** اردو اسٹیج پر یہ ڈراما بہت مقبول ہوا۔ڈاکٹر یاجنک کا کہنا ہے کہ اردو اسٹیج پر اس تمثیل کو جتنی کامیابی نصیب ہوئی۔اس کی نصف بھی مراٹھی ترجمے کو نہ مل سکی۔ یاجنک کے نزدیک آغا حشر کاشمیری نے 'دل فریب' کے نام سے اس ڈرامے کا پلاٹ اخذ کیا ہے۔ پروفیسر یاجنک کا یہ قول مستند ثابت نہیں ہوتا کیونکہ آغا محمد شاہ حشر کاشمیری نے ولیم شکسپیر کے اس ڈرامے کو اردو جامہ نہیں پہنایا۔ اور نہ کسی کتاب میں اس کا ثبوت دستیاب ہے۔ عاشق حسین نے 1998 میں 'وینس کے سوداگر' کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا اور ایک اور ترجمہ 'چاند شاہی سود خوار' ہے جو 1895 میں کیا گیا۔ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے پانچ ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ ڈراما 'دل فروش' احسن لکھنوی نے 1900 میں اس کے پلاٹ پر لکھا ہے 'ایک اور ترجمہ 'چاند شاہ سود خوار' کے عنوان سے 1895 میں، نذر محمد فتح علی نے 1884 میں 'تاجر وینس' کے نام سے لفظی ترجمہ کیا۔ بابو بالیشور پرشاد بی اے ڈپٹی کلکٹر بنارس نے بھی لفظی ترجمہ کیا۔اور افسوں شاہ جہاں پوری نے 'دل فروش عرف یہودی سوداگر' لکھا ہے۔ ولیم کے اس ڈرامے کے لگ بھگ سب سے زیادہ ترجمے ملتے ہیں۔ جو بہت کامیاب اور مقبول بھی رہے۔

ولیم شکسپیئر اور باقی یورپین ممالک کے کامیڈی اور ٹریجڈی ڈراموں کے علاوہ بھی دوسرے مغربی مصنفین کے ڈرامے اردو اسٹیج پر کافی مقبول ہوئے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے نہ صرف ولیم شیکسپیئر بلکہ دوسرے ڈراما نویسوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور اردو ڈراما نگاری کو پروان چڑھانے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

ان ماخوذات اور تراجم کے علاوہ بھی بہت سارے مغربی ڈرامے اردو کے قالب میں ڈھالے گئے اور اسٹیج کی رونق بنے۔ان کے مطالعے سے یہ تصویر صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو ڈراما نگاری ایک مختلف النوع موضوعات سے روشناس ہوئی ہے بلکہ ڈرامے کی دنیا میں اس نے ایک الگ راہ نکالی ہے جس میں ایک طرف شعوری اور غیر شعوری طور پر مغربی ادب کے نقوش مرتب ہوئے تو دوسری طرف یہ ڈرامے اسٹیج پر شہرت اور مقبولیت حاصل کر کے مالی منفعت کا سبب بھی بنے۔

اگر ان تراجم پر نظر دوڑائی جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے ادبا و شعرا کی ہمیشہ یہ جدو جہد رہی ہے کہ مغربی ادب کے تمام شاہکاروں کو اردو کا جامہ پہنایا جائے جس سے اردو ادب کے شائقین مغربی ادب سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، عنایت اللہ دہلوی، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن، فضل الرحمن، ڈاکٹر منیب الرحمن، سردار جعفری، سجاد ظہیر، خلیل صحافی، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، بادشاہ حسین، خادم محی الدین، جاوید دانش، ظہیر انور اور صدیق عالم کے نام ترجمے کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ القاضی کا اسکول آف ڈراما خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے ولیم شیکسپیئر کے ڈراموں اور دوسرے مغربی ڈراما نگاروں کے ڈراموں کو اردو میں تمام لوازمات اور مکمل طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

**(یہ مضمون الہ آباد یونیورسٹی میں اردو ڈراما کانفرنس 2019 میں پیش کیا گیا)**

■

**Liaquat Ali**
JNU
Delhi - 110067

# الوداع!

# اکرام باگ

اسلم محبوب خان

جدید فکشن کی معتبر آواز ڈاکٹر اکرام باگ 2/ جولائی 2020 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اسی دن اکرام باگ کی تدفین بعد نماز ظہر بسواکلیان ضلع بیدر کے قبرستان میں ہزاروں سوگ واروں کے درمیان عمل میں لائی گئی۔ اکرام باگ میرے استاد محترم تھے۔ انھوں نے راقم سطور کو بی اے میں اردو پڑھائی تھی۔ بسواکلیان ویرشیوا مذہب کے بانی شری بسویشور کی تعلیمی، تہذیبی وروحانی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی شہر میں صاحب کمال صوفی بزرگ حضرت تاج الدین باگ سوار علیہ الرحمۃ آسودۂ خاک ہیں۔

استاد محترم بسواکلیان کی معروف تعلیمی درس گاہ ایس ایس کے بی کالج میں اُردو زبان وادب کے صدر نشین رہے۔ گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ میں بھی ریسرچ گائیڈ کے فرائض انجام دیے۔ انتقال کے وقت استاد محترم الوکیل اورالوحید اسکولس کے نگران تھے۔

ڈاکٹر اکرام باگ کے والدین شیخ محمد باگ اور وزیر بیگم نے ان کی پرورش وتعلیم بڑے ہی اہتمام سے کی تھی۔ ان کے برادر محترم شیخ احمد باگ مرحوم نے ان میں مطالعہ کا شوق وذوق پیدا کیا تھا۔ اسی لیے استاد محترم کو شطرنج تصوف وحکمت اور موسیقی سے بڑی دلچسپی رہی تھی۔ ان کی ادبی سرگرمیاں گلبرگہ میں پروان چڑھیں۔ گلبرگہ میں اکرام باگ کے قریب ترین احباب، حکیم شاکر، حمید سہروردی، حامد اکمل، ریاض قاصدار، لطیف حزیں اور خالد سعید تھے۔ اُستاد محترم اُردو کے مشہور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کو بہت مانتے تھے۔ اکرام باگ کا اصل نام محمد اکرام الدین ہے اور قلمی نام اکرام باگ ہے۔ اکرام باگ 08/ ستمبر 1948 کو بسواکلیان میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد 'عطا کلیانوی حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔

اکرام باگ جدید علامتی اور تجریدی افسانوی روایت کی اہم ترین کڑی مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز شمس الرحمٰن فاروقی کے مشہور زمانہ رسالہ 'شب خون' سے کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے امام خیال کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان وادب میں ایک بالکل نئے انداز اور اسلوب کو فروغ دینے کی کوشش کی جنھیں کامیاب بنانے کے لیے ادیبوں کی ایک پوری جماعت سامنے آئی۔ بالخصوص جو افسانہ نگار علامتی اور تجریدی افسانے لکھنے میں بہت جذباتی نوعیت کی حصہ داری لی ان میں اکرام باگ کا نام بہت نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے۔ ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'دم افعی' کے نام سے شب خون میں شائع ہوا۔ اور فکشن کے مطابق کافی سراہا گیا۔ اکرام باگ کے افسانے ملک اور بیرون ملک کے اہم ترین رسالوں میں تواتر سے شائع ہوئے۔

ایسے رسالوں میں 'شب خون'، 'شاعر'، 'ایوان اردو'، 'بادبان'، اور 'تشکیل' قابل ذکر ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں جدید علامتی افسانوں کی اشاعت میں 'شب خون' سب سے پیش پیش تھا اس طرح پاکستان میں 'اوراق'، بادبان' اور 'تشکیل' جدید ادب اور علامتی افسانوں کو فروغ دینے میں بہت زیادہ سرگرم تھے۔

اکرام باگ چونکہ ایک پیچیدہ اور مبہم اسلوب کے تجریدی افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے افسانوں کے دروبست میں اتر کر ان افسانوں کی مقصدیت، افادیت اور اس کے مرکزی خیال تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کوچ' کے نام سے 1986 میں شائع ہوا جو اپنے اسلوب کے انوکھے پن اور تجریدیت کے نمائندہ اسلوب کی وجہ سے بہت جلد موضوع بحث بن گیا۔ اس کے بہت دنوں کے بعد افسانوں کا مجموعہ 'اندوختہ' کے نام سے 2014 میں شائع ہوا۔ 'کوچ' میں اکرام باگ کے اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔

ایک زمانے تک اکرام باگ خاموش رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ اب اس طرح کے افسانے شائع کرنے والے معیاری رسالے نہیں رہ گئے ہیں اور نہ اس طرح کے افسانے پڑھنے والے قاریوں کی معقول تعداد بچ گئی ہے۔ اس لیے وہ افسانوں کی اشاعت میں دلچسپی لینا چھوڑ چکے ہیں۔ اور بات کچھ یوں بھی ہے کہ علامتی اور تجریدی افسانے لکھنے اور پڑھنے کا ماحول بدل گیا تھا۔ لوگوں نے بہت حد تک اس طرح کے افسانوں کو رد کر دیا تھا۔ اس لیے بھی انھوں نے افسانے لکھنا بند کر دیا۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح کے تجریدی افسانے وہ لکھ رہے تھے۔ یا لکھا کرتے تھے اس طرح کے افسانے کوئی بھی فنکار بہت دنوں تک تواتر کے ساتھ لکھ بھی نہیں سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کے افسانے لکھنے کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ اور بہت غور وفکر کے بعد اس طرح کا افسانہ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے یکساں رفتار سے اس طرح کے افسانے لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ بعد میں کے افسانوں کا جو مجموعہ 'اندوختہ' کے نام سے شائع ہوا اس میں بھی بیشتر ان کے پرانے افسانے ہی شامل ہیں۔ 'اندوختہ' میں ان کے ستائیس افسانے ہیں جن میں پہلے کے اٹھارہ افسانے بھی شامل ہیں۔

انھوں نے 'کوچ' کی اشاعت کے بعد بہ مشکل نو افسانے تحریر کیے۔

چونکہ اکرام باگ فطرتاً بھی تجرید نگار ہیں اس لیے وہ صاف ستھرے اسلوب اور سیدھے سادھے بیانیہ انداز میں کوئی واقعہ، قصہ، یا کہانی بیان کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھے لکھے اور ذہین قاریوں کے لیے بھی مشکل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا تجریدی ڈھنگ جہاں اردو کے عام قاری کے لیے جان لیوا معمہ ثابت ہوتا ہے وہیں افسانے کے ناقد کے لیے بھی چیلنج بن جاتا ہے۔ وہ عام طور پر اپنے افسانوں کو دو اور دو چار کی طرح کھول کر بیان نہیں کر پاتے ہیں۔

اکرام باگ کے افسانوں کا موضوع زندگی کی پیچیدگی سے مملو ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا بیانیہ بھی بہت تہہ دار ہوتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ چاہے عشق ومحبت کے فلسفہ کو موضوع بنائیں یا زندگی کے نشیب وفراز اور کشمکش کو اپنے افسانوں میں پیش کریں۔ یا حیات وموت کے الجھے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ یا محبت کے آفاقی جذبے کی کشش کی تحلیل کریں اور رقابت کی نفسیات کو بیان کریں۔ یا تخلیق کائنات کے مقاصد کو اپنی گرفت میں لانے کی سعی کریں۔ یا پھر خدا، بندہ، اور کائنات کے رشتے کی گتھیوں کو سلجھانے اور انسانی فطرت کی تہہ در تہہ پرتوں کو کھولنے کی کوشش کریں۔ یا پھر تیسری دنیا کے مسائل کو بیان کرنے کی سعی مستحسن کریں۔ وہ ایسا داستانوی، اساطیری، علامتی اور تجریدی اسلوب اپناتے ہیں کہ وہ موضوع اس اسلوب میں گتھ جاتا ہے مگر اس طرح نہیں کہ اسے سرسری طور پر پڑھ کر سمجھ لیا جائے۔

کیونکہ افسانوں کا داستانوی پیرایہ جہاں ذہنوں کو تصوراتی دنیا کی سیر کراتا ہے اور تخیل کے نئے جہانوں سے روشناس کراتا ہے وہیں ان کے بیان کردہ علامتی ساختیے افسانے کو حقیقی زمین سے قریب کرنے کے باوجود ماورا تصور کی سیر کرانے نکل پڑتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مابعدالطبعیاتی اظہار کے پیکر بھی بڑی بے ساختگی سے خلق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ موضوع سے متعلق مختلف قسم کے اقلیدسی زاویے، ہندسے، کلوروفل، گوریلا، ریگستان، اور بوڑھا بندر، آپس میں گھل مل کر ان کے افسانوں کی دنیا کو ذہنی بلا خیزی کا مرقع بنا دیتے ہیں۔ 'اقلیما سے پرے ہوا' اور 'دم افعی' افسانے ان کی اس طرح کے بیانیہ کی مثالوں کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانے متذکرہ بالا باتوں کی توثیق کرتے ہیں۔

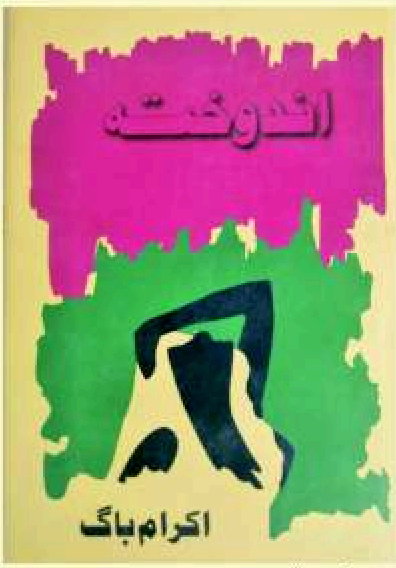


اکرام باگ کے ایک افسانے میں عام طور پر اتنے سارے واقعات کو جذب کر دیا جاتا ہے کہ ان کا بیانیہ تہہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اساطیر اور تلمیحات کا بھی ملغوبہ بن جاتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ عام زندگی کے واقعات کا ذکر افسانے کو اساطیری اور تلمیحی فضا سے نکال کر حقیقی زندگی کی زمین پر کھڑا کر دیتا ہے جو ایک طرح سے انسانی تقدیر کے ملال کی کہانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے چاہے وہ کرکٹ کی کمنٹری ہو یا عورت اور مرد کا رشتہ۔ نہیں بھولنا چاہئے کہ انسان کا پہلا گناہ عورت اور مرد کے رشتے سے ہی وجود میں آتا ہے۔ اور اسی نام نہاد گناہ کے طفیل یہ دھرتی آباد ہوتی ہے اور پھر اس گناہ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی انسان گناہ کر کے اس گناہ سے ہمیشہ کے لیے تائب نہیں ہوتا ہے۔ گویا گناہ اس کی سرشت کا حصہ ہے۔ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے کہ:

''گناہوں سے پاک انسان فرشتہ بن جاتا ہے اور فرشتہ بننے کے بعد وہ کسی کام کا نہیں رہ جاتا ہے۔''

(محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 1980، ص 205)

کھلے طور پر نہیں مگر علامتی انداز میں اکرام باگ انسان کے اولین گناہ کو زندگی کی علامت قرار دیتے ہیں اور اس گناہ کے دراز ہوتے سلسلے کو انسانی مقدر قرار دیتے ہیں۔

اکرام باگ اپنے افسانوں کو اقوال زریں جیسے مقولوں، مکالموں، اور جملوں سے سجا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ضرورت سے زیادہ تہہ دار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایک ایک افسانے سے کئی کئی ایسے جملے پیش کیے جا سکتے ہیں جو اپنے فلسفیانہ انداز کی وجہ سے نہایت معنی خیز اقوال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

''قطرہ اور موتی کے بیچ توفیق کا سلسلہ سب سے بڑا کھیل ہے۔ (توفیق)

ہر اقامت گاہ میں ایک کابوس رہتا ہے جو ہماری تشنگی چوستا رہتا ہے۔ (توفیق)

اپنے آپ کو کم کر! اقامت گاہ تو ایک ہی ہے۔ جہاں کوئی گاہ نہیں۔ (توفیق)

زندگی قرض ہے...... مگر اسے سود کے ساتھ کیوں چکایا جائے۔ (اندوختہ)

ہاں سقوطِ شب کا داستانی حصار تمہاری آنکھوں سے طلوع ہوا تھا۔ (زوالِ رفت میں پچھلی دھند)

میں نے ہلکی تمازت والی صبحوں میں آوازیں دیں مگر پانی پر سفر کرتے سایہ کو مقید کرنے کے لیے کون سا جال میرے پاس تھا۔ (زوالِ رفت میں پچھلی دھند)

اپنے کفر کی شہادت سالک کے ملک کا آخری وقوعہ ہے۔ (زوالِ رفت میں پچھلی دھند)

عمر حادثاتی مناظر کو بھی پراسرار ڈھنگ سے پیش کرنے کا فن سکھا دیتی ہے۔ (زوالِ رفت میں پچھلی دھند)

قیامت بجز اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ خدا کو اپنے مضمحل اعضا کو پھر سے توانا بنانے کا خیال ہو۔ (حیات)

انسان کے مشترکہ دکھ صرف تین ہیں۔ بھوک، غم اور موت۔ (حیات)

تم فلک کی کتنی گردشوں میں خاک کے کس پردہ سے ابھری ہو۔ (تقطیب)

جب آنکھوں سے روشنی چھین لی جائے گی اور سمندر کا پانی ہانپ اٹھے گا تو اے انس وجنس تم کسے پکاروگے۔ (اقلیما سے پرے ہو)

چلم سے نکلتا ہوا دھواں تعلیم گاہ کے جاریہ سبق کا ابتدائیہ تھا (تقیہ بردار)

بیٹے سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ جینے والے نفوس ذات اصغر ہیں۔ (تقیہ بردار)

فہم نے مجھے چکا چوند کیا ہے اس لیے تجلی کا محتاج ہوں۔ (تقیہ بردار)''

اس طرح کے اقوال اور مکالموں سے اکرام باگ کے افسانے بھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کے افسانوں سے چھانٹ چھانٹ کر اس طرح کے مکالمے، اقوال اور جملے جمع کیے جائیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ یہ کسی افسانے سے چنے ہوئے جملے ہیں تو لوگ انہیں کسی فلسفی کے اقوال، یا فکر پارے سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جو افسانہ نگار اپنے افسانوں میں اس طرح کے فکر انگیز جملوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا ہو اس کے افسانوں کی دبازت سے بھلا کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے افسانوں کو مہمل کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہاں دانش افروزی کی مدھم قندیل میں فن کی سلیت کی تاثر آفرینی پر مکالمہ ضرور قائم کیا جاسکتا ہے۔

'دم افعی' اکرام باگ کے مشہور ترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے انسان کے اشرف المخلوقات کی سطح سے گرجانے کا نوحہ بیان کیا ہے۔

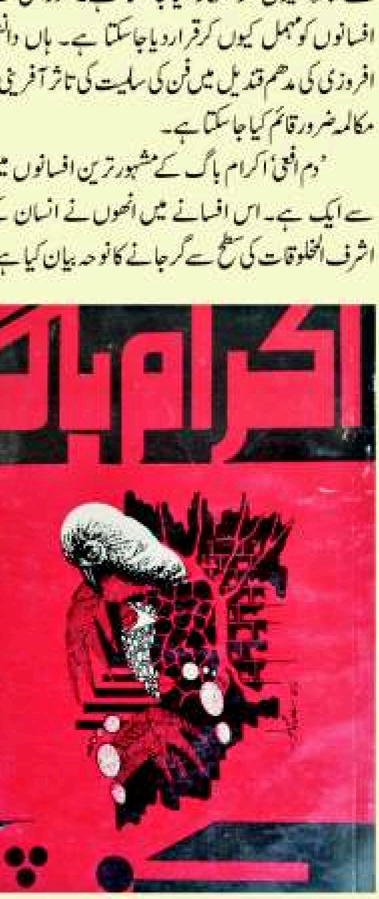

ابلیس جو بدی کا منبع سمجھا جاتا ہے انسان کی بدی، بدکاری، اور اس کی شاطریت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور اسے اپنی بدی بہت چھوٹی اور حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ جس بدی کی وجہ سے اس کا تشخص قائم ہے اس سے کہیں زیادہ بدکار انسان ہو چکا ہے اس لیے اب اس کا تشخص خطرے میں پڑ چکا ہے۔ اس لیے وہ خدا کو کہتا ہے کہ میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اگر میں بد ہوں تو مجھے میری بدی کے ساتھ ممتاز رہنے دیا جائے۔

'مدعا تہہ سنگ' بھی اکرام باگ کے اہم ترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں خدا کی ذات اور تصوف کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور مختلف نظریات کے تناظر میں انسان کی عظمت کو ابھارا گیا ہے اور بڑے فلسفیانہ انداز میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قیامت کیا ہے اور خدا کی ذات کیا ہے اور نور کسے کہا جاتا ہے۔ اخیر میں یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ نور الٰہی دراصل انسان ہی کی ذات میں سرایت کر کے ظہور کرتی ہے۔ اس لیے انسان کو اندر اور باہر سے پاک کرنے کی کوشش دراصل نور الٰہی کی حفاظت ہے۔

'تقطیب' میں علامتی انداز میں نیل گری کی چائے کی مزدور عورتوں پر ہونے والے مظالم کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بوڑھا لال بندر کس طرح ان عورتوں کا استحصال کرتا ہے اور پھر زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے چکر میں کس طرح وہ اپنا کردار بدلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ انھوں نے بوڑھے لال بندر کے گھڑیال سے چپک کر رہ جانے کی علامت کے تناظر میں خوبی سے بیان کیا ہے۔ مگر اکرام باگ کے یہاں تو اکثر کرداروں کے نام تک نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے کردار میں وہ، دو، ہندسہ، وغیرہ ہوتے ہیں۔ مثال کے لیے ان کے افسانے تھیج، جے سی بی، تقیہ بردار، اسیر ہندسہ، اندیشہ، تقلب، تقطیب، عکس، فنا، اور خش پا وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ کرداروں کو نام دینے کا مطلب اس کے وجود کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور نام نہ دینے کا مطلب ایسے غیر اہم قرار دینا ہوتا ہے۔ وہ کرداروں کی عکاسی کے لیے اپنے الفاظ خرچ کرنا بے کار بات جانتے ہیں۔ بقول سید مجیب الرحمٰن:

''وہ اتنی چابک دستی سے استعاروں سے کام لیتے ہیں کہ اس میں کردار کی ساری کیفیت سما جاتی ہے۔ مثلاً چمگادڑ، شاہزادی، شاہزادہ، پرچھائیں، سائرن، سیٹی، کلوروفل زدہ جہاز، 45 درجہ کا زاویہ سور، زنگ آلود ہتھیار، بیساکھی، ریگ زار، بوڑھا بندر، دیمک، دھواں، شیر، بلی، ریگستان، کالا سانپ، گرگٹ، سیاہ عمامہ، گوریلا، اور مرغیاں وغیرہ۔''

(سید مجیب الرحمٰن، دیباچہ، اندوختہ، اکرام باگ 2014 افلاک پبلی کیشن گلبرگہ ص 13)

عام طور پر اکرام باگ کے افسانوں کا لب لباب فکری نتائج ہوتے ہیں یا فلسفیانہ تجرید، اچھے فن پارہ میں جذبوں سے کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور کرداروں کے عمل میں مواخذہ کا مرحلہ طے ہوتا ہے۔ وہ روح کے بارے میں جب مکالمہ کرتے ہیں تو ان کا فلسفیانہ انداز اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ افسانہ حیات کا یہ اقتباس دیکھیے:

''انسان میں جینے کی تمنا کتنی فربہ ہے زندگی خواہ گھسیٹ گھسیٹ کر ہی گزرے مگر وہ موت کے آرام دہ بستر پر سونا نہیں چاہتا، جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا فلسفہ ایجاد کیا ہوگا۔ وہ موت کے وقت بھی یہ یقین کر کے خوش رہتا ہے کہ کم از کم اس کی روح تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی۔''

اس پر بس نہیں ہے وہ سائنسی ایجادات کو بھی کردار کی شکل دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

سائنس داں قفل کے پاس پہنچ کر کہتا ہے ہماری مسکراہٹ میں ہیروشیما کا سارا درد مسکراتا ہے۔ (حیات)

ذہن کی عدم تکمیلی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

''کھانا کھاتے ہوئے میں صرف اس کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ انسان کا شعور اور لاشعور ایک ہو جائے یہی میری آرزو ہے۔ آخر میں مکمل اکائی کیوں نہیں ہوں جس دن آدمی مکمل اکائی بن جائے گا شاید اسے اپنے فنا ہونے کی کسک نہ ستائے۔''

وہ غالباً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک ہم مکمل اکائی نہیں بن جائیں گے فنا کا جھونکا ہماری زندگی کے شجر سے پتے توڑ توڑ کر یونہی گراتا رہے گا۔ اکرام باگ کی مشکل پسندی کو ان کے عہد کے تمام لوگوں نے مانا ہے اور اقرار کیا ہے۔ افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں:

''اکرام باگ کی پہلی کہانی 'دم افعی' اور اس کے بعد تازہ ترین دستیاب کہانی 'توفیق' تک ان کے افسانوں کی پوری طرح افہام و تفہیم نہیں ہو سکی۔ جدید تر کہانی کے اس اہم نام کو محض تجریدی و علامتی کہانی کی ایک مختصر تاریخ کے بارے میں جگہ مل گئی لیکن شاید کہانیاں اپنے باطن میں تخلیقی آگ چھپائے ہوئے ہیں۔ ان پر مکالمہ نہیں ہو سکا۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں مگر ان وجوہ سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف کہانیوں کے باطن اور اکرام باگ کے تخلیقی جوہر سے بھی گفتگو کی جاسکتی ہے کیوں کہ اکرام باگ کی کہانیاں اپنے تمام تر الجھاؤوں کے باوجود نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔''

(افتخار امام صدیقی، بحوالہ، اندوختہ، اکرام باگ افلاک پبلی کیشن گلبرگہ 2014 ص 17)

افتخار امام صدیقی کی بات بہت حد تک درست ہے کہ اکرام باگ کے افسانوں پر اس طرح گفتگو نہیں ہوئی جس طرح ان کے دوسرے ہمعصروں پر ہوئی۔ کیونکہ اکرام باگ کے افسانوں پر گفتگو کرنا اور ان کے افسانوں کے دروبست میں اترنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر اکرام باگ کے یہاں آسان موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز کے افسانے بھی پائے جاتے ہیں۔ جن میں زندگی کے سچے سلگتے مسائل کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں ایک افسانہ 'ادھورا پہیہ' ہے۔ ادھورا پہیہ میں بس محبت کی ناکام کہانی کو بے روزگاری کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کے ان افسانے، 'آبگینہ'، اور 'اندیشہ' میں زندگی کے دکھ درد کو تجریدی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'اندیشہ' میں محبت کی گم شدہ کہانی کو انتشار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی راوی کو معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی اس کی محبوبہ اس کے گھر آنے والی ہے اور ان اندیشوں میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی ناکام محبت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں جٹا پایا ہے اور سارا دن گھر کے باہر رہتا ہے۔ رات میں ڈرتے ڈرتے گھر آتا ہے کہ کہیں اس کا سامنا نہ ہوجائے۔ مگر وہ جا چکی ہوتی ہے۔ اس کی بیوی پوچھتی ہے کہاں دن بھر غائب رہے۔ وہ گول مٹول جواب دے کر ٹال دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ وہ چلی گئی۔ اور اثبات میں جواب پا کر مطمئن ہوجاتا ہے۔ گویا یہ افسانہ ذہنی اور جذباتی فراریت کی کہانی سناتا ہے۔ مگر ان کے کہانی بیان کرنے کا انداز وہی تجریدی ہے۔

اکرام باگ کے افسانے تجریدی اظہار کے عمدہ نمونے ہوتے ہیں اور اینٹی اسٹوری کی تعریف پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ ان کے سبھی افسانے بہت ہی انوکھے انداز میں بیان ہوئے ہیں اور بیانیہ کو نئے انداز کی بشارت سے آگاہ کرتے ہیں۔ کچھ بھی ہو مگر یہ بات اہم اور ضروری ہے کہ اکرام باگ کی کہانیوں کا رنگ تخلیقی اور اقلیدسی ہے۔ اس لیے کہ ہر افسانے میں ریاضیاتی منطق یا سائنسی طریق کار ملتا ہے۔ بقول مہدی جعفر:

''جدید افسانے میں اس طریق کار کا امتزاج بنیادی فنی عوامل کے ساتھ جن کا علاقہ منطق سے پرے ہوتا ہے۔ ایک انوکھی اور اہم خصوصیت ہے۔ اکرام باگ باریک سے باریک نکتوں پر دیر تک ٹھہر کر قاری کو اس کی معنویت اور مفہوم اپنے اظہار کے توسط سے سمجھاتے ہیں۔ البتہ اس طرح ان کے کچھ افسانے اپنی وضاحت اور ایک سطحی داخلیت

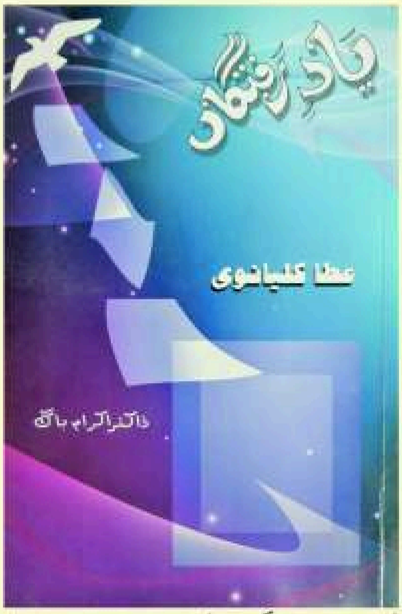


کی وجہ سے افسانہ کم اور مضمون زیادہ معلوم ہوتے ہیں اور ایک وسیع پس منظر کی عدم موجودگی کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کے قائم رہنے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔''

(مہدی جعفر، اندوختہ، مصنف اکرام باگ، افلاک پبلی کیشن، گلبرگہ، 2014، ص 21)

اکرام باگ کے افسانوں کی فضا بڑی پراسرار ہوتی ہے۔ ان کے سبھی کردار اور ان کے افسانوں میں پیش کی گئی ہر دنیا خواب اسرار کی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے کردار ہماری دنیا کے عام انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے سوچنے کا انداز چیزوں کو دیکھنے کا طریقہ اور معاملات سے گزرنے کا طرز بالکل منفرد ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زمان ومکان کا منظر نامہ بھی بالکل الگ قسم کا ہوتا ہے۔ اور اس پر سے طرّہ یہ کہ ان کی نثر بھی بڑی کھردری ہوتی ہے اور بہت حد تک سفاک معلوم ہوتی ہے۔

اکرام باگ کو توجہ اور دلچسپی سے شائع کرنے میں شب خون نے اہم رول ادا کیا اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اکرام باگ شمس الرحمٰن فاروقی کے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب فاروقی صاحب نے شب خون کا انتخاب شائع کیا تو کئی اہم افسانہ نگاروں کو نظر انداز کردیا مگر اکرام باگ کو یاد رکھا۔ انھوں نے اکرام باگ کے افسانوں کی خصوصیت بھی دلچسپی سے بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اکرام باگ کے افسانوں میں زندگی کے رائیگاں جانے کا تصور حاوی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان چیزوں کے ہوجانے کی تمنا جو ہو نہیں سکتی پھر ان چیزوں کی جگہ نقلی چیزیں رکھ کر حقیقت کو بہلانے کی کوشش نظر آتی ہے۔

(اندوختہ کے متکلم وحید نے اپنی لڑکی کا نام اس لڑکی کے نام پر رکھا ہے جو اس کی معشوقہ نہ بن سکی اور خود اس لڑکی نے اپنے بچے کا نام افسانے کے متکلم کے نام پر رکھا ہے) لیکن یہ سب زیاں کیوں ہے چاہی ہوئی چیزیں کیوں قوت سے فعل میں نہیں آئیں؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈھنے کے لیے اکرام باگ قاری کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جھوٹے حل پیش کرکے قاری کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔ 'حیات نامہ' افسانے میں حیات بے معنی زندگی بھی ہے اور افسانہ نگار کے اس کردار کے بھی 'معنی' ہیں جو افسانہ نگار سے کھو گیا ہے یا جدا ہوگیا ہے۔ دونوں صورتوں میں 'حیات' کے معنی تو معلوم ہوسکتے ہیں لیکن کیفیت نامعلوم رہتی ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، مقدمہ، افلاک، مرتبین اکرم نقاش، انیس صدیقی، افلاک پبلی کیشن گلبرگہ)

اکرام باگ اپنی نوعیت کے واحد افسانہ نگار ہیں کہ ان کا طرز اور اسلوب سب سے نرالا اور انوکھا ہے۔ ساتھ ہی مشکل بھی ہے اسی لیے کسی دوسرے افسانہ نگار نے اس اسلوب کو برتنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اپنے وقت کے تمام اہم ناقدوں نے ان کے افسانوں کو سراہا اور ان کے فنکارانہ کمال کا اعتراف کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

''اکرام باگ اردو افسانے کے ایک تاریخی موڑ کی یاد دلاتے ہیں وہ ایک کارواں کے ساتھ بھی تھے اور نہیں بھی تھے ان کی فنکاری ان کی اپنی فنکاری ہے۔''

(گوپی چند نارنگ، فلیپ، اندوختہ، مصنف اکرام باگ، افلاک پبلی کیشن گلبرگہ 2014)

وارث علوی صاحب نے بھی اکرام باگ کے افسانوں کی خوبیوں اور ان کے طرز کے منفرد ہونے کا اقرار کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اردو ادب میں جب جدید افسانے کی آواز بلند ہوئی اس وقت لکھنے والوں میں جو نئے اور جدید افسانہ نگار آئے ان میں اکرام باگ کا نام بہت نمایاں تھا۔''

(وارث علوی، فلیپ، اندوختہ، مصنف اکرام باگ، افلاک پبلی کیشن گلبرگہ 2014)

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اکرام باگ نہ صرف کرناٹک کے ممتاز ترین علامتی اور تجریدی افسانہ نگار تھے بلکہ وہ اردو کے سب سے منفرد افسانہ نگار بھی تھے۔

■

**Dr. Aslam Mahboob Khan**
Dist. Urdu ECo DDPI Office
BIDAR-585401
KARNATAKA
E-mail:aslamkhan.9286@gmail.com
Mobile:+919972009286

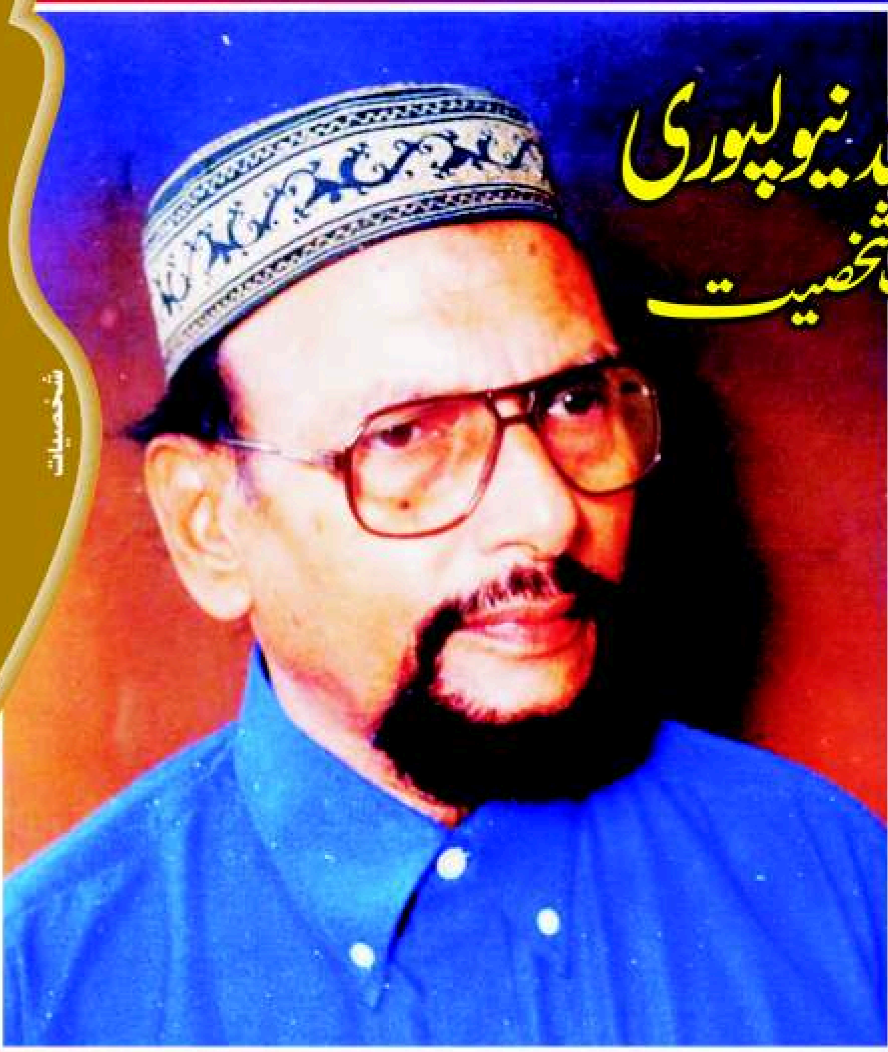

# ڈاکٹر حفیظ اللہ نیوپلوری
## ایک ہمہ جہت شخصیت

سعید رحمانی

ادب خواہ کسی زبان کا ہو وہ نہ صرف اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے بلکہ ادیب وشاعر کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔اس لیے کسی بھی ادبی شخصیت کے تعلق سے کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کی نگارشات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔الفاظ جب افکار کا جامہ پہن کر ایک مخصوص پیکر کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس میں ادیب کی شخصیت پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ ریز ہوتی ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں ادیب کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا جاسکتا ہے۔لفظوں کا دروبست، اسلوب کی ندرت، فکر کی گہرائی، خیالات کی برجستگی اور احساسات کی توانائی ایسے عناصر ہیں جن سے ادبی شہ پاروں کی تشکیل ہوتی ہے۔

اگر محولہ بالا باتوں کو دھیان میں رکھ کر ڈاکٹر حفیظ اللہ نیوپلوری صاحب کی ادبی حیثیت پر غور کریں تو کہنا پڑے گا کہ وہ صرف ماہر لسانیات ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب ادیب، محقق اور انشا پرداز بھی تھے۔اس میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتی کہ ادبی دنیا میں انھوں نے اپنی ایک منفرد شناخت بنائی تھی۔اڈیشا جیسی سنگلاخ زمین کی گمنام حدود سے نکل کر ان کا نام ملک کے طول وعرض میں سب کے لیے جانا پہچانا بن گیا تھا۔

ادب کے علاوہ شاعری' افسانہ نگاری اور صحافت کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ان کے ترجموں کی تو بات ہی نرالی ہے۔اس فن کا سلیقہ ان میں بدرجۂ کمال تھا۔ایک کامیاب مترجم کے لیے ضروری ہے کہ ہر دو زبان پر اسے یکساں دسترس حاصل ہو جب کہ حفیظ اللہ صاحب اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ مقامی زبان اڑیا، انگریزی، ہندی اور بنگلہ پر بھی عبور رکھتے تھے۔اردو کے علاوہ انگریزی اور اڑیا میں بھی آپ کی متعدد نثری اور شعری نگارشات مقتدر رسائل، اخبارات اور ہفتہ وار جریدوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔کٹک کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر حکومت اڑیسہ نے "CuttackOne Thousand Years" نام کی ایک انگریزی کتاب شائع کی ہے اس میں آپ کے دو مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے شہر کٹک کے تعلق سے خصوصی طور پر اور صوبۂ اڈیشا کے تعلق سے عمومی طور پر زبان اردو کی ترقی وترویج اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ساتھ ہی اسلامی معاشرت، تہذیب وثقافت کی جانکاری بھی ہوتی ہے۔یہ دونوں مضامین بہرصورت افادیت کا پہلو رکھتے ہیں۔

ترجموں کے تعلق سے میں نے جو خاص بات حفیظ اللہ صاحب میں دیکھی اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک دفعہ اڈیشا اردو اکاڈمی کی سالانہ تقریب کلا وکاش کیندر میں ہو رہی تھی۔آخر میں مشاعرے کا اہتمام تھا۔اسٹیج پر ڈاکٹر موصوف کو شعرا کی صف میں جلوہ افروز دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ کسی مشاعرے میں اس کے قبل میں نے انھیں بحیثیت شاعر شرکت کرتے نہیں دیکھا تھا۔یہی خیال آیا کہ شاید غزل گوئی شروع کردی ہو۔چند شعرا کے بعد اڑیا کے ایک شاعر کو دعوت سخن دی گئی۔جب اڑیا نظم پڑھی جارہی تھی تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ایک کاغذ پر کچھ نوٹ فرماتے جارہے ہیں۔نظم ختم ہونے پر جب یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو زحمت سخن دی گئی کہ ''اب حفیظ اللہ نیوپلوری صاحب اسی اڑیا نظم کا فی البدیہہ ترجمہ آپ کو سنائیں گے''تو میری حیرت دوبالا ہوگئی اور میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ترجمہ اس قدر کامیاب رہا کہ ہر طرف سے داد سخن ملنے لگی اور پورا ہال صدائے تحسین سے گونج اٹھا۔ان کے منظوم تراجم کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ کبھی اصل کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیتے اور فنی لوازمات وشاعرانہ جمال کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز یوں تو غزل گوئی سے ہوا ہے مگر آزاد پسندی کا فطری میلان شاید تنگنائے غزل کا متحمل نہیں ہوسکا اس لیے جلد ہی وہ نظموں کی طرف مائل ہوگئے۔انھیں جکڑ بندیوں کے سبب شاید انھوں نے پابند نظموں کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔اب تک جتنی نظمیں کہی ہیں، سب کی سب آزاد نظمیں ہیں اور انھیں نظموں کے آئینے میں ان کی شخصیت زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ان کے اولین مجموعہ کلام کا نام ہے' تابوت کی صدا'۔اس میں شامل جملہ نظمیں اڑیا سے ترجمہ شدہ ہیں پھر بھی ان کا شعری حسن وجمال اپنی جگہ مسلم ہے۔مجموعہ میں اگر ترجمہ کی وضاحت شامل نہ ہوتی تو یہی گمان کیا جاتا کہ یہ نظمیں طبع زاد ہیں۔ان خوبصورت نظموں کے عطیہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کاوشیں بہر طور لائق ستائش ہیں اس مجموعے سے ایک مختصری نظم بعنوان' زبان صداقت' پیش

کی جاتی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

جنگلی پیڑ کے نیچے
بے شمار پھولوں کا میلہ
ہوا کے دوش پر
رقص کرتی جارہی ہے
سینۂ گیتی پہ خوشبوؤں کی پھوار
ناچنا، کھیلنا اور ہنسنا بے اختیار
طفل مکتب کھیلتے ہیں جس طرح بے نام کھیل
بحرِ حیات کی ریت پر
خود ساختہ سماج کے آہنی حصار کے پیچھے
رقص کرتے ہیں جیسے
یہ مسرور وشادماں
خوش محنت وخوش رنگ ہیں
باغباں کے لمس کی راحت لیے
نرم ونازک بیل کے
شامیانہ سے در آنے والی روشنی
اور چمکتی گھاس کے
نرم غالیچہ پہ خوابیدہ
آہنی رولر کا پھسلنا

اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'تتلیوں کے پر' (ترجمہ) بھی منظر عام پر آکر اہلِ ادب سے خراج حاصل کر چکا ہے۔ اڑیا نظموں کے مجموعے 'تتلیوں کے پر' سے دو نظموں کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

میں جانتا ہوں رات کی تاریکی میں چپ چاپ
تمھارے قدم، اک انجان منزل کی طرف بڑھیں گے
منزلِ عشرت، محفلِ لذت، دائرۂ شہوت
(تم) گرم باہوں میں اسیر
میں تڑپتا فقیر
مسرت کی کہکشاں پر تمھیں رقص کرتا دیکھ کر
مایوسی اور کرب کے اندھے کنویں میں گر کر
دم توڑنا نہیں چاہتا
میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دو
(نظم: آنکھوں پر بندھی پٹی)

آسمان کے خلاؤں سے ایک
منور پالکی پر بیٹھی
ہمارے آنگن میں اتر آئی ہے لکشمی کی صورت
اس کی ہتھیلیوں میں نکھرا رنگِ حنا
روشن نرگسی آنکھیں اس کی
یقین واعتماد کی دھرتی کو
باندھ رکھا ہو جیسے
(نظم گاؤں کی ایک شام)

اڑیا سے ان نظموں کا ترجمہ ڈاکٹر موصوف نے اس طرح کیا ہے کہ ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ پھر زبان کی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ ساتھ استعاراتی پیرایہ ان نظموں کے شعری جمال میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔ تیسرا شعری مجموعہ 'صرف تمھارے لیے' ڈاکٹر منورما مہاپاترا کی اڑیا نظموں کا ترجمہ ہے۔ اس کی تمام نظموں کو ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب نے حسبِ معمول بڑے فنکارانہ انداز سے اردو لباس عطا کیا ہے۔ گاؤں کے دلکش پس منظر میں بیشتر نظمیں دیہاتی زندگی کی سادگی، معصومیت، دل فریبی، رومانیت، مسرت وشادمانی اور حزن وملال کے لافانی جذبات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان احساسات کا بلیغ اظہار ڈاکٹر صاحب کی ان پیکر تراشیوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً آکاش کے پیلے دامن پر، دکھ کی ندی، سکون کا جزیرہ، گونجتی خاموشی، آرزوؤں کے پنکھ، عمل کی فاختہ، خدشات کے حصار میں مقید وقت وغیرہ۔ اڑیا زبان پر اچھی دسترس ہونے کے سبب انھوں نے منورما مہاپاترا کی شاعری کے باطنی آہنگ کو نہ صرف بخوبی سمجھا ہے بلکہ نثری نظم کا شعری پیکر عطا کر کے انھیں ایک فطری تازہ کاری بھی بخش دی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد قمر الدین خاں (سابق وائس چیرمین برہمپور یونیورسٹی) 'صرف تمھارے لیے میں مجموعی طور پر تمام نثری نظمیں بہت اچھی ہیں۔ امید ہے قارئین اسے ذوق وشوق سے پڑھیں گے۔ اگرچہ ترجمہ روایتی نظم کی صورت میں نہیں ہے پھر بھی یہ نثری ترجمہ اردو میں ایک بیش بہا اور گراں قدر اضافہ ہے۔''

حفیظ اللہ صاحب کا ادبی سفر 1955 سے شروع ہوتا ہے جب کہ ان کی اولین کہانی بحر العلوم بچوں کے رسالہ 'پھلواری' دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ تب سے تقریباً نصف صدی پر محیط ان کا ادبی سفر برابر ارتقا کی طرف جاری رہا۔ میرا یہ دعویٰ شاید غلط نہ ہو کہ اڈیشا میں ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے بعد اگر کوئی دوسری شخصیت ادبی حلقوں میں معتبر اور مسلّم تصور کی جاتی ہے تو اس کا نام ہے ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری۔

نصف صدی کے اس طویل عرصے میں ڈاکٹر صاحب نثری ادب کی تخلیق میں زیادہ تر فعال رہے ہیں۔ اس صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اصل میدان شاعری نہیں بلکہ نثری ادب ہے۔ مختلف ادبی رسائل وجرائد میں جتنی نگارشات ان کی حیات میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہیں:

افسانے: 30، تحقیقی مضامین: 72، انشائیے: 79، ادبی مقالے: 25، تبصرے: 5، (یہ فہرست کوئی 15 سال پرانی ہے)

علاوہ ازیں ایم فل کے تحت لکھا گیا مقالہ 'مغل تماشا کا تجزیاتی پہلو' ایک ایسی تخلیق ہے جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا (مغل تماشا اڑیا زبان میں لکھا گیا ایک ڈراما ہے جس میں اردو کا استعمال کثرت سے ہوا ہے)۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں 'مغل تماشا' کے سیاق وسباق پر بحث کرتے ہوئے جن گوشوں کو منظر عام پر لایا گیا ہے وہ اب تک ہماری نظروں سے مخفی تھے۔ ان سے جہاں اردو کے ہمہ گیر اثرات کا پتہ چلتا ہے وہیں اس کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تحقیق سے جڑے اسکالروں کے لیے بھی یہ کارنامہ مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ بہرحال اردو ادب میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ آپ کا دوسرا تحقیقی مقالہ 'اڑیسہ میں اردو' پی ایچ ڈی کی غرض سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی بلاشبہ ایک بیش بہا تخلیق ہے جس کی اشاعت کا اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو ادب، نئی دہلی نے کیا تھا۔ 'بھارت میں اردو' نام کی ایک کتاب میں شمولیت کے لیے اس مقالے کا توسیع شدہ مسودہ بھی انھوں نے بعد میں داخل کیا تھا۔ یہ مقالہ اس لیے معرکۃ الآرا سمجھا جائے گا کہ اس میں صوبہ اڈیشا کی ادبی وتخلیقی پیش رفت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب 'اڑیسہ میں اردو' کل چھ ابواب میں منقسم ہے جن کے تحت اڈیشا میں اردو کا سیاسی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر، اردو شاعری اور نثر نگاری کا ارتقا، اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے، صحافت، اردو تعلیم، ادبی وثقافتی ادارے، اشاعتی سرگرمیاں اور اردو کی موجودہ صورت حال کی تفصیلات درج ہیں۔ اس کتاب سے اڈیشا میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کی مکمل صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ کارنامہ بہر طور لائق تحسین ہے جس کی دستاویزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

افسانے ہوں یا رپوتاژ، سیاسی مضامین ہوں یا تحقیقی مقالات ہر جگہ ان کے وسیع مطالعے اور دروں بینی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ جس طرح تحریر میں شوخی، برجستگی، معنی آفرینی اور فکری صلابت کا گہرا رنگ نظر آتا ہے اسی طرح تقریر اور نجی گفتگو میں بھی فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ مزاح اور بذلہ سنجی مترشح ہوتی ہے۔ اندازِ بیان اس قدر دلچسپ کہ خشک موضوعات کو بھی لفظوں کی پیکریت سے جاذبِ توجہ بنا دیتے تھے۔ یہ خوبیاں فنی ریاضت کی دلیل ہیں۔ تجربے کی پختگی اور فکر کی بالیدگی نے ان کے فن کو نکھارا ہے اور اس میں وسعت، گہرائی وگیرائی پیدا کی ہے۔ ان کی شوخیٔ تحریر سے لطف لینے کے لیے چند اقتباسات پیش ہیں۔ طنز ومزاح کے معروف شاعر اسماعیل آذر کے تعلق سے اپنے مقالہ 'ظرافت کے سوداگر' میں رقم طراز ہیں:

''اسماعیل آذر قد میں عمیق حنفی کے حریف ہیں تو شکل میں فلم اسٹار اوم پوری کی طرح۔ صورت میں گلوکار

غلام علی کی طرح 'پرکشش'۔ اب آپ ان کے قد کی وضاحت پر مصر ہیں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ 'ہائی ڈیسک' کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تو گلے سے نیچے تک ڈیسک ان کی ستر پوشی کرتا ہے اور سامعین کو صرف ایک انتہائی معصوم چہرہ مائیک کے پیچھے ڈولتا ہوا نظر آتا ہے اور ان کے پڑھنے کا انداز محفل کو قہقہہ زار بنا دیتا ہے۔''

یہاں یہ بتا دوں کہ مرحوم اسماعیل آذر کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں تھے اور وہ ٹھگنے قد کے تھے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے مذکورہ خاکہ کھینچا ہے جس میں مزاح کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اسی خاکہ میں ایک جگہ اس بات کی وضاحت بھی ہے کہ آذر نے اپنا پہلا تخلص سعیدی ترک کرکے سنجیدہ شاعری سے مزاحیہ شاعری کی طرف کس طرح چھلانگ لگائی۔ ڈاکٹر صاحب کا دلچسپ انداز بیان ملاحظہ ہو:

''اسماعیل آذر نے اپنے تازہ تخلص کی رعایت سے فن آذری میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری ان کے قد سے بلند ہونے لگی۔ لیکن شروع ہی میں انھیں اپنی عزت اور اپنا قد عزیز رہے ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی شاعری ان کے قد سے نکل رہی ہے تو انہوں نے ایک چھلانگ لگائی اور تڑ سے سنجیدہ شاعری کی کھائی پار کر گئے۔''

ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے تعلق سے بعنوان 'برصغیر کے ایک عظیم شاعر وتنقید نگار ....ایک کلوز اپ' تعارفی کلمات کا آغاز اس طرح کیا ہے:

'شعاؤں کی صلیب' پر کھڑے ہو کر 'اضافی تنقید' کے کشت زار میں 'آب خضر' کا تقاطر کر کے 'لفظوں کے آسمان' پر اُڑنے والے کسی برق رفتار پرندے کی طرح اردو شاعری، تنقید اور ریاضیات کے بیکراں سمندر کی تہوں میں جا کر چشم زدن میں الفاظ ومعنی کے گہر تلاش کرنے والے ادیب، شاعر، تنقید نگار، صحافی، دانشور اور ماہر ریاضیات ڈاکٹر کرامت علی کرامت کا شخصی جائزہ پیش کرنے سے قبل مجھے ان کی رفاقت کی چار دہائیوں کا ذہنی محاسبہ کرنا پڑتا ہے تو قلم کی جولانی ماہ وسال کے زینوں پر ناٹک ٹوئیاں کرتی ہوئی یہاں پہنچتی ہے''۔ (نوٹ: واوین کے اندر دیے گئے نام ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے مجموعوں کے نام ہیں)

'افسانہ تجکیتیا کا ہاتھ' اڑیا کہانی کا ایک کامیاب ترجمہ ہے۔ اس میں ایک بوڑھی عورت کو بھکارن کے روپ میں دیکھ کر راوی کے ذہن میں جب ماضی کے واقعات ابھرنے لگتے ہیں تو ان کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

''میرے ذہن کے جھروکوں پر ماضی کے ٹمٹماتے چراغ پھر سے لو دینے لگے۔ ہاں یاد آیا ایک بار بچاری

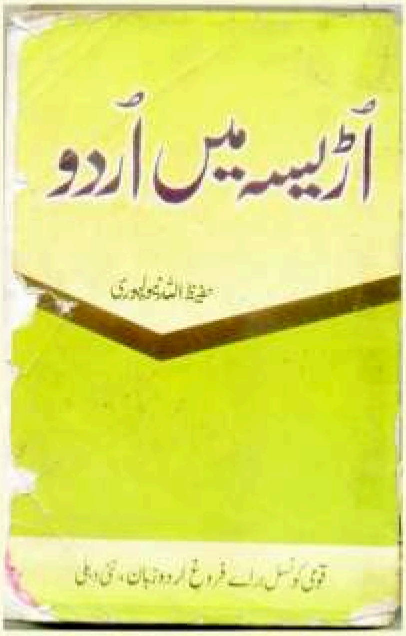


اپنی بیوی کو لے کر ہسپتال آیا تھا۔ دو دنوں سے بچاری درد زہ میں مبتلا تھی۔ مجھے یاد ہے....''

مندرجہ بالا اقتباسات اگرچہ ڈاکٹر صاحب کی نمائندہ تخلیقات میں سے نہیں ہیں تاہم ان کے مطالعے سے فن کار کی قوتِ مشاہدہ اور باریک بیں نظروں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ رچا بسا شعری ذوق پایا تھا 'سخن فہمی اور سخن شناسی سے بھی متصف تھے اس لیے ان کی نثری نگارشات میں بھی شاعرانہ حسن و جمال اور پیکر تراشیوں کے بڑے عمدہ نمونے مل جاتے ہیں۔ خصوصاً خاکہ پیش کر رہے ہوں تو لگتا ہے کہ لفظوں میں مصوری کی جا رہی ہے۔

ادب سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ ایک خلیق انسان اور ایک مشفق دوست کی صورت میں نظر آتے تھے۔ طبیعت بڑی باغ و بہار پائی تھی۔ ان کی پہلو دار شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن کے مصداق تھی۔ ہنس مکھ، ملنسار اور پہلی ہی ملاقات میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لینے کی صلاحیت گویا ان کی شناخت بن چکی تھی۔ راہ چلتے کسی انجان شخص سے مل بیٹھنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ خصوصاً بس یا ٹرین کے سفر میں ایسے مواقع بڑی آسانی سے انھیں میسر آجاتے۔ اس پر مستزاد ان کی خوش کلامی اور بذلہ سنجی تھی۔ بات بات میں مزاح کا پہلو ڈھونڈ نکالنا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ ہم کلام حضرات اگر اجنبی ہیں تو ان کی شیرینی گفتار سے لطف اندوز ہوتے اور اگر بے تکلف دوستوں میں سے ہوں تو انھیں ذو معنی فقروں سے نوازا جاتا۔

راقم الحروف کو چونکہ ان کی طویل رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اس لیے ان کی تہہ دار شخصیت کے مختلف گوشے یادداشت کے خانوں میں محفوظ ہیں۔ میں ان کو مدرسہ سلطانیہ کی طالب علمی کے عہد سے جانتا ہوں۔ ادبی سفر کا آغاز بھی تقریباً ہم نے ایک ساتھ کیا۔ یہ پانچویں دہے کی بات ہے۔ دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار 'پیام مشرق' میں ہم دونوں کی تخلیقات پہلو بہ پہلو شائع ہوتی رہی ہیں۔ پھر اعلا تعلیم کی غرض سے دہلی میں قیام اور بعد میں بھدرک کالج سے وابستہ ہو جانے پر وہ ایک لمبی مدت تک کٹک سے باہر رہے۔ اس دوران رفاقت کا سلسلہ تقریباً منقطع رہا۔ اس میں تجدید اس وقت ہوئی جب بھوبنشور سے ہفتہ وار 'سہارا' کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ چونکہ اس کے حلقۂ ادارت میں دیگر چند احباب کے علاوہ ہم دونوں بھی شامل تھے اس لیے رفاقت میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی۔ پھر ان سے آئے دن ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ کبھی آپ بیتی تو کبھی جگ بیتی دہرائی جاتی یا کبھی شعر و ادب پر تبادلۂ خیال ہو جاتا تھا۔ بلا کسی ذہنی تحفظ کے میں کہنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری ایک معروف ادیب ہی نہیں ایک اچھے دوست بھی تھے۔

کٹک کے مضافات میں واقع ایک گاؤں نیولپور میں ان کی ولادت جنوری 1936 کو ہوئی تھی۔ مدرسے سے تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر اسکول اور کالج سے ہوتے ہوئے جے این یو سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اڈیشا کے مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی ادبی مشغلہ بھی جاری رہا اور ایک معتبر ادیب، محقق، ناقد، صحافی اور مترجم کی حیثیت سے ہندوستان گیر سطح پر اپنی مستحکم شناخت بنائی۔ عمر کے آخری حصے میں بیمار رہنے لگے اور آخر کار صاحبِ فراش ہو کر طویل علالت جھیلنے کے بعد 8 مئی 2019 کو اپنی جان جان آفریں کو سونپ دی۔ ان کے انتقال سے اڈیشا کی ادبی فضا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا آسانی سے پر ہونا ممکن نہیں۔

**حوالے**

کٹک ایک ہزار سال: کٹک کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر حکومتِ اڑیسہ کی جانب سے مطبوعہ ایک انگریزی کتاب
تابوت کی صدا (مجموعۂ کلام) از ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری
مغل تماشہ کا تجزیاتی مطالعہ "
اڑیسہ میں اردو "
'آنکھوں پر بندھی پٹی' (نظم) صفحہ 4 فروغ ادب بابت جنوری تا مارچ 91
'گاؤں میں ایک شام' (نظم) صفحہ 37 نیا دور لکھنؤ بابت اکتوبر 93
'ظرافت کا سوداگر' صفحہ 2 ہفتہ وار سہارا بابت 18-11 مارچ 88
'برصغیر کے عظیم شاعر وتنقید نگار' ص 2۔ 12-8 جنوری
'تجکیتیا کا ہاتھ' (افسانہ) صفحہ 4 سہ ماہی فروغ ادب جلد 2 / شمارہ 4 /
'صرف تمہارے لیے' (شعری مجموعہ) ترجمہ از ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری 1996

■

**Sayeed Rahmani**
Editor 'Adabi Mahaz' Deewan Bazar
Cuttack - 753001 (Odisha)

# حافظ احمد علی خاں شوق اور ان کی علمی خدمات

ساجدہ شیروانی

رامپور اپنے قیام سے ہی علم و دانش کے مرکز کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے جس نے بڑے بڑے بیرونی علما ادبا شعرا اور دیگر فنکاروں کو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں پر بٹھایا ان کی مہمان نوازی کی، بلکہ خود اس سرزمین سے بھی بڑے بڑے کاملین فن، فضلا اور دانشور پیدا ہوئے جنھوں نے رامپور کو شہرت دوام عطا کی۔ ایسے ہی دانشوروں اور کاملین کے فہرست میں "تذکرۂ کاملان رامپور" کے مولف حافظ احمد علی خاں شوق کا نام نامی بڑی اہمیت کا حامل ہے جنھوں نے اپنی اس تالیف سے اپنے وقت کے مشاہیر فن کے ناموں اور کاموں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ رامپور اور اہل رامپور اس ضمن میں ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔

حافظ احمد علی خاں شوق 31 جنوری 1863 کو رامپور کے ایک باعزت اور نامور خاندان میں پیدا ہوئے۔ مشہور عالم دین مفتی سعد اللہ صاحب قاضی القضاۃ اودھ و ریاست رامپور اور مشہور زمانہ علی برادران کا تعلق اسی خاندان سے تھا انھوں نے قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد زمانے کے دستور کے مطابق فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم حاصل کیے۔ 1882 میں مقامی سوار فوج میں ملازمت کی 1887 میں گوالیار چلے گئے اور سیواجی راؤ ہولکر کی فوج میں بحیثیت کپتان شامل ہو گئے 1889 میں ملازمت ترک کر کے رام پور واپس آ گئے اور 1891 میں ریاست کے محکمۂ نزول میں قائم مقام منصرم مقرر ہوئے۔ 1897 میں انھیں حکیم اجمل خاں صاحب کی ماتحتی میں سرکاری کتب خانے جو آج دنیا بھر میں رام پور رضا لائبریری کے نام سے مشہور ہے کا منصرم مقرر کیا گیا۔ 1904 میں منصرم کتب خانہ کے فرائض کے علاوہ انھیں مصرف خیر، اوقاف اور مرمت مساجد وغیرہ کا کام بھی سپرد ہوا۔ 1905 میں کتب خانے کی خدمت کے ساتھ ساتھ انھیں افسر کارخانہ جات کا عہدہ بھی تفویض ہوا۔ 1906 میں انہیں کمیٹی ذات خاص کا ممبر نامزد کیا گیا۔ 1908 میں شہرۂ آفاق مدرسہ عالیہ کی کمیٹی کے بھی ممبر مقرر ہوئے اور آخر میں کتابخانہ ریاست رامپور اور جواہر خانے کے نگراں رہے۔ ڈیوڑھی کے لقب سے سرفراز ہوئے اور 1931 میں ریٹائر ہوئے۔ اس طرح تقریباً چونتیس برس کے لمبے عرصے تک انھوں نے کتب خانے کی خدمت کی۔ آپ کے حسن خدمات کو دیکھتے ہوئے 1906 میں انھیں ریاست کی طرف سے تمغۂ حامدیہ بھی عطا کیا گیا تھا۔ 20 دسمبر 1933 کو آپ کا انتقال ہوا۔ یوں تو انھوں نے رامپور اور ریاست گوالیار میں اہم عہدوں پر رہ کر خدمات انجام دیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ان کو اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع کتب خانے سے منسلک ہونے کے بعد ہی ملا اور یہی بقول خود ان کے اُن کا اصل ذوق تھا۔ ان کی ساری تصنیفات اور تالیفات اسی دور کی یادگار ہیں جنھوں نے خود ان کے نام کو بھی تاریخ میں امر کر دیا۔

حافظ صاحب کے منصرم کتب خانہ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے کتب خانے میں موجود عربی کتابوں کی فہرست کی تیاری کا کام نئے انداز پر شروع کیا جس کی پہلی جلد 1902 میں 12x16 انچ سائز کے 732 اوراق پر شائع ہوئی اس سلسلے کی دوسری جلد 1928 میں رامپور کے سرکاری مطبع سے طبع ہوئی۔ شوق صاحب نے ان فہرستوں کی تیاری میں یہ انتظام کیا کہ اس میں کتاب کا نمبر شمار، نام کتاب، مصنف کا نام، تصنیف کا سن، قلمی یا مطبوعہ اور اگر قلمی ہے تو کس کے قلم کی لکھی ہے، صفحات کی تعداد اور کیفیت میں اس کتاب کے متعلق دوسری معلومات جیسے کتاب کی حالت اور اس میں کہاں سے کہاں تک حالات درج ہیں بھی فراہم کر دیں، کہیں اگر ایک جلد میں کئی کتابیں مجلد تھیں تو ان کو بھی علیحدہ کر دیا گیا۔ اسی جدید انداز پر فارسی کی مطبوعہ و قلمی تاریخی کتابوں کی بھی ایک جامع فہرست برٹش میوزیم کی فارسی مخطوطات کی فہرست کی طرز پر تین جلدوں میں 'فہرست کتب تاریخ فارسی' کے نام سے تیار کی۔ ایک نئی بات اس فہرست میں یہ اختیار کی گئی کہ کتاب کا کال نمبر یا نمبر موجودات بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ پہلی جلد میں 105 فارسی کی تاریخی مطبوعہ و قلمی کتابوں کا اندراج ہے جو 179 صفحات پر محیط ہے۔ اس جلد کا سائز 33x26 سینٹی میٹر ہے اس جلد کی آخری کتاب 'تاریخ طبرستان و رویان و مازندران' ہے۔ دوسری جلد جو 119 کتابوں کی فہرست ہے اس میں 106 سے 225 نمبر تک کی کتابیں درج ہیں 335 صفحات پر مشتمل ہے اور آخری کتاب 'داستان ترکتازان ہند (مطبوعہ) ہے۔ جبکہ تیسری جلد میں 278 کتابوں کی فہرست ہے جس میں 226 نمبر سے 504 تک کی کتابیں شامل ہیں اس جلد کی آخری کتاب 'روز نامچہ عبدالقادر خاں' ہے اور 326 صفحات میں ہے لیکن یہ فہرست شائع نہیں ہو سکی۔ عربی اور فارسی کتابوں کی ان فہرستوں کے علاوہ کتب خانے میں موجود انگریزی کتابوں کی فہرست بھی آپ نے تیار کی۔ آپ سے پہلے کی تیار کردہ فہرست نا قابل بھروسہ تھی چنانچہ آپ نے اس فہرست میں کتابوں کو فن وار طریقے سے لکھا اور ساتھ میں اس کے سنہ طباعت کے ساتھ مقام طباعت کے سلسلے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے سفر بھی نادر کتابوں کی تلاش میں کیے اور کتب خانے کو حتی الامکان سنوارنے اور منظم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ کتب خانے سے تعلق کے بعد ہی حافظ صاحب کی تصنیف و تالیف کے شوق کو جلا ملی چنانچہ ان کی ان فہرستوں کے مطالعے سے ہی یہ بہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ حافظ صاحب کا انداز تحریر کیا تھا اور وہ کوئی بھی تصنیفی کام کرتے وقت اس کی گہرائی میں اتر جاتے تھے۔ تحقیق و جستجو کا مادہ ان کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھتا۔ ان فہرستوں کے علاوہ حافظ صاحب کی دیگر تصنیفات میں 'ترجمۂ سفر ابن جبیر اندلسی'، 'ترجمۂ مناقب العارفین'، 'شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ' کے علاوہ تذکرہ کاملان رام پور اور تاریخ کتب خانہ عالیہ دارالریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور وغیرہ اہم ہیں۔

اوپر کی فہرست کی پہلی تین کتابیں مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں:

1. ترجمۂ سفر ابن جبیر اندلسی عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتاب ہے جو حکیم اجمل خاں مرحوم کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ اس میں احمد علی شوق کا مختصر لیکن نہایت عالمانہ اور معلومات افزا مقدمہ ہے جس سے ان کی عالمانہ بصیرت اور محققانہ انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے 338 صفحات کی یہ کتاب مطبع احمدی سے 1900 کے آس پاس شائع ہوئی۔

2. ترجمۂ مناقب العارفین شمس الدین افلاکی کی معروف فارسی کتاب 'مناقب العارفین' کا اردو ترجمہ ہے اصلی

کتاب 718 ھ میں تصنیف ہوئی۔ افلاکی نے مولانا روم کو دیکھا تھا لہٰذا اس نے مولانا روم کے دادا سے لے کر 718 ھ تک کے ان کی اولادوں کے حالات اور سلسلۂ بیعت اس کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ شوق نے یہ ترجمہ 'ترجمۂ اردو مقامات مولانا روم صاحب معروف بہ مناقب عارفین' کے نام سے کیا ہے۔ جو کتابی شکل میں 540 صفحات پر 1921 میں مطبع احمدی رام پور سے شائع ہوا۔

3. شوق کا تیسرا ترجمہ شہنشاہ جرمنی کے سفر قسطنطنیہ سے متعلق دنیا بھر کے انگریزی، عربی ترکی اور اردو اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا کتابی شکل میں اردو ترجمہ ہے۔ شوق کی یہ کتاب بھی حکیم اجمل خاں صاحب کے کہنے پر مطبع احمدی سے ہی مارچ 1899 میں 77 صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ ان کتابوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شوق کو عربی فارسی اردو کے علاوہ انگریزی اور ترکی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا کہ وہ ترجمہ جیسا مشکل کام انجام دے سکے۔

ان تراجم کے علاوہ احمد علی شوق کی دو اہم ترین کتابیں جن کے ذریعہ ان کا نام ہمیشہ اردو ادب میں زندہ و تابندہ رہے گا 'تذکرۂ کاملان رام پور' اور تاریخ کتب خانہ عالیہ دارالریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور ہے۔

"تذکرۂ کاملان رام پور' رامپور کے اہل کمال بزرگوں اور مشاہیر فن حضرات کا تذکرہ ہے جنھوں نے اپنے کاموں کے ذریعہ رام پور کا نام دنیا کے نقشے پر ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا۔ یہ تذکرہ کل 560 صفحات پر مشتمل ہے جس میں 458 صفحات پر رامپور کی 531 نامی گرامی شخصیتوں کے علاوہ 102 صفحات پر خود ان کے اپنے خاندان کے 14 بزرگوں کے حالات نہایت دیدہ ریزی، تلاش و تحقیق اور جستجو کے بعد جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ کام انھوں نے ایک دو سال میں نہیں بلکہ 1914 سے 1929 کے لمبے عرصے میں تقریباً 15 سال کی طویل مدت میں انجام دیا ہے۔ پہلی بار یہ تذکرہ مارچ 1929 میں 20x26 سائز پر محمد جعفری پرنٹر و پبلیشر کے زیر اہتمام ہمدرد پریس واقع کوچہ چیلان دہلی سے شائع ہوا تھا جس کی قیمت تین روپے تھی اور اس کا انتساب نواب سر سید محمد حامد علی خاں صاحب بہادر والئی رامپور کے نام کیا گیا تھا۔ ان کا یہ کام اردو ادب کی تاریخ میں ایک عظیم کارنامے کی حیثیت سے زندہ رہے گا جس نے نہ صرف بہت سے ایسے لوگوں کا نام اور کام محفوظ کر دیا ہے جن کا ذکر اس تذکرے کے علاوہ کہیں دستیاب ہونا مشکل ہے گویا انھوں نے ان حضرات کو زندۂ جاوید کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ نیز یہ کہ برصغیر میں علم و ادب کی کوئی بھی تاریخ بغیر اس کتاب سے استفادہ کیے نہیں لکھی جاسکتی۔ تذکرہ کاملان رام پور کی دستاویزی اہمیت اور اور اس کے کمیاب بلکہ نایاب ہوجانے کی وجہ سے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے اس کا دوسرا ایڈیشن 1986 میں طبع ہوا۔ لیکن اس جدید ایڈیشن میں ضمیمے کے طور پر کافی تصحیحات اور اضافہ جات شامل ہیں جن سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے ان کی دوسری اہم کتاب تاریخ کتب خانہ عالیہ دارالریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور ہے۔ تاریخ کتب خانۂ عالیہ کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کا نمبر 140 ہے۔ مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے مرحوم مولانا عرشی صاحب (سابق ڈائریکٹر رامپور رضا لائبریری) نے لکھا ہے:

"خط اچھا نستعلیق، کالی روشنائی اور کاغذ دیسی مل کا ہے۔ مرور ایام سے بوسیدگی پیدا ہو چلی ہے۔ جلد نئی ہے۔ ورق ا۔ الف کے بالائی حاشیے کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مؤلف کے کتاب خانے کا نسخہ ہے اوراق 48، سطور 17، اور ناپ 20x32 سینٹی میٹر ہے۔ مؤلف نے ابتدا میں عربوں کے خصائل ذاتی بیان کیے ہیں اس کے بعد عربوں میں فن کتابت کے آغاز کا ذکر کیا ہے۔ بعدازاں عربوں کے طبائع پر اسلام کا اثر دکھایا ہے، پھر عربوں میں ترجموں کی ابتدا، اسلامی سلطنتوں میں کتاب خانوں کی کثرت، عام کتاب خانوں کی ابتدا، ہندوستان میں اسلامی کتب خانے پر بحث کر کے والیان رام پور کے کتاب خانوں کی ابتدا، ہندوستانی اسلامی کتب خانے پر بحث کر کے والیان رام پور کے کتاب خانوں کا ذکر شروع کیا ہے جو کتاب کا اصل موضوع ہے اور اس کی ابتدا نواب سید علی محمد خاں بہادر سے لے کر نواب سید حامد علی خاں بہادر کے عہد (1904) تک کے حالات بیان کیے ہیں۔"

اس مخطوطے کو وقار الحسن صدیقی صاحب سابق او ایس ڈی رضا لائبریری کے دور میں 1998 میں لائبریری نے فہرست مضامین اور اشاریہ کے اضافے کے ساتھ 'تاریخ کتاب خانۂ رضا' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

اردو صحافت کے فروغ میں بھی رام پور نے اہم کردار ادا کیا ہے اور اسے فروغ دینے میں احمد علی خاں شوق کا نام بھی سر فہرست ہے۔ سرزمین رامپور سے پہلا گلدستہ 'ریاض سخن' کے عنوان سے 20 جنوری 1885 کو نکلنا شروع ہوا تھا۔ در اصل حافظ شوق رام پوری کی رہائش گاہ پر ہر ماہ ایک شعری نشست منعقد ہوا کرتی تھی جس میں رامپور اور بیرون رامپور کے اہم شعرا شامل ہوتے تھے اس شعری نشست میں جو کلام پڑھا جاتا تھا اس کو ریاض سخن گلدستہ میں شائع کر دیا جاتا تھا پہلے شمارے میں جن شاعروں کا کلام شائع ہوا ان میں سید اعجاز حسین اعجاز تلمیذ داغ دہلوی، محمد بشیر خاں بشیر تلمیذ داغ، مرزا رحیم حیا دہلوی، محمد رفیع الدین خاں دانش تلمیذ داغ، اور سید شمس الزماں رئیس آگرہ و تلمیذ داغ وغیرہ شامل ہیں۔ گلدستہ کے سر ورق پر حسب ذیل شعر درج ہوتا تھا۔

کدھر ہو تم اے عندلیب معانی    چلو پھول لوٹو ریاض سخن کے

اس گلدستہ کے بانی احمد علی شوق رام پوری تھے۔ یہ مطبع نیر اعظم سے ماہوار شائع ہوتا تھا، 36 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں اس کی اشاعت کے سلسلہ میں دو تاریخی قطعات بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ خود حافظ احمد علی شوق کا ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے آخری مصرعے سے ہجری اور عیسوی سنہ برآمد ہوتے ہیں۔

گلدستہ انتخاب سخن کا ہے بے مثال
یکتائے روزگار ہے رنگیں ادائے دہر
تاریخ ہے مسیحی و ہجری بہم یہ شوق
مجموعۂ ریاض سخن، پر فضائے دہر
1885    1302ھ

ریاض سخن کے علاوہ حافظ احمد علی خاں شوق نے 'ادیب ہند' کے نام سے ایک اور رسالہ جاری کیا تھا، جو ہفت روزہ تھا اور یہ یکم اپریل 1885 کو جاری ہوا تھا۔ اس کو بھی اپنے زمانے میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، اس میں منظومات کا حصہ بہت کم ہوتا تھا زیادہ زور خبروں پر دیا جاتا تھا۔

شوق صاحب کے پاس اپنی ذاتی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں قلمی اور مطبوعہ دونوں ہی تھیں جو صولت لائبریری رامپور میں منتقل کر دی گئی تھیں۔

حافظ صاحب کی علمی و ادبی زندگی کا ایک پہلو ان کی شاعری بھی تھی وہ شوق تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ شوق کے شعری نمونے مختلف گلدستوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان گلدستوں میں ان کی طرحی غزلیں موجود ہیں۔ ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق صاحب غزل گوئی کے روایتی انداز پر غزلیں کہتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عاشقانہ موضوعات کے مختلف پہلوؤں کو نظم کیا گیا ہے لیکن سادگی اور سلاست و روانی سے ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

بقول مرحوم ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری صاحب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) و سابق ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ "حافظ صاحب فن شعر گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے خاص میدان غزل گوئی تھا۔ کلام میں شگفتگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ داغ کا رنگ نمایاں ہے۔"

■

**Sajida Sherwani**
Persian Cataloguer
Rampur Raza Library
Rampur - 244901 (UP)

ظفر گلزار

# نورجہاں ثروت

## منفرد لہجے کی شاعرہ

خواتین شعرانے اردوادب کے ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک میں شاعرات اپنی نظمیہ شاعری میں نسوانی آزادی کی بات کرتی ہیں۔ جدیدیت کے دور میں اظہار آزادی پر اصرار کرتی ہیں تو مابعد جدیدیت میں وہ سماجی قیوذ رسوم کے خلاف پر زور احتجاج بھی درج کراتی ہیں۔ جب ہم ایسی باہمت شاعرات کی بات کرتے ہیں تو کشور ناہید' شفیق فاطمہ' فہمیدہ ریاض' پروین شاکر' ادا جعفری' زہرہ نگاہ' شہناز نبی' ترنم ریاض' اشرف رفیع' صغریٰ عالم' ساجدہ زیدی' زاہدہ زیدی' رفیعہ شبنم عابدی، عذرا پروین، شائستہ یوسف اور نورجہاں ثروت کے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنے زورِ قلم سے خواتین کی آزادی کی صدا بلند کی۔

نورجہاں ثروت کی پیدائش دہلی میں 28 نومبر 1949 کو ہوئی۔ ان کی پرورش ان کی نانی کے سائے میں ہوئی۔ جب انہوں نے دہلی کالج میں داخلہ لیا تو شعبۂ اردو کے صدر مشہور شاعر جناب جاوید وششٹ تھے' تو ثروت کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوگیا اور وہ بہت جلد معیاری اشعار کہنے لگیں۔ ادب کے مطالعے کا جذبہ بھی بتدریج بڑھتا ہی جارہا تھا اور وہ معیاری مضامین بھی لکھنے لگیں۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز 1970 میں اردو کے مشہور رسالے 'سیکولر ڈیموکریسی' سے ہوا۔ وہ واحد خاتون ہیں جنھیں اردو صحافت کی 'خاتون اول' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انھیں کئی اہم اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں لالہ جگت نرائن صحافت ایوارڈ (1985)' راجدھانی سوتنتر لیکھک ایوارڈ (1986)' نشانِ اردو برائے ادبی خدمات (1989)' نئی آواز برائے صحافت ایوارڈ (1994)' میر تقی میر ایوارڈ (1995)' انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف فار ایجوکیشن فار ورلڈ برائے صحافت (1999)' قومی تحفظ و بیداری ایشین اکیڈمی آف فلم اینڈ ٹیلی ویژن ایوارڈ (2000)' میڈیا انٹرنیشنل ایوارڈ (2002) اور اردو اکادمی دہلی ایوارڈ (2010) شامل ہیں۔

یہاں یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جارحانہ انداز میں زندہ دلی کے ساتھ گزارتی رہیں مگر ان کی شاعری میں اس جارحانہ پن اور زندہ دلی کا عنصر کم ہی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی بات بہت ہی سبک انداز میں کہنے کی حامل رہی ہیں، ان کی غزلیں اور نظمیں اس طرز کی عکاس ہیں۔ وہ تمام عمر اکیلے پن اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہیں۔ یہی نوحہ وہ اپنے شعری مجموعے 'بے نام شجر' میں گاتی نظر آتی ہیں۔ یہ مجموعہ 1995 میں منظرِ عام پر آیا اور مقبولیت کی بلندیاں حاصل کیں۔

انہوں نے اپنی غزل اور نظم کے ذریعے عصری مسائل پر خوب لکھا ہے۔ ان کے یہاں عشق و محبت کی باتیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کا اس طرح سے اظہار کرتی ہیں جو قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ ان کی زبان میں دہلی کے رنگ کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نورجہاں ثروت کا انتقال پرملال 17 اپریل 2010 کو دہلی میں ہی ہوا۔ ان کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جسے اردو شعر و ادب میں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا مگر وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ نورجہاں ثروت کو بچپن سے لے کر ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک تمام طرح کے نامساعد حالات کا سامنا رہا۔ انہوں نے زندگی کو قریب سے جینا سیکھا اور یہی سچائی ان کی شاعری میں نظر بھی آتی ہے۔ شاید زندگی کی انھی تلخیوں کی وجہ سے وہ اپنی بات کو بے باک انداز میں کہتی چلی گئیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر انسانی اور سماجی قدریں انسان کی ٹھوکروں میں ہیں اور شاید یہ قدریں

آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ انسانی رشتے آج اپنا وجود کھو چکے ہیں اور ایسے پرآشوب دور میں اپنی بات کہنا اور سماج سے منوا لینے کا فن بھی نور جہاں ثروت بخوبی جانتی تھیں۔ ان کی ایک نظم 'ہواؤں کا انتظار' کا ایک بند اسی کیفیت کا غماز ہے۔

آواز کبھی نہیں مرتی
اس کے درمیان
وقت بھی حائل نہیں ہوتا
اگر کبھی میری بات سننے کو جی چاہے
آواز کو کان ترسیں
اور مجھے تم اپنے درمیاں نہ پاسکو
تو تصور کی کھڑکیاں کھول کر
ہواؤں کا انتظار کرنا

وہ اپنی شعری دنیا میں اپنے آپ کو ایک شجر کی مانند محسوس کرتی ہیں' جس کی شاخیں زمین کے اوپر، نیچے اور سبھی جانب دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس ملک کی ہوا اور دھوپ نے ان کی بے حد پیار سے پرورش کی ہے حتیٰ کہ وہ ایک تناور درخت بن گئیں۔ اپنی ٹھنڈی چھایا وہ اس دنیا کو دینا چاہتی ہیں' جس سے اس زمین کا قرض ادا ہو جائے۔ مگر حالات کی سختی کی وجہ سے یہ تناور درخت اس زمین سے اکھڑ چکا ہے۔ اس نظم میں شاعرہ اپنی سرزمین کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی ہے کیونکہ وہ یہیں پیدا ہوئی' پلی بڑھی اور جب اس سرزمین کے لیے کچھ کرنے کا وقت آیا تو وہ کہیں نہیں تھیں۔

اپنے آپ کو نامساعد حالات میں زندہ رکھنا بے حد مشکل امر ہے اور نور جہاں ثروت نے تو تمام زندگی ہی تنہائی میں گزار دی۔ اس خالق کے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں تھا اور وہی سخت حالات میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اسی لیے وہ کہتی ہیں کہ ہمارے اندر کچھ کرنے کی چاہ اور آرزو تھی اس لیے کوئی بھی طوفان ہماری زندگی کے اس چراغ کو بجھا نہیں سکا۔

وہ جب عورت پر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج کرتی ہیں تو ان کی شاعری میں متانت' سنجیدگی اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ ان کا لہجہ تب بھی شیریں ہی رہتا ہے اور وہ ہلکے پھلکے مگر مؤثر انداز میں اپنی بات رکھتی ہیں۔ وہ غزل کی لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں اور ایسے الفاظ کا استعمال کرتی ہیں جو ترش نہیں ہوتے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

کر رہی ہے جو مرے عکس کو دھندلا ثروت
میں نے دنیا کی کوئی بات نہیں مانی ہوگی

(بے نام شجر' صفحہ 43)

نور جہاں ثروت اپنی خودداری بے حد عزیز ہے۔ ان کو یہ منظور نہیں کہ ان کی شخصیت یا ذات میں کوئی دوسرا شریک ہو کر ان کے خیالات یا ان کے احساسات پر کوئی پہرا لگائے۔ وہ اپنے درد و غم کو خود ہی اٹھا رہی ہیں۔ اب ان کے فیصلوں میں کوئی شریک نہیں ہے اس لیے ان تکالیف کو اٹھانے میں بھی انہیں مسرت حاصل رہی ہے۔

وہ سماج کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر بھی بے حد سنجیدہ طنز کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ 'نفرت کی آگ تو کبھی بھی بھڑکائی جاسکتی ہے جس سے ملک کا نظام تو درہم برہم ہو جائے گا مگر ہمیں اس آگ کو بھڑکانے کی جگہ بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔' وہ ان یادوں کے سہارے زندگی گزار رہی ہیں جو کبھی ان کی زندگی کا خاصہ تھیں۔ اس جھوٹی اور مکار دنیا میں حق اور انصاف کی بات کرنے والا کوئی نہیں بلکہ حق بات کہنے والے کو سنگسار کر دیا جاتا ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے تو ان کا لب ولہجہ ہم عصر شاعرات کے مقابلے میں بے حد انفرادیت کا حامل ہے۔ انھوں نے زندگی کے اتار چڑھاؤ' سیاسی' سماجی و معاشرتی معاملات کو اپنی غزل میں بے حد سبک اور شیریں انداز میں برتا ہے۔ ذرا ان کی غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جو سلسلے رشتوں کے تھے سب ٹوٹ چکے ہیں
بس یادوں کی محراب پہ زنجیر تچی ہے

(بے نام شجر' صفحہ 45)

شریک ذات ہو کوئی یہ کب گوارا تھا
ہمیں خوشی ہے کہ غم اپنا خود اٹھانا پڑا

(ایضاً' صفحہ 29)

آگ نفرت کی تو جب چاہو لگا سکتے ہو
شعلے نفرت کے کسی روز بجھا کر دیکھو

(ایضاً' صفحہ 20)

ہر ایک دور میں سچ کہہ کے سنگسار ہوئے
ہمارے حق میں زمانے کا فیصلہ کب تھا

(ایضاً' صفحہ 21)

**اپنے آپ کو نامساعد حالات میں زندہ رکھنا بے حد مشکل امر ہے اور نور جہاں ثروت نے تو تمام زندگی ہی تنہائی میں گزار دی۔ اس خالق کے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں تھا اور وہی سخت حالات میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اسی لیے وہ کہتی ہیں کہ ہمارے اندر کچھ کرنے کی چاہ اور آرزو تھی اس لیے کوئی بھی طوفان ہماری زندگی کے اس چراغ کو بجھا نہیں سکا۔**

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نور جہاں ثروت کی غزل کا انداز گفتگو اپنی ہم عصر شاعرات سے یکسر جداگانہ تو ہے ہی ساتھ ہی موضوعات کے تنوع کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تشبیہیں' استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں وہ جدید ذہن کی عکاس ہیں۔ جس طرح غزلیہ شاعری میں انہوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اسی طرح ان کی نظمیہ شاعری بھی کمال کلام رکھتی ہے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں مختصر اور طویل نظمیں لکھی ہیں' خاص طور پر ان کی نثری نظمیں تو اپنے دور کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

وہ اپنی نظم میں کچھ اس انداز سے گفتگو کرتی ہیں کہ ان کے تصور میں ان کا خوبصورت بچپن لوٹ آیا ہے۔ اس بچپن پر وقت کی دھول نظر نہیں آتی اور ان کے بزرگوں کی شفقتیں اور محبتیں بھی ان کو میسر تھیں۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آنے والا وقت بے رحم ثابت ہوگا اور ہر انسان ذمے داریوں کے چلتے اپنا وجود کھو دیتا ہے' صرف یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ آج وہی یادیں شاعرہ کو بچپن میں واپس لے جاتی ہیں جہاں کوئی لوری سنا کر سلا رہا ہے۔ ہر انسان اپنے بچپن کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے' روح بے قرار رہتی ہے کہ کسی طرح بچپن کو پھر سے حاصل کر لیا جائے اور شاعرہ نے بھی یادوں کے جھروکوں میں اپنے بچپن کو پا لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا مسافر تصور کر لیتی ہیں جس کی منزل کا انہیں بھی پتہ نہیں ہے اور خیالات کو حقیقت سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑتی ہیں کہ شاید ان کے بچپن کے حسین لمحات انہیں حاصل ہو جائیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں ان کی نظم کی کچھ سطور ملاحظہ کیجیے۔

آج کھویا ہوا بچپن مرا لوٹ آیا ہے
وہی بچپن کہ جو کھیلا تھا
محبت کے حسین آنگن میں
وقت کی دھوپ نے جھلسایا تھا جس کو
شفقتیں اس پہ نچھاور تھیں
محبت قرباں
اس کو معلوم نہ تھا
سخت بھی ہوتی ہے زمیں
اور ہوتا نہیں آنچل بھی کوئی
وقت بے رحم ہے سب کچھ چھین کے لے جاتا ہے
اور رہ جاتے ہیں یادوں کے
نقوشِ مبہم
آج پھر یادوں نے پہنا ہے لباسِ رنگیں
آج پھر بوئے وفا آئی ہے

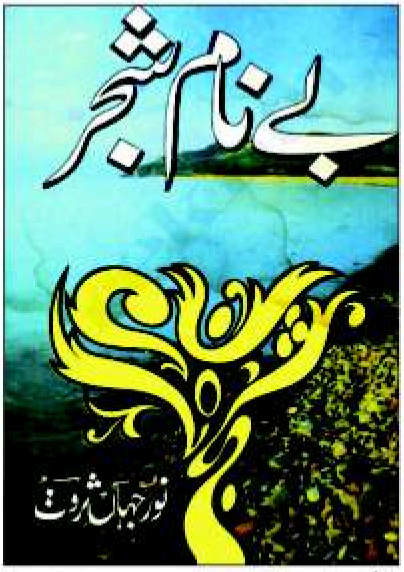


پھر وہی پیار کی لوری
مدتوں ذہن ترستا رہا جس کی خاطر
مدتوں روح نے ڈھونڈا
وہی بیتا لمحہ
لے گیا تھا جو کبھی مجھ سے چرا کر مجھ کو

(بے نام شجر' صفحہ 85-86)

نورجہاں ثروت اپنی زندگی کے حقائق اور تخیلاتی دنیا کے تجربات کو ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ یہ بھی سچائی ہے کہ انسان کی زندگی میں کچھ خوبصورت لمحات بھی مقدر ہوتے ہیں۔ جب اس کو مشکل راہ سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ اپنی ان یادوں میں کھو جاتا ہے جو بے حد حسین تھیں۔ وہ اس کو تسلی و تشفی عطا کرتی ہیں کہ آج اگر یہ مشکل وقت آیا بھی ہے تو کل پھر وہ خوبصورت لمحات میسر ہو سکتے ہیں۔ یہی حالات ان کی اس نظم میں نظر بھی آتے ہیں۔

ان کی ایک اور شاندار مگر طویل نظم 'اپنے لیے جیو' ہے، اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

زندگی کا مقدر
نئے خواب ہیں
تم بھی درپن کو دل کے اجاگر جان لو
تم آج بھی خود کو پہچان لو
زیست جینا بھی ہے
زیست مرنا بھی ہے
تجربہ زہر ہے
اس کو پینا بھی ہے
دوسروں کے لیے
تم بھلا کیوں جیو
زہر پینا ہے گر
اپنی خاطر پیو

(بے نام شجر' صفحہ 125)

اس نظم میں ثروت خواتین کے درد و کرب اس طرح بیان کرتی ہیں کہ اس میں نسوانی حسیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس نظم کے ہر لفظ میں ان کے درد اور کرب و الم کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کرب کی ایک داستان ہے جو آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ وہ استعاراتی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے مرد کے ذریعے ہونے والی زیادتیوں کو عیاں کرتی ہیں۔ دوسری جانب وہ خود سے مخاطب ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی دوسروں کا سہارا بنتی رہی اور ان کی زندگیوں کو روشن کرتی رہیں مگر انہیں کیا ملا؟ صرف اندھیرا، اکیلا پن اور آنسو۔ اب چھوڑو ان سب باتوں کو اور اب صرف اپنے لیے جینے کی کوشش کرو۔ وہ اس دنیا کے جھوٹ اور فریب کو دیکھ رہی ہیں، ان کو اندازہ ہے کہ وہ پھر دھوکا کھائیں گی مگر انسانوں پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے اور وقتی خوشی حاصل کرنے کے لیے ایک شخص کے فریب میں آجاتی ہیں۔

ان کی ایک اور لازوال نظم ہے 'بے چہرہ خیال' جس میں وہ دنیا کی بے ثباتی کا احوال پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس دنیا میں جنم لینا بے کار ہے، کیونکہ دنیا کے حالات بہت خراب ہیں۔ یہاں ہر طرف بارود ہے جس کی وجہ سے سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ اب لوگوں کے پاس خیال یا نظریہ بھی باقی نہیں ہے۔ سبھی کے چہرے غم زدہ ہیں، اب کسی شخصیت کی کوئی شناخت باقی نہیں ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے بربادی ہی دکھائی دیتی ہے اور انسانیت بھی دم توڑ رہی ہے اور انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ اس کا نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

ایک زخمی پرندے کی طرح
بے چہرہ خیال
الجھ گیا ہے اچانک مجھ سے
کیا شکل دوں اسے
کچھ سمجھ نہیں آتا
ہر چہرہ لہولہان، زخمی، ماتم کناں
ہاں
جنم دن کس لمحہ تعزیز کا عنوان ہے
وہ دن
جب ہم نے دنیا میں آنکھیں کھولیں
اور سب کو چہکتے مہکتے دیکھ کر
بے نام خوف سے چیخ پڑے، چلا اٹھے
یا وہ یوم اشتیاق
جب جسم میں نازک جذبوں کی انگڑائی نے
رگوں میں بھری تھیں چنگاریاں
یا وہ روز حسرت ناک
جب پیار کی موت
روح میں اتر گئی تھی نغمۂ جاوداں کی صورت

(بے نام شجر' صفحہ 133-134)

اسی طرح ان کی ایک نظم 'لہو کے ہتھیار' ہے جس میں نورجہاں ثروت کہتی ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم و ستم کیوں کر رہا ہے؟ یہاں انسان کیوں شیطان بن گیا ہے؟ بڑا ملک چھوٹے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے یا دنیا پر اپنا اقتدار جمانے کے لیے انسانیت کا خون بہا رہے ہیں۔ اس نظم کا ایک بند دیکھیے۔

وہ جن کے دعوؤں میں شیطانیت ہے
غرور جن کی متاع جاں ہے
نحوستوں کے
تباہیوں کے
دلوں میں اپنے ارادے لے کر
وہ ہو کے بے باک سوچتے ہیں
ذرا جو مل جائے اور طاقت
تو ساری دنیا
ہمارے قدموں پہ آ گرے گی
ہمیں ہی سجدے کیا کرے گی

(بے نام شجر' صفحہ 130-131)

اس طرح نورجہاں ثروت کی شاعری کے مطالعے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں انسانی رشتوں کے نشیب و فراز اور بکھرتی ہوئی انسانی قدروں کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز ہی سنائی دیتی ہے۔ وہ ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بات کرتی ہیں۔ نئے خواب اور نئی راہیں ہموار کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ ان کے تمام انسانی رشتے ٹوٹ گئے تھے اور ایسی زندگی کے درد و کرب کو بھولنے یا کم کرنے کی خاطر اپنی یادوں، اپنے خواب اور تصورات کا سہارا لے کر زندگی گزار دیتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ذہنی و قلبی سکون کی تلاش میں متحرک رہیں مگر حاصل نہ ہو سکا۔

■

**Dr. Zafar Gulzar**
Directorate of Translation and Publications
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032
M:9966818593
Email: drzafargulzar@gmail.com

اسلم مصباحی

# شب خون کی چالیس سالہ ادبی خدمات

اردو کی ادبی صحافت میں 'شب خون' کی حیثیت ایک رجحان ساز رسالے کی ہے۔

'شب خون' کا پہلا شمارہ بابت ماہ جون، 18 مئی 1966 کو منظر عام پر آیا، مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا انتخاب کیا گیا۔ اداریے کے علاوہ پروفیسر سید احتشام حسین، فراق گورکھپوری، حبیب احمد صدیقی، اپندر ناتھ اشک، رام لعل، خلیل الرحمن اعظمی، مسیح الزماں، سلیمان اریب، اور عمیق حنفی کی تخلیقات اس میں شامل تھیں۔ ماہنامے میں جو کالم بنائے گئے وہ اس طرح تھے: جدید فرانسیسی نظمیں، روسی افسانہ، ہندی افسانہ، بھیانک افسانہ، نفسیات جنسی، کتابیں، کہتی ہے خلق خدا، سوانحی گوشے، اخبار و اذکار اور ہندوستانی موسیقی وغیرہ۔ مسلسل چالیس برس تک جاری رہنے والے اس رسالے کے کل 299 شمارے شائع ہوئے، جون 2005 میں شب خون کی اشاعت بند کردی گئی۔ مدیر، نائب مدیر اور ترتیب و تہذیب کے حوالے سے قمر احسن، ساقی فاروقی، محمود ہاشمی، عقیلہ شاہین وغیرہ کئی نام شب خون کی پیشانی پر درج ہیں لیکن یہ حقیقت کسی سے چھپی نہیں ہے کہ اس کے روح رواں از اول تا آخر شمس الرحمن فاروقی ہی رہے، یہ انھیں کا فکری پرتو ہے۔ 'شب خون' کے اجرا کے وقت پاکستان سے رسائل و جرائد کی آمد سیاسی کش مکش کی بنا پر سست پڑ چکی تھی، لکھنے پڑھنے والوں میں کم حوصلگی کا زہر سرایت کر جانے کے سبب حوصلہ افزائی کے راستے محدود ہو رہے تھے۔ ادب کی رہ گذر کو روشن کرنے والے علمی و ادبی رسالوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ پرانے لکھاریوں کی اچھی تخلیقات ناپید ہوتی جا رہی تھیں لہذا تجربہ کار قلم کاروں اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے رسالے کی کمی محسوس ہو رہی تھی، الہ آباد کے کچھ باہمت ادیبوں اور چند دیگر احباب نے ماہنامہ نکالنے کی فکر کی، بوڑھے جوان سبھی محفل میں شریک ہوئے اور اس خیال پر لبیک کہا۔ مالی تعاون کے لیے جمیلہ فاروقی نے ہاتھ بڑھایا جو اس وقت قدوائی گرلس کالج الہ آباد کی پرنسپل تھیں، بالآخر 'شب خون' وجود میں آیا۔

1955 کے بعد ہی سے اردو ادب میں نئی آوازیں اٹھنے لگی تھیں، 1960 میں اردو شعر و ادب میں ترقی پسندی کے بر خلاف ایک نئے رجحان نے جنم لیا، صنعتی و سائنسی پیش رفت اور مغربی علوم کی ترقی نے انسانی معاشرے میں بحرانی صورت حال کو جنم دیا۔ ایسے میں شعرا و ادبا نے روایتی شعر و ادب سے انحراف کر کے اظہار کے لیے نئے وسیلوں کو تلاش کیا تا کہ موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل اور نفسیاتی کشمکش کو احاطۂ بیان میں لایا جا سکے۔ چنانچہ 1960 کے بعد نظریاتی و تخلیقی رجحانات میں بدلتی ہوئی فضا دکھائی دینے لگی اور جلد ہی یہ تبدیلی جدیدیت کے غالب رجحان کی صورت اختیار کر گئی۔ مارکسیت کے بعد ادبی افق پر جدیدیت کا رجحان ہی سب سے قوی ثابت ہوا۔ تخلیق کاروں کی نئی نسل نے ہیئت اور موضوع کے نئے نئے تجربات کیے، اظہار کے نئے سانچوں کی تلاش میں لسانی تشکیل کا سہارا لیا۔ ادب میں پیچیدہ مسائل کو موضوع بنانے کے سبب اظہار میں بھی پیچیدگی در آئی جس نے ابہام، علامت، تجرید، استعارہ سازی، داخلیت اور لفظ کی معنویت کو جنم دیا۔ ادب کی تخلیق کے لیے جدید عناصر کے استعمال کی ایسی فضا بنی کہ روایتی شاعر و ادیب بھی جدید لفظیات کا سہارا لینے لگے اور جدید معاشرے میں پھیلے ہوئے پیچیدہ مسائل سے بھری پڑی زندگی سے نادر تجربات کی تلاش میں نکل پڑے۔ 'شب خون' انھیں تخلیق کاروں کی نئی پود کے لیے اور تازہ تخلیقی رجحان کی ترجمانی کے لیے جاری کیا گیا ایک پلیٹ فارم ہے۔ ڈاکٹر انور سدید شب خون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"1965 کی جنگ کے بعد سرحدیں بند کر دی گئی تھیں، اور دونوں اطراف کے سیاست دان عوام الناس کے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کر کے تنگ نظری کو فروغ دے رہے تھے اور نفرتیں پھیلا رہے تھے۔ اس کشیدہ فضا میں شمس الرحمن فاروقی نے 'شب خون' اور وزیر آغا نے 'اوراق' جاری کیا تو بالواسطہ طور پر دونوں نے اردو ادب کی قدیم روایت کے مثبت زاویوں کو قائم رکھتے ہوئے جدید ادب کو متعارف کرانے اور سینئر ادیبوں کے احترام اور وقار میں اضافہ کرنے اور ان سے راہنمائی حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے ساتھ ہی نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو ادب کی طرف راغب کرنے

اور ان کے مادی باطن سے روحانی شخصیت بازیافت کرنے کی کوشش بھی کی۔''

(سہ ماہی روشنائی [فاروقی نمبر] جولائی تا ستمبر، 2003، ص 227، کراچی)

اردو کی ادبی صحافت میں 'شب خون' اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ شب خون ادبی جمود و تخلیقی تعطل کے احیا اور مارکسی نظریات پر شب خون مارنے کی غرض سے جاری کیا گیا۔ شب خون نے اولاً 'ادب برائے ادب' یا 'فن برائے فن' کا نعرہ بلند کیا، اس کے بعد ادیب وفنکار کی فکری و تخلیقی آزادی کی وکالت کی، سیاسی وسماجی وابستگی، اصول و قوانین کی پابندیوں کو ادیب کے لیے معیوب گردانا تاکہ وہ پوری طرح آزاد رہ کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکے۔ ڈاکٹر انیس صدیقی لکھتے ہیں:

''شب خون نے قلم کاروں کو تعطل، جمود، نظریاتی حصار بندی، فارمولا بازی، ازم، مینی فیسٹو کی کال کوٹھری سے نکال کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے مواقع فراہم کیے۔''

(شب خون کا توضیحی اشاریہ، جلد اول، ص 22، ناشر: قومی اردو کونسل، نئی دہلی 2017)

شب خون کے اپنے متعینہ مقاصد تھے جو ادب کے حوالے سے خلوص پر مبنی تھے، تجارتی منفعت، مقابلہ آرائی، خودنمائی یا تقلید سے اس کا تعلق نہیں تھا، شب خون نے ابتدائی دور میں ہی خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی جس کے پیچھے اس کی نادر تخلیقات، فکر انگیز مضامین، بہترین تراجم اور دنیا جہان کی فلسفیانہ ونظریاتی بحثیں کار فرما تھیں جو اردو کے قارئین کے لیے نادر تھیں، اب قارئین کی نظر میں 'شب خون' صرف ماہنامہ نہیں بلکہ ایک زاویۂ نگاہ بن گیا تھا جس نے ادب کی تخلیق کے لیے نئے معیارات اور ادب کی تفہیم کے لیے راستے کشادہ کیے، شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''میں نے شب خون کا اجرا کئی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ نئے ادب کو فروغ دینا تھا اور اس بات کی تردید کرنی تھی کہ ترقی پسندی ادب کے زوال یا اس کے کمزور پڑ جانے کے بعد ہمارے ادب میں جمود آگیا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلا اشتہار جو پروفیسر احتشام حسین نے بنایا تھا۔ اس کے الفاظ تھے 'کیا ادب میں جمود ہے'؟ اس کا جواب ہے 'شب خون'۔ لفظ 'شب خون' کی معنویت آپ پر عیاں ہوگئی، یہ اشتہار ہم لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا اور ڈاک سے بھیجا۔ دوسرا مقصد تھا الہ آباد کے نئے لکھنے والوں کو سامنے آنے کا موقع فراہم کرنا۔ تیسرا مقصد تھا ادب میں نظری مباحث قائم کرنا اور ادب کی نوعیت پر ہر پہلو سے غور وفکر کے لیے میدان مہیا کرنا۔ چوتھا مقصد جو پہلے مقصد ہی کا حصہ کہا جا سکتا ہے، یہ تھا کہ ادب میں نئے تجربات کو فروغ دیا جائے۔ پانچواں مقصد تھا ہندوستان اور غیر ملکوں کی زبانوں کے اچھے ادب کے نمونے تراجم کے ذریعے پیش کرنا۔ چھٹا مقصد تھا ایک ایسا رسالہ جاری کرنا جس میں چھپنے کی وہی توقیر ہو جو بڑے پاکستانی پرچوں مثلاً 'سویرا' یا 'نیا دور' میں چھپنے پر حاصل ہوتی ہے۔''

(بحوالہ: شب خون کا توضیحی اشاریہ، جلد اول، ص 23، ناشر: قومی اردو کونسل 2017)

شب خون کو ایک پلیٹ فارم کے طور پر قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد ادب میں نظری مباحث قائم کرنا اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کے لیے اشاعت کا موقع فراہم کرنا تھا، ابتدائی دور میں ہی شب خون میں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا ایک مضبوط حلقہ بن گیا۔ شب خون میں موضوعاتی، فکری اور تخلیقی تنوع ایسا دل چسپ تھا کہ عوام وخواص اس کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ ہندوستانی شعر وادب، تہذیب وثقافت، آرٹ اور مصوری کے تعلق سے متنوع مضامین نے علمی وادبی حلقے میں نئی جوت جگادی۔ اورنگ آباد سے قاضی سلیم اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''شب خون نے پانچ شماروں ہی میں ہندوستان کی ادبی فضا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے رسالے کو ابدیت کے چکر میں ڈالنے کے بجائے بدلتے ہوئے وقت کے زندہ مسائل کا آئینہ دار بنایا ہے۔'' (شب خون، شمارہ نمبر 7، بابت ماہ دسمبر 1966، ص 76)

شب خون کو اس مقبولیت تک پہنچنے اور قارئین کی داد وتحسین جیتنے میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، مالی دشواریوں کے علاوہ ادبی حریفوں کے سخت اختلافات بھی راہ کا روڑا بنے، ترقی پسندوں نے 'شب خون' کو زیر کرنے کے لیے رجعت پرستی، سیاسی شعور کے فقدان، اہمال پرستی، سماجیت سے فرار اور قاری کی ضروریات سے بے نیازی جیسے الزامات لگائے۔ شب خون کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے (حوالہ: شب خون، شمارہ 293، ص 619) شب خون کو کاؤنٹر کرنے کے لیے مقابل میں کئی رسائل بھی جاری کیے گئے لیکن 'شب خون' نے تمام الزامات سے نہ صرف دامن بچایا بلکہ اپنے نظریۂ ادب کو فروغ دینے کے لیے نہایت جرأت کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ شب خون کی اس بے مثال کامیابی کے پیچھے جتنا شمس الرحمٰن فاروقی کا حصہ ہے اتنا ہی محترمہ جمیلہ فاروقی [بیگم شمس الرحمٰن فاروقی] کا حوصلہ اور تعاون بھی کارفرما ہے۔

'شب خون' چالیس سال تک پوری آن بان سے چھپتا رہا، ادبی صحافت کی تاریخ میں 40 سال کا طویل عرصہ بہت اہمیت کا حامل ہے، اردو کے ادبی رسائل کی اوسط عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی، ماہانہ ہونے کے سبب چالیس سال کی مدت میں 480 شمارے چھپنے چاہیے تھے لیکن 299 ہی چھپ سکے، بیچ میں رسالہ دوماہی اور سہ ماہی کی حیثیت سے بھی چھپا، 1973 سے 1994 کے بیچ شب خون کبھی دوماہی تو کبھی سہ ماہی طور پر شائع کیا گیا، جبکہ آخری شمارہ سات ماہ پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے اس کے پیچھے مالی یا تنظیمی دشواریاں رہی ہیں۔ فی الجملہ شب خون اپنے مزاج ومعیار اور نظریاتی موقف پر قائم رہتے ہوئے بلا ناغہ چھپتا رہا۔ شب خون نے کبھی اپنے مضامین وتخلیقات کے انتخاب میں تعصب، مروت، مصلحت یا پھر جانب داری سے کام نہیں لیا بلکہ ہر وہ تحریر جو رسالے کے مزاج ومعیار پر کھری اتری اسے شامل اشاعت کرنے میں کسی طرح کا تردد نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شب خون کے شروعاتی شماروں اور بعد میں بھی متعدد ایسی تحریریں شامل اشاعت کی گئیں جو جدیدیت پر یا جدید

**اردو کی ادبی صحافت میں 'شب خون' اپنا منفرد مقام رکھتا ھے۔ شب خون ادبی جمود و تخلیقی تعطل کے احیا اور مارکسی نظریات پر شب خون مارنے کی غرض سے جاری کیا گیا.شب خون نے اولاً 'ادب برائے ادب' یا 'فن برائے فن' کا نعرہ بلند کیا، اس کے بعد ادیب وفنکار کی فکری و تخلیقی آزادی کی وکالت کی، سیاسی و سماجی وابستگی،اصول و قوانین کی پابندیوں کو ادیب کے لیے معیوب گردانا تاکہ وہ پوری طرح آزاد رہ کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکے۔**

تخلیقی رویے پر کی گئی سخت تنقید پر مشتمل تھیں، لیکن فکری پختگی، خوش سلیقگی اور استدلالی انداز سے بھرپور ہونے کے سبب انھیں شائع کرنے میں کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی شب خون کے معیار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہم نے کسی جگہ اپنے معیاروں کے معاملے میں مصالحت نہ کی اور نہ صدق نیت کے بغیر کوئی کام کیا۔ اردو ادیبوں کا ایک جم غفیر ہے جس کی شناخت 'شب خون' سے بنی۔ ذرا سوچیے کہ اگر شب خون نہ نکلتا اور قائم نہ رہتا تو

کیا جدید ادب کی تاریخ وہی ہوتی جو آج ہے۔ وہ نئی، زندہ طاقت ور تخلیقی سرگرمی جو شب خون نے پیدا کی، وہ تنقیدی و نظریاتی مسائل جو شب خون نے اٹھائے، وہ بحثیں اور معرکے جو 'شب خون' کے صفحات پر آراستہ ہوئے، ان کے بغیر آج ہمارا ادب کس قدر پسماندہ اور تنگ دامن ہوتا؟''

('بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں' شب خون، شمارہ ۱۹۵، بابت ماہ جون 1996، ص 1)

شب خون کی تحریروں کا معیار و منہج اتنا بلند تھا کہ قلمکار اس میں چھپ جانے کو سند امتیاز تصور کرتے تھے، اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا کہ شب خون نے جو معیار متعین کیا تھا ان پر کھرا اترنا جدید ذہنی اپج، تازہ کاری اور شدید مشق کے بغیر ممکن نہ تھا۔ شب خون سے قبل ہی ایسی تخلیقات منظر عام پر آنے لگی تھیں جو جدید نظریۂ ادب سے بے حد قریب تھیں لیکن شب خون میں چھپنے والی تمام تحریروں کو اعتبار نظر صرف اس لیے حاصل تھا کیوں کہ شب خون جدیدیت کا فکری استعارہ بن چکا تھا۔ شب خون کے معیار کے حوالے سے پروفیسر احمد محفوظ لکھتے ہیں:

''شب خون کی اہمیت اور اس کے اعتبار کا یہ عالم رہا ہے کہ اس میں کسی تحریر کا چھپ جانا اس کے معیاری ہونے پر دلالت کرتا ہے اور کسی ادیب کا شب خون میں مسلسل چھپنا اس ادیب کے معتبر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے شب خون کے معیار سے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ انھوں نے بسا اوقات اہم ادیبوں کی بھی بعض ایسی تحریروں کو ناقابل اشاعت قرار دیا جو 'شب خون' کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔''

(مہمان اداریہ، ماہنامہ سبق اردو، شمارہ نمبر 7، بابت ماہ جنوری 2005، ص 4، بعد وہی)

نئے تجربات پر مشتمل تحریریں اور ادیب کی فکری آزادی کا انعکاس کرنے والی تخلیقات فاروقی کے انتخابی عمل میں پہلے جگہ پاتیں۔ شب خون میں شائع شدہ تخلیقات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ فاروقی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں نہایت کفایت شعار رہے ہیں، مثلاً بعض شعرا کے صرف دو۔دو یا تین۔ تین اشعار ہی شائع کیے ہیں۔ لیکن معیاری تخلیقات کو شائع کرنے میں فراخدلی بھی دکھائی ہے۔ بلاشبہ شب خون نے مثبت انداز فکر و نظر، نئے رجحانات کا فروغ اور تخلیقی معروضیت کو اپنے معیار و مزاج کا حصہ بنایا اور آخری دن تک اس پر قائم بھی رہا۔ شب خون نے ادبی تاریخ کو نیا موڑ دیا اور ساری فرسودہ روایتوں کو ادب سے یکلخت خارج کرنے کے لیے نہایت جرأت آمیز اور مستحکم اقدامات بھی کیے۔ اسد ثنائی 'الانصار' کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت سے ذہنوں کو صیقل کیا اور ان کی سوچ اور فکر کے دھاروں کو نئی شکل عطا کی۔ انھوں نے پہلے منزل کا تعین کیا پھر چالیس برس تک پورے استحکام کے ساتھ کہیں بھی لڑکھڑائے بغیر اس منزل تک ان ادیبوں کی رہنمائی کی جن کی نگاہوں کے سامنے صرف پامال راستے تھے۔''

(الانصار، جلد 3، شمارہ 3، ص 6-5، ادارہ الانصار، حیدرآباد 2005)

**شب خون کی تحریروں کا معیار و منہج اتنا بلند تھا کہ قلمکار اس میں چھپ جانے کو سند امتیاز تصور کرتے تھے، اور یہ کچھ غلط بھی نہ تھا کہ شب خون نے جو معیار متعین کیا تھا ان پر کھرا اترنا جدید ذہنی اپج، تازہ کاری اور شدید مشق کے بغیر ممکن نہ تھا شب خون سے قبل ہی ایسی تخلیقات منظر عام پر آنے لگی تھیں جو جدید نظریۂ ادب سے بے حد قریب تھیں لیکن شب خون میں چھپنے والی تمام تحریروں کو اعتبار نظر صرف اس لیے حاصل تھا کیوں کہ شب خون جدیدیت کا فکری استعارہ بن چکا تھا**

'شب خون' کی آبیاری میں فاروقی کی علمی بصیرت اور ادب شناسی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر شب خون کی ترتیب و تہذیب اور اس کے مزاج و معیار کے تعین میں فاروقی کی کد و کاوش نہ ہوتیں تو ہرگز یہ اردو ادب کے دیگر رسائل میں ممتاز شناخت کا حامل نہ ہوتا۔ سنجیدہ حلقوں میں شب خون کی مقبولیت کے پیچھے فاروقی کا تبحر علمی اور پیش کش کا نیا انداز پوشیدہ ہے۔ شب خون کی مقبولیت میں فاروقی کے علاوہ جدیدیت کے رجحان کی مقبولیت بھی دوسرا بڑا فیکٹر ہے۔ اگر قارئین جدید نظریۂ علم و ادب میں دل چسپی نہ لیتے تو شب خون کی اہمیت کسی ترجمے کی کتاب سے زیادہ نہ ہوتی۔ جدیدیت کی ترجمانی اور اس کی علمی سرپرستی خود فاروقی فرما رہے تھے اسی لیے فاروقی، جدیدیت اور شب خون ایسی دل چسپ مثلیث بن کر ابھری جس کا تصور ایک دوسرے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ شب خون کے مشمولات (جن میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے علمی، ادبی، تہذیبی اور سماجی رجحانات کی روح جھلکتی ہے) کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کا معیار مدیر کی اخلاقی جرأت اور انتخاب کے سنجیدہ رویے سے بنا ہے۔ شب خون نے ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے، اسی وجہ سے وارث علوی نے کہا تھا کہ اگر شب خون نہ ہوتا تو میں شاید ادب میں آتا ہی نہیں، نقاد بنتا ہی نہیں[حوالہ: شب خون، شمارہ 293، ص 581]۔ بلا شبہ شب خون کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک عہد سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا۔

شب خون کے اوراق ظاہری اور باطنی دونوں سطح پر معنویت سے لبریز نظر آتے ہیں، سرورق کے بیرونی حصے پر چھپی تصاویر اور خاکے در اصل تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں جو فنون لطیفہ کو فروغ دینے کی غرض سے مسلسل شائع کیے گئے۔ جبکہ شب خون نے سرورق کے اندرونی حصے پر اداریہ چھاپنے کی جو روایت قائم کی ہے وہ اردو دنیا میں بے مثال ہے۔ اردو رسائل میں پہلا ورق اداریے کے لیے مختص ہوتا ہے لیکن شب خون نے اداریہ نہ چھاپ کر کسی مغربی ادیب، ناقد یا فلسفی کی تحریر یا تحریر کا ایک ٹکڑا چھاپنے کی روایت قائم کی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ شب خون کے تمام شماروں میں خالص علمی و ادبی نوعیت کے تمام اداریے (بہ استثنائے چند) مغربی ادیبوں، مفکروں اور دانشوروں کی تحریروں پر مبنی ہیں جنھیں ترجمہ کرکے چھاپا گیا ہے۔ ان متفرق اداریوں کا مزاج کسی نہ کسی طرح شعر و ادب کے عصری میلانات سے میل کھاتا ہے۔ شب خون کے سرورق پر چھپی یہ نادر تحریریں جہاں رسالے کے مزاج کا پتہ دیتی ہیں وہیں جدیدیت کے غالب رجحان اور اس کے تخلیقی رویوں کا تعارف بھی پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں نے اردو شعر و ادب میں مغربی طرز فکر اور نئی تنقیدی سوچ کو جنم دیا ہے۔ ان تحریروں کی اہمیت بہر حال 'اداریے' کی ہے گرچہ اداریے کا عنوان نہیں ہے۔ غالب صدی، سید احتشام حسین، ن م راشد، زکی انور، اختر الایمان، علی سردار جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی، افتخار جالب، آل احمد سرور، عرفان صدیقی، جگن ناتھ آزاد، پرویز شاہدی کے وصال اور اندرا گاندھی کے قتل پر، قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ انعام سے نوازا جانے پر یہ صفحہ ان حضرات کے نام مخصوص کیا گیا۔ مذکورہ مواقع کے علاوہ متذکرہ اداریہ تمام شماروں میں پابندی سے شائع ہوا۔ یعنی شب خون میں ایسے 276 اداریے موجود ہیں جو قاری کو علمی بصیرت اور ذہنی بالیدگی عطا کرتے ہیں۔

**مضامین و مقالات:**

شب خون کا سب سے زیادہ مقبول کالم مضامین کا ہے جس میں بیحد علمی، فکری اور تنقیدی مضامین، سمپوزیم اور انٹرویو کو جگہ دی جاتی تھی۔ چنانچہ شب خون میں کل

212 قلمکاروں کے 635 مضامین موجود ہیں، جن میں شمس الرحمٰن فاروقی کے 105، شمیم حنفی کے 15، وارث علوی کے 15، اور گوپی چند نارنگ کے 13 مضامین ہیں۔ دیگر حضرات نے بھی جامع قسم کے مضامین لکھے ہیں۔ مضامین اور تخلیقات کے ردعمل میں مضمون نما مراسلات بھی بے حد فکری، معلومات افزا اور عملی تنقید کے نمونے ہیں۔ جدیدیت نے موضوعات اور اظہار کے اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ تنقید کے میدان میں بھی نئے انداز اور جدید نقطۂ نظر کو متعارف کرایا۔ حالی سے لیکر آخری مارکسی نقاد تک کا نہ صرف پوسٹ مارٹم کیا بلکہ کلاسیکی ادب سے لے کر جدید ادب تک تمام تنقیدی نظریات کو موضوع بحث بنایا۔ نئے تنقیدی نظریات میں ہیئتی تنقید، ساختیاتی تنقید، اسلوبیاتی تنقید اور معروضی تنقید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تنقیدی مسلکوں سے وابستہ ناقدین کی خاصی تعداد شب خون کے توسط سے ہی منظر عام پر آئی۔ چنانچہ جدیدیت کے رجحان کے تحت وجودیت، علامت نگاری، تجریدیت، ساختیات، پس ساختیات اور فن کی جمالیات پر جو معرکۃ الآرا بحثیں ہوئیں وہ شب خون کے علاوہ اردو کے دوسرے رسائل میں نہیں ملتیں۔ مشرق و مغرب کے تمام فلسفوں کے ہر ہر گوشے پر صحتمند اور استدلالی بحث کی گئی ہے۔ تمام مشرقی و مغربی فلسفیوں، دانشوروں اور مفکروں کے نظریات اور فن پاروں پر بھی جامع مضامین شائع کر کے شب خون نے اردو ادب کو سرسبز کیا۔

44 سوانحی مضامین بھی مختلف شماروں کی زینت بنے ہیں، جن میں اقبال، فیض، محمد حسن عسکری، محروم، اخترالایمان، فرائڈ، آغا حیدر حسن دہلوی، اختر انصاری، ڈاکٹر مسیح الزماں، علی عباس حسینی، جوگیندر پال، بلراج کومل، الیاس احمد گدی، مخدوم محی الدین، سید مسعود حسین رضوی، مجتبیٰ حسین، عزیز احمد، جذبی اور کافکا کے احوال و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شب خون میں 20 انٹرویو شائع ہوئے ہیں جو نئے ادب کی فکری و فنی ترجیحات اور تخلیقی رجحانات کی تفصیل پر مشتمل ہیں، یہ انٹرویو انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، ساقی فاروقی، عامر حسین، محمد عمر میمن، رام لعل، اخترالایمان، الیاس احمد گدی، شمس الرحمٰن فاروقی، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، فراق گورکھپوری، احمد ہمیش، نیر مسعود، ضمیر نیازی، جمیل جالبی، قاضی سلیم، ل۔احمد اکبرآبادی اور عرفان صدیقی جیسی ہستیوں کے ساتھ گفتگو پر مشتمل ہیں۔ 9 تعزیتی تحریریں بھی شامل ہیں جو سید احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، مجروح سلطانپوری، بانی منچندہ، خواجہ احمد فاروقی، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر اعجاز حسین، صلاح الدین محمود اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی وفیات پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ 15 سمپوزیم اور 13 رپورتاژ بھی شب خون میں شائع ہوئے ہیں جو اپنے موضوع، مواد اور جامع گفتگو کی وجہ سے ادب کے قارئین کے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔

شب خون میں نثری تخلیقات کے مقابل شاعری کو زیادہ جگہ ملی ہے یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جدیدیت کے رجحان اور اس کے تخلیقی رویوں کا اظہار زیادہ تر شاعری میں ہوا ہے، شب خون میں نظم اور غزل دونوں طرح کی شاعری جگہ پاتی رہی ہے۔ شب خون میں 659 شعرا کی کل 8047 غزلیں شائع ہوئی ہیں جن میں سب سے زیادہ یعنی 230 غزلیں ظفر اقبال کی ہیں اور مظفر حنفی کی 165 غزلیں ہیں۔ نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے کم ہے۔ 528 شعرا کی کل 4835 نظمیں چھپی ہیں، سب سے زیادہ یعنی 127 نظمیں مصطفی ارباب کی، بلراج کومل کی 105، اور حمید الماس کی 103 نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ شب خون میں شائع ہونے والی اردو کی جدید شاعری فرد کی ذات اور اس کے تجربات کے اظہار کے گرد گھومتی ہے، جدید شاعری ابہام، علامت، استعارہ، رمز، کنایہ اور لفظ کے فنکارانہ استعمال سے عبارت ہے، جدید شاعری میں سماجی یا افادی عناصر کے ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے، جدید شاعری ایک ایسے بحران کا اور بحران سے پیدا ہونے والے مسائل کا اظہار کرتی ہے جس نے انسان کی زندگی کو بے معنی بنا دیا ہے۔ اسی بحران اور نئے سیاسی نظام نے انسان کی ذات کے فنا ہوجانے کا خوف اور غیر محفوظ ہونے کی دہشت کو پیدا کیا اور زندگی کو عذاب بنا دیا ہے، زندگی کا یہی خوف اور ذہنی تناؤ جدید شاعری کے پس منظر میں صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتا ہے۔ جدید شاعر اپنی شاعری میں اثر پیدا کرنے کے لیے علامت، رمز، کنایہ اور چند تمثالوں کو استعمال کر کے پیکر بنانے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ معانی و مفاہیم کی تہ دار پرتوں کو اجاگر کر سکے، لیکن علامات و پیکر کے استعمال کا فن جس قدر احتیاط، تجربہ اور مشاق کا تقاضا کرتا ہے وہ ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں ہے، یہی وجہ ہے بیشتر شعرا کا کلام الفاظ کی شعبدہ بازی بن کر رہ گیا ہے۔ صہبا وحید نے جدید شعرا کی اس ناکامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مصیبت یہ ہے کہ خود جدید شعرا اپنے فن اور اپنی شاعری کی حدود سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، پھر جو بات انھیں مطعون کرنے کا سبب بنی ہے، وہ ایسی تخلیقات ہیں جن میں سوائے الفاظ کی شعبدہ بازی، جذبات کی مغلق عکاسی اور ژولیدہ و گنجلک عبارت آرائی کے کچھ بھی نہیں۔" (شب خون، شمارہ نمبر 21، بابت ماہ فروری 1968، ص 27)

ہیئتی سطح پر شاعری میں کیے گئے تجربات اور نئی شعری ہیئتوں کو بھی شب خون میں خوب جگہ ملتی رہی، جدید شاعری میں کوئی مخصوص ہیئت یا فارم تو متعین نہیں ملتی البتہ نظم مقفی اور پابند نظموں سے اعراض برتا گیا، جبکہ آزاد نظم اور نثری نظم کو فروغ دیا گیا۔ جدید شعرا نے موضوعات کے برتنے میں تنوع سے کام لیا اور اپنی تخلیقات کو صرف مادی ضروریات کی تکمیل تک ہی محدود نہ رکھ کر فرد کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور اعصابی کش مکش کے بیان پر بھی توجہ دی ہے۔ جدید شاعری میں اقتصادی، صنعتی، تعمیری اور تخلیقی عوامل پر زور دیا گیا، سیاسی و جماعتی وابستگی سے مکمل انحراف نیز آزادانہ طرز فکر اور علامتی و رمزیاتی اسلوب اظہار کا استعمال لازمی عنصر مانا گیا، جدید شاعری ذاتی تجربات اور انفرادی اظہار کو ترجیح دیتی ہے، اس کے تحت روایتی اسلوب، ہیئت، مروجہ قواعد، محاورہ اور روزمرہ کی پاسداری لازمی عنصر نہیں ہے۔ آزادئ اظہار اور ذاتی تجربات کی عکاسی کو جدید شاعری میں مرکزیت حاصل ہے باقی تمام عناصر ثانوی حیثیت کے حامل ہیں، چنانچہ جدید شاعری میں جدیدیت کے مختلف رنگ مختلف شکلوں

میں ملتے ہیں، لیکن نیا طرز احساس اور نیا طرز اظہار سب میں مشترک ہے۔ فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''کئی لوگ نئی شاعری اور جدیدیت کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے۔ سارا زور لفظیات میں تبدیلی اور اضافہ، ترتیب نحوی، اوقاف، اعراب اور ہیئت کے انوکھے پن پر صرف کرتے ہیں۔ جدیدیت کے سلسلے میں یہ تمام چیزیں بھی بہت اہم ہیں مگر ان کی اہمیت مرکزی نہیں بلکہ ثانوی ہے۔''

('نئی شاعری اور جدیدیت' شب خون، شمارہ نمبر 49، بابت ماہ جون 1970، ص 29)

جن شعرا نے شب خون میں اپنی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر نام پیدا کیا ان کی تعداد بے شمار ہے۔ لہٰذا شب خون کے چند نمائندہ شعرا کے نام یہاں درج ہیں جنھوں نے جدیدیت کے تخلیقی رجحان [فرد کی ذات، ذات کا کرب، کرب کا احساس، احساس کا اظہار] کی نمائندگی کی:

وزیر آغا، افتخار جالب، ظفر اقبال، شہزاد احمد، اختر الایمان، ناصر شہزاد، ن م راشد، فضا ابن فیضی، ندا فاضلی، عمیق حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی، علی سردار جعفری، محمود ایاز، وحید اختر، محمد علوی، بلراج کومل، شہریار، راہی معصوم رضا، مخمور سعیدی، خورشید احمد جامی، عادل منصوری، پرکاش فکری، پرویز شاہدی، شاذ تمکنت، زاہدہ زیدی، قاضی سلیم، علقمہ شبلی، مظفر حنفی، ظفر صہبائی، منیب الرحمٰن، مظہر امام، حامد حسین حامد، زبیر رضوی، منیر نیازی، سلیمان اریب، حمید الماس، بشیر بدر، نازش پرتاپ گڑھی، اقبال توصیفی، وہاب دانش، ساقی فاروقی، زیب غوری، احمد نیاز قاسمی، عتیق اللہ، کمار پاشی، کرشن موہن، حسن نعیم، مجید امجد، شمس الرحمٰن فاروقی، مغنی تبسم، محمد صادق، فضا ابن فیضی، امجد اسلام امجد، احمد وصی، انور شعور، انیس ناگی، اطہر نفیس، ممتاز راشد، منظر سلیم، حرمت الاکرام، غلام مرتضیٰ راہی، سلام مچھلی شہری، اسلم عمادی، لطف الرحمٰن، کاوش بدری، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، شاہد کلیم، صلاح الدین پرویز، بانی، شمیم حنفی، حکیم منظور، خورشید الاسلام، علیم اللہ حالی، برتپال سنگھ بیتاب، پرویز رحمانی، شاہد میر، جیلانی کامران۔

مضامین اور شاعری کے بعد شب خون کا سب سے مقبول گوشہ افسانوں کا ہے۔ 1960 کے بعد ابھرنے والے فنکاروں کے لیے شب خون نے ہمہ گیر تحریک کا کام کیا، جدیدیت سے دل چسپی رکھنے والے فنکاروں کو شب خون میں ترجیحی بنیادوں پر جگہ ملی، نتیجتاً ایسے بے شمار افسانہ نگار سامنے آئے جو شب خون کے توسط سے ہی قارئین تک پہنچے اور مشہور ہوئے۔ کچھ ادیبوں پر تو شب خون میں ہی تنقیدی مضامین شائع کرا کے ان کا ادبی استحسان ادا کیا گیا۔ جدیدیت کے تخلیقی رویوں کو شب خون نے کھل کر پیش کیا۔ شب خون کے افسانہ نگاروں کی دو بڑی نسلیں منظر عام پر آئی ہیں۔ پہلی وہ کہ جس نے شب خون کے اجرا سے قبل ہی اپنی شناخت قائم کی تھی لیکن شب خون میں نئے رجحان کو فروغ دینے میں پیش پیش رہی۔ دوسری وہ کہ جس کو شب خون نے ہی متعارف کرایا اور تربیت بھی کی۔ شب خون کے 93 شماروں میں ہی تخلیقی تحریریں ملتی ہیں۔ 285 افسانہ نگاروں کے کل 1121 افسانے شائع ہوئے ہیں۔ شب خون میں جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

انتظار حسین، خالدہ حسین، غشایاد، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، قمر احسن، چودھری محمد نعیم، غیاث احمد گدی، بلونت سنگھ، عوض سعید، اسد محمد خان، ظفر اوگانوی، فرخندہ لودھی، بلراج کومل، اکرام باگ، احمد ہمیش، رام لعل، نیر مسعود، بدیع الزماں، جیلانی بانو، پریم ناتھ در، انور سجاد، ہرچرن چاولہ، محمد عمر میمن، رشید امجد، جوگندر پال، مرزا ادیب، رضوان احمد، اقبال مجید، احمد یوسف، حسین الحق، شوکت حیات، عبد الصمد، سلام بن رزاق، آنند لہر، اعجاز راہی، انیس رفیع، مرزا حامد بیگ، حمید سہروردی، سلیم شہزاد۔

یہ تمام وہ افسانہ نگار ہیں جو جدیدیت کے تخلیقی رجحان کے تحت افسانہ خلق کر رہے تھے، ان کی تخلیقات میں علامت، ابہام، استعارہ، تجرید وغیرہ عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ موضوعاتی سطح پر انسان کا داخلی کرب، تنہائی، خوف، بے چہرگی، بے قدری اور دنیاوی کش مکش کو برتا گیا ہے۔ جدید افسانہ روایتی افسانے کی طرح ٹھوس نہیں ہوتا اور اس میں زمان و مکان کی واقعاتی حسیت بھی نہیں ہوتی، زمان و مکان دونوں ذہنی تجرید کی سطح پر واقع ہوتے ہیں۔ صنفی لحاظ سے بھی ان کے افسانے روایتی افسانے سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں مثلاً کہانی کی جگہ اینٹی کہانی یا تجرید کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، ٹھوس کرداروں کی جگہ محض پرچھائیاں نظر آتی ہیں، وضاحت اور تفصیل کی جگہ علامتی بیانیہ [مہابیانیہ] کو برتا گیا ہے۔

شب خون نے اردو ادب کو جدید نظریات سے آشنا کرایا، تمام اصناف ادب کو لفظی و معنوی سطح پر نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان میں اسلوب، ہیئت اور لفظیات سے انحراف کرنے اور نئے اسالیب کو اختیار کرنے کا پیغام عام کیا، روایتی طرز اظہار اور تمام مروجہ عناصر جو ادیب و فنکار کے لیے پابندی کے مماثل تھے ان سے سخت اختلاف کیا، نہ صرف اختلاف بلکہ ان کے مقابل اپنا ایک تخلیقی و تنقیدی نظام بھی متعارف کرایا، فنی و جمالیاتی قدروں پر نظریاتی بحث کی اور تمام ادبی اصناف کی شعریات پر از سر نو غور کرنے کی دعوت دی۔ شب خون نے ادیبوں اور ناقدوں کو نئے ادبی معیارات اور نئے رجحانات کی طرف متوجہ کیا، جدیدیت کا ذکر شب خون کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ 'تفہیم غالب' اور 'شعر شور انگیز' کے نام سے دو کالم شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون سے ہی شروع کیے تھے جو بعد میں ضخیم کتاب کی شکل میں منظر عام پر آئے۔ شب خون کا مراسلے والا کالم بڑا دل چسپ ہے جس میں موافق اور مخالف آرا بغیر کسی تعصب کے شائع کی گئی ہیں۔ مراسلوں میں بے باک تنقیدی اظہار اور رنگا رنگ افکار ملتے ہیں۔ شب خون نے ادب کی تخلیق پر زور دیتے ہوئے نئے قلمکاروں کو دریافت کیا لیکن یہ الزام بھی اس کے سر ہے کہ اس نے زیادہ تر صاحبان علم کی ہی سرپرستی کی۔ شب خون صرف ادب تک محدود نہ تھا بلکہ اس نے فنون لطیفہ پر بھی توجہ دی۔ شب خون نے جدیدیت کے رجحان اور اس کے تخلیقی رویوں کو فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا، عالمی ادب کے فن پاروں کے تراجم، مغربی ادیبوں، دانشوروں اور فلسفیوں کے ادبی و تنقیدی تصورات کو شب خون نے اردو دنیا تک نہ صرف پہنچایا بلکہ اردو ادب کے دامن کو بیل بوٹوں سے مزین کر دیا جس کے سبب اردو ادب و تنقید میں معروضیت آئی۔ شب خون کے معلومات افزا، فکر انگیز اور بصیرت سے مملو مضامین کی بنا پر کرشن چندر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''لگتا ہی نہیں کہ اردو کا رسالہ ہے اور ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے'' (شب خون، شمارہ 4، ص 77) شب خون کی ظاہری و باطنی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے اس کی جلدوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ شب خون کی اہمیت پر وارث علوی کا قول ملاحظہ کیجیے:

''شب خون ایک ایسا رسالہ ہے جس میں بیسویں صدی کی نصف آخر کی روح جھلکتی ہے۔ کسی ایک رسالے میں پورا دور سما جائے، اس کے اہم ترین ادبی اور تہذیبی رجحانات کے ساتھ، اس کے اعلیٰ ترین تخلیقی اور تخیلی کارناموں کے ساتھ یہ کسی بھی رسالے کے لیے بڑے فخر کی بات ہو سکتی ہے۔''

(شب خون، شمارہ نمبر 293 بابت ماہ جون تا دسمبر 2005، ص 581)

■

**Aslam Misbahi**
213, Jhelum Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9528807078

# شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار سے خالص ادبی مصاحبہ

جلیل بازید پوری

**شہنشاہ جذبات دلیپ کمار (محمد یوسف خان) نے اپنے کردار و گفتار سے بالی ووڈ کے معیار اور اپنے شخصی وقار کو قائم رکھا ہے۔ انھوں نے نہایت شائستگی کے ساتھ اداکاری کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ آج بھی عوام کے ذہنوں پر ان کا جادو نقش ہے۔ دلیپ کمار کی اداکاری کو جوہر شناس نظروں نے سراہا ہے اور زیادہ اداکاروں نے ان سے تحریک حاصل کی ہے۔ بالی ووڈ میں دلیپ کمار ایک مثال اور مشعل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت ساری فلموں میں اپنی اداکاری کے ذریعے ناظرین کو مسحور کیا ہے جن میں مغل اعظم، رام شیام، گنگا جمنا، کرما، کرانتی، ودھاتا، دنیا، مزدور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دلیپ کمار کو دادا صاحب پھالکے جیسا ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو ان کی فلمی خدمات کا اعتراف ہے۔ ان کی شخصیت بڑی نفیس اور نستعلیق ہے۔ شعر و ادب سے بھی انھیں گہری دلچسپی ہے اور اردو زبان و ادب سے ایک جذباتی رشتہ ہے۔ اسی حوالے سے اردو کے بزرگ ادیب جلیل بازیدپوری نے ان سے گفتگو کی ہے۔**

عربی کا ایک مقولہ ہے 'حمضوا مجالسکم' اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو اس لیے میں عظیم ہستیوں سے وقتاً فوقتاً کسی بھی موضوع پر تبادلہ خیال کرتا ہوں یہی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے دلیپ کمار سے اُس وقت انٹرویو لیا تھا جب پاک پروردگار کی کرم فرمائیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کا ذہن درخشاں وتاباں تھا۔ وائے حسرتا برسوں میں زندگی کی سازشوں کا شکار رہا، واہیات خرافات میں وقت پانی کی طرح بہتا چلا گیا۔ دلیپ کمار کی ذہنی حالت بھی بگڑتی چلی گئی۔ از خود رفتگی کے عالم میں وہ کسی کو پہچاننے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے ہونٹوں پر سے چاندنی جیسی مسکراہٹ اچانک غائب ہوگئی۔ وہ ذہنی طور سے بالکل حاضر نہیں رہے۔ آنکھیں موندرکھی ہیں، وہ کسی کو دیکھتے تک نہیں۔ ان ہی حالات میں سائرہ بانو کے توسط سے انھوں نے دو بار حج عمرہ بھی کیا اور کئی ایوارڈس سے نوازے بھی گئے لیکن ایوارڈس دلیپ کمار سے چھوٹے تھے، بونے تھے۔ انھیں بھارت رتن ایوارڈ لتا منگیشکر اور بسم اللہ خاں کی مانند ملنا چاہیے تھا۔

میں نے تین بار کوشش کی کہ کم سے کم ان کو دیکھ تو لوں۔ سائرہ بانو کے بنگلہ پر ان کے سکریٹری D-Costa سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی تصویریں دکھا کر ان کو یقین دلایا کہ میری ان سے قربت رہی ہے۔ عید بقرعید میں اپنائیت کے تحت درجنوں بار ظہر کی نماز کے بعد ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہے۔ ان کے سکریٹری نے کہا ''آپ مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دیجیے، میں آپ کو فون کروں گا۔'' فلمی دنیا اور سیاسی دنیا میں بچوں اور لپاڑیوں کی کہاں کمی ہے۔ گرگٹ نما انسان سچ تو کبھی بولتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ لیت و لعل اور حیل وحال میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔

اب میں اس ادبی انٹرویو کو صفحۂ قرطاس پر من وعن بکھیر رہا ہوں۔ ان کی یادیں خوب صورت منظوم تخلیقات کی مانند روح میں گداز پیدا کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا مندرجہ ذیل شعر۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

میرا کان مروڑ رہا ہے۔ میں دلیپ کمار سے ہر ہفتہ باندرہ جمخانہ ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ وہاں بیڈمنٹن کھیلنے آتے تھے۔ وہ چاق وچوبند تھے۔ جوانوں کی طرح تھرکتے تھے، صحت مندی کی ساری علامتیں ان کے جسم میں خون کی مانند گردش کر رہی تھیں، کڑکڑاتی سردی کبھی کبھار ممبئی کی چلچلاتی دھوپ اور موسلا دھار بارش میں بھی میں نے ان سے ملاقاتیں کی تھیں، ان کی شخصیت ٹھنڈی چھاؤں تھی میرے لیے۔ ان کی سادگی اور فنکارانہ صلاحیتوں سے میں بے حد متاثر تھا۔ اس انٹرویو کے لیے میں ان کا بنگلہ باندرہ پالی ہل شام سات بجے پہنچا۔ پہلی منزل پر میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے بھائی احسن خاں اور اسلم خاں سے محو گفتگو تھا۔ جب وہ باہر سے آئے میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا اور چل دیے۔ مجھے برا لگا کیونکہ میں نے ان سے درجنوں ملاقاتیں کی تھیں۔ جب وہ کمرہ سے واپس آئے میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''ارے آپ ہیں میں تو کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ اب دیکھ کر لگا یہ تو پرانا پرندہ ہے جو برسوں سے اڑ رہا ہے۔

میں نے چھیڑتے ہوئے کہا ''یوسف بھائی! آپ کے ہوتے ہوئے بھی میں اڑ نہیں رہا ہوں۔'' انھوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا ''یہ بے چارے کیک آپ کا انتظار کررہے ہیں، فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں۔''

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا:

''اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کیا داغ دہلوی کا یہ شعر اردو پر صادق آتا ہے؟

انھوں نے معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا ''آتا بھی ہے اور نہیں بھی آتا ہے۔ آج غزلیں اور نظمیں غیر اردو داں طبقوں کے ہونٹوں پر مچل رہی ہیں۔ اسی زبان کی چاشنی اور مٹھاس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ آج اردو کلبوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں چڑیا کی مانند پھدک رہی ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں مرزا غالب اور اقبال ڈے منایا جاتا ہے۔ اردو بین الاقوامی زبان ہے۔ طلبا یورپ کے ہوں یا امریکہ کے اردو مصنفوں کی تخلیقات کے ترجمے انگریزی میں پڑھتے ہیں اور مصنفوں کے نام ہم سے زیادہ جانتے ہیں، علامہ راشدالخیری اور عبدالماجد دریابادی کو بھی جانتے ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات۔ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے ان کے بچے اردو سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ Rolf Russel یورپ کے رہنے والے تھے۔ وہ انگریزی اور اردو کے فنکار تھے۔ اردو سارے مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اُڑیا، بنگالی اور آسامی مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ مذہبی کتابوں کا ذخیرہ اردو میں محفوظ ہے۔ اس زبان میں ہماری تہذیب اور تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس لیے اسے معاشی طور سے کچلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی قوم کو کچلنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کی زبان کو کچل دو تاکہ اس کی تہذیب گونگی اور لنگڑی بن کر رہ جائے۔ اردو بولنے والے اندھے، بہرے ہوجائیں وہ قوم معاشی عدم استحکام کا شکار ہوجائے۔''

میں نے باتوں باتوں میں ان سے یہ بھی پوچھا ''اردو دشمنوں کی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟''

انھوں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی بکھیرتے ہوئے کہا:

''کسی حد تک کیا بالکل ہی صداقت نہیں ہے اور اس بات کے گواہ پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت رتن ناتھ سرشار، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ہیں۔ دشمنِ اردو اگر یہ بات ان لوگوں کے سامنے کہتے تو وہ لوگ ان کا منہ نوچ لیتے۔ بہار، یوپی، مدھیہ پردیس کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے مگر ہندوستان کے سارے صوبوں کے مسلمانوں کی زبان اردو ہرگز نہیں ہے۔''

میں نے یوسف بھائی کو ٹٹولتے ہوئے کہا ''آج اردو سے زیادہ کھلواڑ فلم والے کررہے ہیں۔ میں نے حال ہی میں دو فلمیں دیکھیں ایک فلم کا نام شہرت تھا اور دوسری فلم کا نام جانِ جگر تھا۔ پردۂ سیمیں پر شہرت اس طرح 'شوہرت' لکھا ہوا تھا یعنی شوہر میں ت لگا ہوا تھا جانِ جگر اس طرح 'جانے جگر' حالانکہ جان کے ساتھ جگر قواعد کے اعتبار سے غلط ہے، جس طرح جناب اور صاحب ایک آدمی کے لیے دو صفتوں کا استعمال غلط ہے۔

انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا کہ آپ فلم سازوں کو اردو پڑھانا شروع کردیجیے۔ یوسف بھائی سے میں نے کہا ''اردو کے ادیب اردو کی خدمت کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کی اولادیں اردو سے نابلد ہیں شبانہ اعظمی کو کچھ دنوں تک اردو لکھنا پڑھنا میں نے سکھایا۔ عصمت آپا کی دونوں بیٹیاں اردو کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔''

یوسف بھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''شبانہ اعظمی کو اردو پڑھنے کی کیا ضرورت تھی، ان کے والد کیفی شاعر ہیں ان کے شوہر جاوید اختر کامیاب اسکرپٹ رائٹر اور شاعر ہیں۔''

میں نے چٹکی لیتے ہوئے ان سے پوچھا مرزا داغ دہلوی کے اس شعر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

تو انھوں نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ''اس کا بہتر جواب تو وہی لوگ دیں گے جو شہرت شوہر میں ت لگا کر لکھتے ہیں اور جانِ جگر ن میں زیر نہیں لگا کرے لگا دیتے ہیں۔ ان کے لیے تو اردو کھیل ہی ہے، کروڑوں روپے بٹور رہے ہیں۔''

میں نے یوسف بھائی کے چہرے کو نفسیاتی طور سے پڑھتے ہوئے کہا ''رمیش تنی کی بیٹی شویتا تنی اردو پڑھتے پڑھتے مجھ سے پوچھتی ہے بلغ العلی بکماله کا کیا مطلب ہے؟

میں نے کہا:

بلندی پر پہنچے وہ اپنے کمال سے
کشف الدجی بجمالہ تاریکی دور کی اپنے جمال سے
حسنت جمیع خصالہ حسین ہیں ان کی سب خصلتیں
صلوا علیہ وآلہ ان پر درود بھیجو اور ان کی آل پر

یہ شعر سعدی کا ہے۔ وہ فارسی کے شاعر تھے۔ انھوں نے طویل عرصہ عرب میں گزارا۔ عربوں کے ساتھ ان کی نشست و برخاست رہی۔ امام ابن الجوزی ان کے استاد تھے۔ اس لیے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔ یہ اشعار پیغمبر اسلام کے لیے انھوں نے کہے ہیں۔

شویتا بھی مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چہک اٹھی ''واہ سر آپ تو کمال کے سر ہیں، میں نے تو صرف بلغ العلی بکمالہ پوچھا تھا۔''

یوسف بھائی بتایئے ''آپ کن ادیبوں سے متاثر ہیں؟''

''میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کنہیا لال کپور سے متاثر ہوں۔''

میں نے سوال کیا۔ شعرا میں کن کے اشعار نے آپ کی روح میں گداز پیدا کرنے کی کوشش کی اور جمالیاتی ذوق کو تسکین بخشا۔''

''فیض کا یہ شعر

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

ساحر، کیفی، جگن ناتھ آزاد، جاوید اختر کے علاوہ اب ندا فاضلی بھی مجھے پسند ہیں۔ انھوں نے بڑی جلدی ترقی کی ہے لفظوں کے استعمال میں بھی انفرادیت ہے۔

میں نے انھیں ٹوکا مگر ندا فاضلی فرماتے ہیں:

''کہیں چھت تھی دیوار و در تھے کہیں
ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے
مگر جو بھی دیا دیا دیر سے''

انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''شاعر آفاقی ذہن مالک ہوتا ہے کامیابی تو محبوبہ ہے۔ محبوبہ آسانی سے مل جائے تو محبوبہ کی اہانت ہوگی۔''

خلیل جبران نے کہا تھا:

"I shall live beyond death
I shall ring in your ears
Even after the vast sea wave
Carries me back
To the vast sea depth."

عظیم شخصیتیں کانوں میں تادمِ حیات بجتی رہیں گی۔ دلیپ کمار کی پیاری پیاری یادیں میرے کانوں میں بھی بجتی رہیں گی اور گونجتی رہیں گی۔

■

**Jalil Bazidpuri**
C/o, Dr. Gayan Parkash Arya
Ayurvedic Shop, Khandpur
P.O Distt: Sheikh Pura - 811105 (Bihar)

# عہد اکبری میں مثنوی سرائی

الطاف حسین

عہد اکبری 963 ہجری تا 1014ھ ق فارسی شعر و ادب و مثنوی سرائی کے لحاظ سے زریں عہد شمار کیا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ نے اپنے اجداد کی طرح فارسی شعر و ادب اور ترجمہ نویسی میں پیش قدم ہونے کا ثبوت دیا۔ اگرچہ اکبر بادشاہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اپنے اجداد کی طرح علمی ادبی ذوق رکھتا تھا۔

اس عہد میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جیسے 'اکبر نامہ'، 'آئین اکبری'، 'طبقات اکبری'، 'منتخب التواریخ'، 'تاریخ اکبری اور تاریخ الفی وغیرہ۔ یہ تمام تاریخی کتابیں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام بیرونی ممالک میں اہمیت کی حامل ہیں۔ صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ یہ کتابیں وسطی ایشیا کی آگاہی کے لیے بھی بے مثال نمونہ ہیں۔ اہل نظران میں سے مطالب کے پھول اور فوائد کے میوے چن چن کر دامن بھرتے ہیں۔

عہد اکبری تاریخ نویسی، ترجمہ نویسی، تذکرہ نویسی اور شعری اصناف جیسے قصیدہ، غزل، اور رباعی و مثنوی کے فروغ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگر چہ اس عہد میں مثنوی کم کہی گئی ہیں لیکن جو بھی ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔

عہد اکبری میں دو طرح کی مثنوی کو عروج حاصل ہوا، عارفانہ و فلسفیانہ اور عاشقانہ۔ پہلے عارفانہ و فلسفیانہ مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عرفی شیرازی، فیضی، غزالی مشہدی، ملک قمی نے مشہور ترین عارفانہ و فلسفیانہ مثنویاں لکھیں البتہ عاشقانہ مثنویوں میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔

## عہد اکبری کی عارفانہ و فلسفیانہ مثنویاں

عرفی شیرازی ایران و ہندوستان کے شعر و ادب میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں فیضی سے ملاقات کی پھر حکیم ابوالفتح گیلانی اور خانخاناں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ حکیم ابوالفتح نے 997ھ میں وفات پائی۔ خانخاناں کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنجہائے سعادت زیان جاں آمد

یہ شعر حکیم ابوالفتح کی وفات پر لکھا گیا ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمھارے ذریعے معلوم ہوا کہ اس سورج کے غروب ہونے سے کتنے قیمتی خزانے دفن ہو کر رہ گئے ہیں۔

اکبر بادشاہ اور شہزادہ سلیم کی مدح میں بھی قصیدہ کہے گئے۔ عرفی قصائد اور مثنویاں آج بھی ہندوستان میں داخل نصاب ہیں۔ انھوں نے اصطلاحات اور استعارے ایجاد کیے جیسے آباد، امکان آدائے، کیواں پرور وغیرہ۔ اس کے علاوہ عشقیہ شاعری، فلسفہ اور اخلاق میں بھی وہ کمال فن رکھتے تھے۔

## عرفی شیرازی کی عارفانہ و فلسفیانہ مثنویاں:

**مجمع الابکار:** 'مجمع الابکار' عہد اکبر کی مشہور ترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مثنوی مجمع الابکار 'مخزن الاسرار' نظامی کے طرز پر لکھی گئی۔

عرفی شیرازی کی مثنوی مجمع الابکار کے مضامین زیادہ تر باری تعالی کی ستائش، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح، حسن و عشق اور بہ داستان و حکایت پر مشتمل ہیں۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار سے متاثر نظر آتی ہے۔ دونوں مثنویوں کے آغاز میں مشابہت ملتی ہے۔ ذیل کے شعروں سے واضح ہے:

نظامی: بسم اللہ الرحمن الرحیم ہست کلید در گنج حکیم
عرفی: بسم اللہ الرحمن الرحیم موج نخست است و بحر قدیم

**تصنیفات عرفی:** رسالہ نفیسہ جو تصوف پر ہے۔

اس کے علاوہ عرفی شیرازی نے مخزن الاسرار اور شیریں و خسرو کے جواب میں بھی مثنوی لکھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفی شیرازی عہد اکبر کے معروف ترین مثنوی گو شعرا میں آتے ہیں۔ آخر کار یہ مثنوی نگار سال 999ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

ملک الشعرا فیضی کا شمار عہد اکبر کے معروف ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے دادا شیخ خضر دسویں صدی ہجری میں وطن چھوڑ کر ناگور آئے اور یہیں شادی کی۔ وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ شیخ مبارک کی ولادت ناگور میں ہوئی۔ ان کے والد بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کی مشہور ترین تفسیر 'منبع العیون' ہے۔ شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور پھر آگرہ آئے۔ فیضی یہیں سال 954ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد سے حاصل کی۔ 996ھ بھی ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ 997ھ میں اکبر بادشاہ نے کشمیر کا سفر کیا تو فیضی بھی ساتھ تھا۔ کشمیر پر مبنی 'قصیدہ کشمیریہ' اسی سفر کے دوران لکھا۔

شیخ فیضی کا ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں طب، نجوم، موسیقی و ادب، حکمت و فلسفہ پر کتابیں تھیں۔ فیضی پہلا شخص ہے جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی۔ فیضی کا نو ہزار اشعار پر مشتمل ایک غزلیہ دیوان ہے، جس کا نام 'طبع شیر الصبح' ہے۔ انھوں نے ترجمہ نویسی میں بھی جیسے رامائن، مہابھارت اور لیلی داستی میں اہم رول ادا کیا۔ فیضی کی ممتاز خصوصیت شاعری میں استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی لذت ہے۔

'مرکز ادوار' عہد اکبر کی معروف ترین عارفانہ و فلسفیانہ مثنوی ہے۔ اشعار کی تعداد 2351 ہے۔ فیضی کی مرکز ادوار مانند نظامی کی مخزن الاسرار اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم گنج ازل راست طلسم قدیم
گنج ازل چیست کلام خدا مہر ابد کردہ بہ نام خدا

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والا خزانہ ایک قدیم راز ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والا خزانہ اللہ کا کلام ہے، جس نے اللہ کے نام کے ذریعہ دوام پالیا۔ شعر نظامی مخزن الاسرار۔ مانند

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہست کلید در گنج حکیم

غزالی مشہدی کا شمار دسویں ہجری کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں شامل ہو کر شہرت حاصل کی۔ بعد میں ہندوستان ہجرت کی اور بلند مقام پایا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے دولت گورکانی ہند میں مرتبہ ملک الشعرا پایا۔ ابتدا میں برصغیر ہند میں علی قلی خان معروف بہ خان زمان کے دربار میں رسائی کی۔ اس وقت علی قلی خان صوبہ دار جونپور تھے۔ جب خان زمان کی وفات ہوئی تو اکبر کے دربار میں ادبی خدمات انجام دیں۔

غزالی غزل، قصیدہ اور مثنوی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے سہ معروف ترین عرفانی و فلسفیانہ مثنوی، قدرت آثار، نقش بدیع اور مشہد الانوار لکھیں۔ لیکن ان کی معروف ترین عارفانہ مثنوی نقش بدیع ہے۔

'نقش بدیع' نظامی کی مثنوی 'مخزن الاسرار' کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ مخزن الاسرار در بارہ خود شناسی، خدا شناسی اور پسندیدہ اخلاق پر ہے۔ غزالی نے بھی ان تمام خصوصیات کی پیروی کی۔

نقش بدیع مانند مخزن الاسرار اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　نقش بدیع است ز کلک قدیم

مولانا میرزا محمد قتی کی پیدائش 909 ش میں ہوئی۔ وہ ملک الکلام سے جانے جاتے تھے۔ ملک قتی گیارہویں صدی کے معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ سال 987 ق کو ہندوستان ہجرت کی اور دکنی شاہان کے دربار میں رسائی پائی۔ انھوں نے شاہان دکن کی مدح میں اشعار کہے۔ عبدالرحیم خان خاناں نے جب وہاں فتح حاصل کی تو اس کی ملازمت میں خدمات انجام دیں۔ پھر بیجاپور ہجرت کی اور عادل شاہ ثانی کے دربار میں بلند مقام پایا۔ جب بادشاہ اکبر 1003 ھ میں احمد نگر گئے، ملک قتی نے ان سے ملاقات کی۔ بادشاہ کی خدمت میں قصیدہ کہا اور انعامات سے سرفراز ہوئے۔ سال 995 ش میں بیجاپور میں وفات پائی۔

**منبع الانہار:** ملک قتی نے مثنوی منبع الانہار بہ پیروی مخزن الاسرار نظامی لکھی۔ منبع الانہار یعنی در بارہ نہر مشہور است۔ ملک قتی نے اس میں جا بجا شعر عارفانہ اور فلسفیانہ کا استعمال کیا ہے۔

ان کی دوسری تصنیفات 'شمن و برہمن' ہے۔ یہ کتاب خسرو وشیرین کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ عادل شاہ کے دستور پر ملک قتی نے ظہوری ترشیزی کے ساتھ مجموعہ 'گلزار ابراہیم' اور 'خوان خلیل' کو بھی فراہم کیا۔

## عہد اکبری کی عاشقانہ مثنویاں

عاشقانہ مثنویوں کی روایت ادبیات فارسی میں زمانہ قدیم سے ہے۔ فارسی ادب میں عاشقانہ غزل کافی مشہور ہیں۔ فارسی میں بہت ساری عاشقانہ داستانیں مثنوی کی طرز میں موجود ہیں۔ جیسے زال ورودبہ، شیریں و فرہاد اور بیژن و منیژہ شاہنامہ فردوسی اور یوسف وزلیخا روغیرہ۔ نظامی گنجوی کی عاشقانہ مثنوی جیسے ہفت پیکر، لیلیٰ و مجنون امیر خسرو کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔

**(i) نل ودمن فیضی:** فیضی نے یہ عاشقانہ مثنوی نظامی کی پیروی اور افکار امیر خسرو دہلی کے لیے لکھی ہے۔ پیش ہے ایک شعر

صد بلبل مست نغمہ گر خاست　　　کند ہند گل عراق برخاست

جس کا مفہوم ہے کہ اگر سیکڑوں بلبل نغمہ سرائی کرنا چاہیں تو عراق سے بلند ہو کر ہندوستان کی مٹی میں آنا ہوگا۔

عہد اکبری میں فیضی، غزالی مشہدی کے بعد دوسرے ملک الشعرا تھے جنھوں نے ادب کی طرف توجہ مبذول کی۔ بادشاہ اکبر کی خواہش پر فیضی نے چہار ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی 'نل ودمن' لکھی۔ یہ سال 1003 ھ ق میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

مثنوی 'نل ودمن' حمد خدا سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اکبر شاہ، مناجات، نعت سید المرسلین، معراج، عشق نل ودمن، بیقراری دمن از جدائی نل وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

مثنوی 'نل ودمن' درحقیقت در بارہ نل بادشاہ اجین ودمن دختر راجہ بھیم سین کہ حکمرانان بیدر ہے۔

نل ودمن درحقیقت قسمتی 'مہابھارت' و 'رامایانہ' میں آتی ہے۔ ملک الشعرا فیضی نے قرن دہم ہجری میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اور بعد میں نظم فارسی میں نظامی کی مثنوی لیلیٰ ومجنوں کے طرز پر لکھا۔ عبدالقادر بدایونی نے نل ودمن کے بارے میں لکھا ہے:

''والحق مثنوی است کہ در این صد سال قبل آن بعد از امیر خسرو در ہند کسی دیگر گفتہ باشند۔''

متذکرہ بالا تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی اپنے زمانے کے ماہر مثنویات تھے۔ ان کی تصنیفات کو آج بھی دانشوران فارسی ادب اور محققین تحقیقی نگاہ سے پرکھتے ہیں۔

**(ii) صنم وبرہمن:** ملک قتی نے یہ مثنوی نظامی گنجوی کی عاشقانہ مثنوی خسرو شیرین کے طرز میں لکھی۔ اس مثنوی کے مضامین عشق برہمن وصنم و نور ایمان از دل قم، مناجات و توحید ایزد تعالیٰ، علاوہ اس کے شب معراج، رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ دراصل یہ ملک قتی کی تمثیلی مثنوی اور عقاید مذہبی ہندوان پر ہے۔

**(iii) سوز وگداز:** نوعی خبوشانی معروف شاعر قرن دہم و اوائل یازدہم خبوشان میں پیدا ہوا۔ سوز وگداز پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی عہد اکبری کے ایک حقیقی واقعہ پر مشتمل ہے۔ روایت کے مطابق یہ مثنوی، 'عشق نامہ' حسن دہلوی سے تاثر پذیر ہے۔ مثنوی 'عشق نامہ' دراصل داستان عاشقانہ دو جوان ہندی ہے۔ جو کہ رسم ستی کے عاشقانہ سوز کی تعبیر کرتی ہے۔ مثنوی سوز وگداز بھی قصہ مردم ہندی پر مبنی ہے۔ رسم ستی عہد اکبری میں منع قرار دی گئی۔

**(iv) فرہاد وشیرین:** عرفی نے یہ معروف عاشقانہ مثنوی نظامی کی مثنوی خسرو شیرین کی پیروی میں لکھی۔ فرہاد و شیرین عرفی کی آخری عمر تک ناتمام رہی۔ شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور اس کے بعد وصال شیرازی نے در نیمہ دوم صدہ سیزدہم (2nd half of thirteen century) کو مکمل کیا۔ عرفی نے اس کو 1080 بیت پر لکھا تھا۔

وصال شیرازی نے اس کو 1251 اشعار کا اضافہ کیا ہے مگر وصال شیرازی بھی مکمل کرنے سے قاصر رہے۔ اس کے بعد صابر شیرازی نے در نیمہ دوم صدہ سیزدہم میں 304 بیت اور شامل کیے اور مثنوی 3000 بیت پر مشتمل پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اگر ہم نظامی کی مثنوی خسرو شیرین اور عرفی کی فرہاد وشیرین کا تقابلی مطالعہ کریں، تو واضح ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے سے تاثر پذیر ہیں۔

شعر مثنوی ''خسرو شیرین'' نظامی:

خداوند در توفیق بگشای　　　نظامی را رہ تحقیق بنمای
دل دہ کو یقینت را بشاید　　　زبانی کہ آفرینت را سراید

اے میرے اللہ تو توفیق کا در وا کر دے اور نظامی کو حقیقی راست کی رہنمائی کر دے۔ اگر صدق دل سے تیرا یقین کیا جائے تو زبان بنانے والے کی قصیدہ خوانی کرتی نظر آتی ہے۔

شعر مثنوی 'فرہاد وشیرین' عرفی۔

خداوندا دلم بی نور تنگ است　　　دل من سنگ و کوہ طور سنگ ست
دلم را گو تاہ دہ چشمہ نور　　　تجلی کن کہ موسیٰ ہست دو طور

اے میرے مالک میرا دل بے نور ہونے کی وجہ سے تاریک ہے۔ میرا دل پتھر بھی اور کوہ طور بھی پتھر ہے۔ اے میرے اللہ میرے دل کو نور کے دریا میں غوطہ دے دے۔ تاکہ روشن ہو جائے کیونکہ حضرت موسیٰ بھی کوہ طور پر تھے۔ **یوسف وزلیخا:** مثنوی یوسف وزلیخا معروف شاعر 'کاہی' کی ہے۔ کاہی نے عہد عسکری اور اس کے بعد عہد اکبر کے دربار میں ادبی خدمات انجام دیں۔ یوسف وزلیخا دوسری عاشقانہ مثنویوں کی طرح عاشقانہ مثنوی ہے۔

اس کے علاوہ مثنوی دلفریب سید شاہی کی ہے۔ یہ مثنوی عشق موہنی وموسیٰ پر مشتمل ہے۔ موسیٰ دراصل سرہنگ تھا۔ سرانجام موسیٰ نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد موہنی، موسیٰ کی قبر پر جاتی ہے اور اپنی جان دے دیتی ہے۔ درحقیقت مثنوی ''دلفریب'' میں موہنی کو والدین نے موسیٰ سے ازدواج کے لیے روکا۔ اس طرح دونوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ یہ عہد اکبری کی معروف ترین عاشقانہ مثنوی ہے۔

## حوالہ جات:


(1) شریف قاسمی، ڈاکٹر ذاکرہ، فارسی شاعری، ایک مطالعہ، انڈیو پرشین سوسائٹی، لال کنواں، دہلی، طبع اول 1987

(2) نعمانی، شبلی، شعر العجم، جلد سوم، دار المصنفین اعظم گڑھ، 2002ء

(3) احمد خواجہ، نظام الدین، طبقات اکبری، جلد دوم، با تصحیح بی۔ دے، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، 1931

(4) عبد القادر، بدایونی با تصحیح مولوی احمد، علی منتخب التواریخ، جلد سوم، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، 1889

(5) آزاد، محمد حسین، دربار اکبری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت انسانی وسائل حکومت ہند، 2000

(6) خاتون ڈاکٹر عابدہ، ہندو فارسی شعرا مغل عہد میں، بازار مٹیا محل جامع مسجد، دہلی، 2014

(7) عبدالرحمٰن، صباح الدین، بزم تیموریہ، جلد اول، دار المصنفین شبلی، اعظم گڑھ، 1995


■


**Altaf Hussain**
Research Scholar, Dept of Persian
Jawaharlal Nehru University
New Delhi, 110067
Email: altaf1091@gmail.com
Mobno: 8800339070

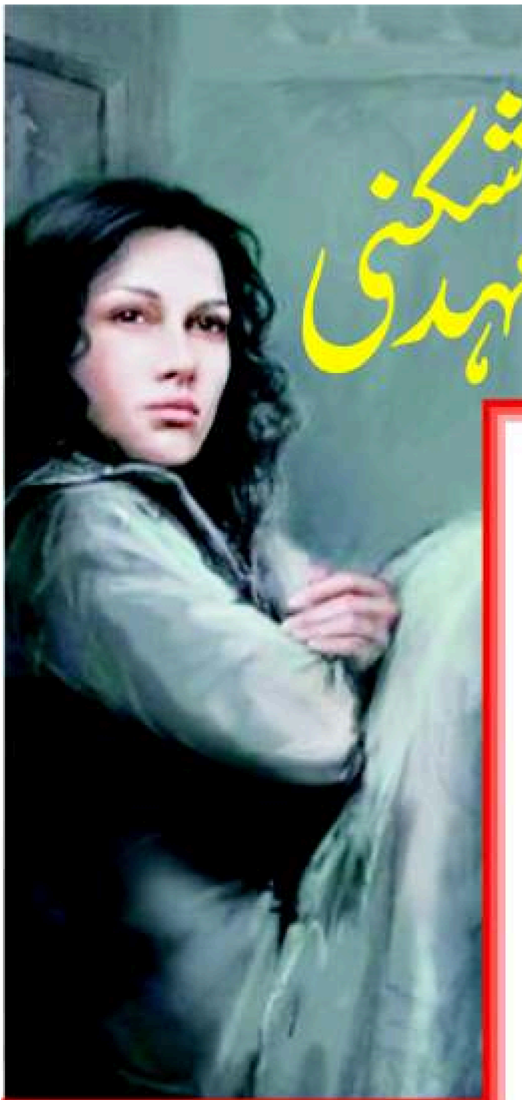

# عورت کی عہد شکنی

مصنف : مصطفی لطفی المنفلوطی
ترجمہ: سعد اللہ احسان

مصطفی لطفی منفلوطی (30 دسمبر 1876، 25 جولائی 1924) کی ولادت مصر کے ضلع 'اسیوط' کے ایک قصبہ 'منفلوط' میں ہوئی۔ ان کا گھرانہ عز و شرف میں معروف تھا۔ کم عمری میں انہوں نے قرآن حفظ کرلیا۔ گیارہ سال کی عمر میں ان کے والد نے جامعہ ازہر قاہرہ میں داخل کرادیا۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کا بیٹا ایک بڑا عالم دین بنے، مگر قدرتِ الٰہی اور منفلوطی کی طبیعت کو کچھ اور منظور تھا۔ منفلوطی کو دینی تعلیمات میں گھرائی و گیرائی پیدا نہیں کرنا تھا بلکہ زبان اور ادبیات کی طرف جانا تھا۔ انہیں اپنے اس مقصد کا حصول شیخ محمد عبدہ کے عبدالقاھر جرجانی کی 'دلائل الاعجاز' اور 'اسرار البلاغۃ' کے دروس میں نظر آیا۔

منفلوطی کی متعدد کتابیں النظرات، العبرات، منظرعام پر آئیں جن میں 'النظرات' نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ تین حصوں پر مشتمل یہ کتاب ان سماجی مضامین کا مجموعہ ھے جو انہوں نے 'المؤید' نامی اخبار میں تسلسل کے ساتھ لکھے۔ 'العبرات' بھی ان کی اہم کتاب ھے جس کا انگریزی میں The Tears کے عنوان سے ماجد خاں ملك صدیقی نے ترجمہ کیا ھے۔ منفلوطی نے کئی فرانسیسی کہانیوں اور ڈراموں کو اپنی فصیح و بلیغ عربی کا جامہ بھی پہنایا، جن میں Alphonse Kaar (1808-1890) کی کتاب Sous les tilleuls کا ترجمہ 'تحت ظلال الزیزفون' یا 'ماجدولین' بہت پسند کیا گیا۔ ماجدولین کا اردو میں 'شہناز' کے نام سے حبیب اشعر دھلوی نے ترجمہ کیا ھے جو حالی پبلشنگ ہاؤس دھلی سے 1956 میں شائع ہوا۔ انہوں نے 'العبرات' کی ایک طویل کہانی کا بھی ترجمہ 'رخسانہ' کے عنوان سے کیا ھے جو انشاپریس لاھور سے 1950 میں شائع ہوا۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے بھی منفلوطی کی تخلیقات کے ترجمے کیے ھیں۔

منفلوطی اردو والوں کے لیے اجنبی نہیں ھیں کیونکہ ان کے بہت سے افسانوں کے ترجمے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رھے ھیں۔ منفلوطی کے حوالے سے پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اپنی کتاب' مشاھیر ادبیاتِ مشرق' مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی 2019 میں لکھا ھے کہ "وہ بہت بڑے محقق یا ادبی نقاد نہیں تھے لیکن ان کی تمام تحریریں تخلیقی ادب کا شاھکار ھیں۔ اجتماعی زندگی کے آلام و مسائل بہت موثر طریقے سے پیش کرتی ھیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ھیں ان میں غیرمعمولی قوت و انفرادیت ھے اور نہاں خانہ دل میں ان کی تحریریں اتر جاتی ھیں اور یہ اس لیے ہوا کہ قدیم ذخیرۂ ادب پر ان کی گرفت بہت مضبوط ھے۔ آج دنیا کی جامعات میں منفلوطی کی تحریریں اور کتابیں نصاب میں اسی طرح شامل ھیں جیسے ھندوستان میں اردو میں شبلی یا حالی یا محمد حسین آزاد کی تحریریں ھیں۔"

محمد سعداللہ احسان عربی زبان و ادب کے طالب علم ھیں۔ انہوں نے لطفی کے اِس افسانے کا عمدہ ترجمہ کیا ھے اور ترجمے میں اس کے فنی لوازم کا خیال رکھا ھے۔

کہا جاتا ہے کہ یونان میں ایک حکیم تھا جسے اپنی بیوی سے ایسی محبت تھی جو اس کے دل و دماغ پر غالب تھی اور احساسات میں رچی بسی تھی، لیکن اس کیف وسرور کے ساتھ مستقبل کی ایک فکر اسے ہمیشہ لاحق رہتی اور اس کی خوشیوں کو مکدر کر دیتی۔ وہ یہ کہ جب وہ مصائبِ زمانہ سے دوچار ہوگا، اسے موت سے ہم آغوش ہونا پڑے گا تو اس کی بیوی کسی اور کی ملکیت ہوجائے گی۔

وہ اکثر اپنے ان نفسیاتی افکار کا ذکر اپنی بیوی کے سامنے کرتا۔ وہ اسے بہلاتی، پھسلاتی، سیکڑوں وعدے کرتی اور طرح طرح کی قسمیں کھاتی کہ وہ جیتے مرتے صرف اسی کی ہوکر رہے گی۔ ان میٹھی باتوں سے اسے چند لمحوں کے لیے سکون تو ملتا لیکن وہ پھر اندیشوں اور رنج وغم میں کھو جاتا۔

ایک دفعہ چاندنی رات میں اپنے گھر لوٹتے وقت اس حکیم کا گزر شہر کے قبرستان سے ہوا، اس نے سوچا کہ کیوں نہ قبرستان کی زیارت کی جائے، تاکہ مردوں کے پاس رہ کر اس کے دل سے موت کا خوف کسی قدر کم ہوجائے۔ یوں بھی اکثر شرابی کی دوا شراب ہی ہوتی ہے، اور ڈرپوک شخص بھوت پریت کی کہانیوں سے ایک طرح کی لذت محسوس کرتا ہے۔ قبروں کے پاس سے گزرتے وقت اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو ایک نئی قبر کے پاس جس کی مٹی بھی ابھی خشک نہ ہوئی تھی بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ میں سونے کے تاروں سے آراستہ ایک سفید ریشمی پنکھا تھا جس سے وہ قبر کی مٹی خشک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ حکیم اس کے اس عجیب عمل پر بہت حیران و پریشان ہوا، وہ کچھ آگے بڑھا اور اس سے پوچھا: ''تم کون ہو اور یہاں کیوں ہو؟، یہاں کون دفن ہے؟ یہ کیا کر رہی ہو؟'' لیکن اس عورت نے کوئی جواب نہ دیا، بس اپنے کام میں لگی رہی۔ حکیم نے اس کا پنکھا لے کر اس کی مدد کرنی

شروع کی۔ جب قبر کی ساری مٹی خشک ہوگئی تو اس عورت نے بتانا شروع کیا ''یہ مدفون میرا شوہر ہے۔ تین دن پہلے اس کی وفات ہوئی۔ اس کے مرضِ وفات میں میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کے قبر کی مٹی نہ سوکھ جائے میں دوسری شادی نہ کروں گی۔ آج میری دوسری شادی ہے اور میری وفاشعاری اور اس مدفون کی محبت اس بات سے مانع ہے کہ میں بدعہدی کروں۔ پھر اس عورت نے کہا'' آپ نے جو میری مدد کی، اس کے بدلے میں یہ پنکھا میں آپ کو ہدیہ کرتی ہوں۔'' اس نے وہ پنکھا لے کر اپنے گھر کا رخ کیا۔ وہ غم سے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ راستہ میں شرابیوں کی طرح بڑبڑاتا جا رہا تھا'' اس آدمی نے اپنی بیوی سے محبت کی، حسنِ سلوک کیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے کیا کیا؟ وہ اس کی قبر پر آئی۔ رونے کے لیے؟ تذکیرِ عہد کے لیے؟ نہیں، بلکہ صرف اپنی قسم سے آزاد ہونے کے لیے۔ اس کی قبر کا کتبہ اس کے لیے صرف ایک آئینہ تھا جس کے سامنے وہ اپنے دوسرے شوہر کے لیے زیب وزینت اختیار کر رہی تھی۔

اسی لاشعوری کیفیت میں وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ سامنے اپنی بیوی کو کھڑا پایا جو اس کے غمزدہ چہرے کو دیکھ کر پریشان تھی۔ حکیم نے کہا ایک بے وفا عورت نے مجھے یہ پنکھا تحفہ میں دیا ہے۔ میں نے اسے ایک آلۂ خیانت سمجھ کر قبول کرلیا، لیکن تم اس پنکھے کی مجھ سے زیادہ حقدار ہو۔'' پھر اس نے پورا قصہ اپنی بیوی سے بیان کردیا۔ یہ سن کر وہ غضبناک ہوگئی، شوہر کے ہاتھ سے پنکھا چھینا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے، اور اس بے وفا عورت پر سب وشتم کرنے لگی، اس کی بے غیرتی اور بے مروتی پر اسے لعن طعن کرنے لگی اور کہا'' کیا یہ خیالات کبھی آپ کا پیچھا نہ چھوڑیں گے؟ کیا دنیا کی ہر عورت کو آپ اس بے وفا عورت کی طرح خیال کرتے ہیں؟ یہ سن کر حکیم نے پوچھا: تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری موت کے بعد دوسری شادی نہ کروگی، کیا تم اپنے وعدے کا پاس رکھوگی؟ اس نے جواب دیا: یقیناً، اور بدعہدی کی صورت میں اللہ مجھے خراب وبرباد کردے۔ اس تجدیدِ قسم سے حکیم کو کچھ اطمینان وسکون نصیب ہوا۔

اس واقعہ پر ایک ہی سال گزرا تھا کہ وہ آدمی سخت بیمار ہوگیا، کافی علاج ومعالجہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اس کا مرضِ وفات ہے۔ اس نے ایک صبح اپنی بیوی کو بلایا اور اس کا عہد یاد دلایا، اور اس دن کی شام تک اس کی زندگی کا سورج بھی غروب ہوگیا۔ اس کی بیوی نے اس کی لاش پر کفن ڈال کر اسے ایک خالی کمرے میں رکھ دیا تاکہ دوسرے دن اس کی تدفین کا انتظام کرے، اور خود ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر رونے دھونے لگی، وہ اسی حال میں تھی کہ اس کا خادم کمرے میں داخل ہوا اور بتایا کہ ابھی ابھی حکیم صاحب کا ایک نوجوان شاگرد ان کے مرضِ وفات کی برسن کر اپنے شہر سے یہاں آیا ہے، اپنے استاد کی موت کی خبر سن کر اس پر غشی طاری ہوگئی، اور وہ دروازے کی چوکھٹ پر ہی گر پڑا ہے۔ عورت نے کہا'' اسے فوراً مہمان خانے میں لے جاؤ، اور جب تک وہ ٹھیک نہ ہو اس کا خیال رکھو۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ آہ وبکا میں لگ گئی۔

ابھی رات کا تہائی حصہ ہی گزرا تھا کہ خادم دوبارہ آپہنچا اور ہانپتے گھبراتے بولا'' ہمارا مہمان اپنے درد وتکلیف کی وجہ سے ایک عذاب میں مبتلا ہے، مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کروں؟ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا تو وہ یقیناً ہلاک ہوجائے گا۔ اس بات نے اسے بھی فکرمند کردیا۔ وہ گرتی سنبھلتی اٹھی اور مہمان خانہ پہنچی۔ وہ نوجوان چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، اور اس کے سر کے پاس چراغ جل رہا تھا۔ جب یہ اس کے قریب گئی اور اس کا چہرہ دیکھا تو اسے لوحِ وجود پر دستِ قدرت کا کھینچا ہوا سب سے حسین چہرہ نظر آیا۔ اسے محسوس ہوا کہ گویا اس کے سامنے موجود چراغ بھی اس کے تابناک حسین چہرے سے پھوٹتی ہوئی روشنی کا ایک عطیہ ہے، اور اس کے سینے سے آنے والی کراہنے کی آواز تاریک رات کا غمگین گیت ہے۔ اس مریض کے غم نے اس کے مردہ شوہر کے غم کو بھی مضمحل کردیا۔ اب وہ اس کی تیمارداری میں مشغول ہوگئی اور اس کے علاج میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ جب اسے کچھ افاقہ ہوا تو اس نے اس عورت کو اپنے پاس موجود پایا۔ نوجوان نے پہلے تو اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے احوال کہہ سنائے کہ وہ اپنی قوم میں ایک اجنبی ہے جو ماں، باپ، بیوی، بچے ہر سکھ سے محروم ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے استاد سے اپنے تعلقات بھی بیان کیے۔ یہ سب سن کر عورت نے سر جھکا لیا اور دیر تک اپنے خیالات میں گم رہی، پھر اس نے سر اٹھایا اور نوجوان کا ہاتھ تھام کر بولی'' تم نے اپنا استاد کھویا، اور میں نے اپنا شوہر، ہم دونوں کا غم اب ایک ہی ہے، تو کیوں نہ ہم زمانے کی تکلیفوں کا سامنا ساتھ مل کر کریں۔'' نوجوان اس کے دل کی بات بھانپ گیا اور اس کے لبوں پر کرب وخلش سے مخلوط ایک مسکراہٹ کھل گئی۔ وہ بولا'' آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ جب کہ میری زندگی برباد ہوچکی ہے، میری بیماری نے میرا آرام حرام کردیا ہے، اور اگر اللہ کی رحمت ساتھ نہ ہوئی تو میرے ڈاکٹر کے مطابق میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔ لہٰذا آپ کسی اور کو تلاش کیجیے، کیونکہ آپ کے سامنے پوری زندگی ہے جبکہ میرے سامنے صرف موت...

عورت نے کہا'' تمھیں جینا ہوگا، میں تمھارا علاج کروں گی، چاہے تمھاری دوا کا معاوضہ میری جان ہی کیوں نہ ہو۔

نوجوان بولا: اگر آپ میرا یقین کریں تو میں بتاؤں کہ میں اپنی دوا سے واقف ہوں۔ میرے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں ایسے مردار آدمی کا مغز کھاؤں جس کی موت کو پورا ایک دن نہ گزرا ہو۔ اب بھلا یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس لیے میں آج تک دوا وشفا سے محروم ہوں۔

یہ سن کر اس عورت پر رعشہ طاری ہوگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور دیر تک کچھ سوچتی رہی، پھر سر اٹھا کر بولی: '' تم فکر نہ کرو! تمھاری دوا کا انتظام میں کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ نوجوان کو آرام کی تلقین کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور سیدھا اس جگہ پہنچی جہاں اس کا شوہر اپنے اوزار وغیرہ رکھتا تھا۔ وہاں سے اس نے ایک کلہاڑی اٹھائی، اور دبے پاؤں اپنے مرے ہوئے شوہر کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا۔ دروازے کی چرچراہٹ نے اسے بدحواس کردیا۔ وہ خوف ودہشت سے اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، اس نے چاروں طرف دیکھا، ایک مردہ جسم کے علاوہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ اپنے 'کام' کو انجام دینے کے لیے آگے بڑھی یہاں تک کہ چارپائی کے قریب آگئی۔ اس نے کلہاڑی ہوا میں لہرائی تاکہ اس سے اپنے شوہر کا سرتن سے جدا کرسکے۔ وہی شوہر جس سے یہ قسم قسم کے عہد وپیمان باندھا کرتی تھی اور قسمیں کھاتی تھی کہ اس کے بعد کسی سے شادی نہ کرے گی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کلہاڑی کو اپنے شوہر کے خون سے رنگتی اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو اس کو گھور رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ وہ کچھ سمجھ پاتی اس سے پہلے ہی اس نے اپنے پیچھے حرکت محسوس کی، وہ فوراً پیچھے مڑی، نوجوان اور خادم دونوں دروازے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ میں سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس کا شوہر اس کی طرف بڑھا اور ایک عجیب لہجہ میں بولا'' کیا اس بے وفا عورت کے ہاتھ کا پنکھا تمھارے ہاتھ میں موجود کلہاڑی سے خوبصورت نہ تھا؟ کیا وہ عورت جو اپنے شوہر کی تدفین کے بعد قبر کی مٹی سکھائے اس عورت سے بہتر نہیں جو ماتم سے پہلے اپنے شوہر کی کھوپڑی توڑ دے۔'' اس کی بیوی اسے حیرت سے تکتی رہ گئی...

(غدر المرأة—النظرات)

**Sadullah Ehsan**
Madarsa Sabeelus Salam
Shaheen Bagh, Near Shaheen Masjid
New Delhi - 110025

## اردو ادب میں مضمون کا ارتقا

مصنفہ سیدہ جعفر

صفحات: 496، قیمت: 220 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: مظہر حسنین، T-39، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

زیر نظر کتاب 'اردو ادب میں مضمون کا ارتقا' ڈاکٹر سیدہ جعفر کی اہم تصنیفات میں سے ایک ہے۔ سیدہ جعفر کی شخصیت اردو کی ادبی تاریخ میں ایک بلند پایہ محقق، نقاد اور مؤرخ کی حیثیت سے جانی پہچانی ہے۔ ان کا شمار دکنیات کے صف اول کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی کاوشیں تاریخ ادب کا انمٹ نقش بن گئی ہیں۔ ان کے علمی انہماک اور ادبی شغف نے اردو ادب کے دامن کو بہت سے آبدار موتیوں سے بھر دیا ہے۔ جس سے ادب کا سرمایہ وسیع ہو ا اور انہوں نے کئی ایسے اچھوتے میدان میں اتر کر ادب کی آبیاری کی جس سے اکثر لوگ نظریں بچا کر گزر جاتے ہیں۔ اب تک ان کی 30 سے زاید کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مشغلۂ حیات درس و تدریس رہا ہے۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح دکنیات اور دکنی ادب کے وقار کو بلند کیا۔ اردو میں عام طور پر خواتین نے شعر و شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور دوسری تخلیقی اصناف میں اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا ہے۔ تحقیق و تنقید میں بہت کم دلچسپی لی ہے، لیکن سیدہ جعفر نے تحقیق و تنقید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس لیے ان کا شمار اردو کے اہم محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ حالانکہ سیدہ صاحبہ کا بڑا کام دکنیات ہی سے متعلق ہے۔ ذخیرۂ ادب میں ان کی کئی اہم تصانیف ہیں، جو قابل قدر ہونے سے کہیں زیادہ ادب کی ضرورت ہیں۔ اس لیے سیدہ جعفر کی ادبی فکر سے پیدا ہونے والی تصنیفات ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ انھیں اہم تصنیفات میں 'اردو ادب میں مضمون کا ارتقا' ہے۔ یہ کتاب مضمون نگاری کے تعلق سے اس لیے اہم ہے کہ اس میں انھوں نے مضمون کے مختلف زاویوں کا بھرپور احاطہ کیا ہے، یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کی ان کی یہ کتاب مضمون نگاری کے موضوع پر اکلوتی ہوگی جس میں سیر حاصل انداز میں 'مضمون' کے تعلق سے بات کی گئی ہے۔ مضمون نگاری پر اتنی تفصیلی اور جامع کتاب سیدہ جعفر کی جہد مسلسل کا ثمرہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی حیثیت اور خدمات کے لیے جن لوگوں نے اپنے خون جگر سے ادب کو سینچا ان میں ماسٹر رام چندر ایک بڑا نام ہے۔ جنھوں نے اردو ادب میں صنف مضمون نگاری کو متعارف کرایا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحبہ کی ماسٹر رام چندر پر لکھی گئی کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے ماسٹر رام چندر کے تعلق سے ادب کے ان نثری پہلوؤں پر بہت وسیع مطالعہ کیا اور اس کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب 'اردو ادب میں مضمون کا ارتقا' کے آغاز میں مضمون نگاری کے ارتقائی رجحانات کے ذیل میں سیدہ جعفر کی اس کتاب کو اس لیے اہم تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اپنی پوری حیات میں انھوں نے جو اہم عمل انجام دیے وہ درس و تدریس اور ادب کا مطالعہ رہا ہے۔ انھیں وسیع مطالعہ اور درس و تدریس کے تجربات کی روشنی میں ان کی یہ کتاب 'اردو ادب میں مضمون کا ارتقا' وجود میں آئی ہے۔ اس لیے ان کی اس کاوش کو ان کی دوسری کتابوں پر فوقیت دی جاسکتی ہے، کیونکہ مضمون نگاری کے ارتقائی مدارج پر انھوں نے تفصیل سے بات کی ہے، جو تشنگان ادب کو سیراب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات میں مضمون نگاری کی مختلف جہتیں مثلاً ماہیت، صنف، اصطلاح، تعریف، موضوع، اقسام، خصوصیات، مضمون و انشائیہ کا فرق، مضمون اور دیگر نثری اصناف میں فرق کی وضاحت، کہاوتیں، ضرب الامثال وغیرہ پر مختلف ابواب میں بات کی گئی ہے۔

باب دوم میں اردو نثر میں مضمون نما تحریروں کے تعلق سے بات کرتے ہوئے

چینی، عربی کہاوتیں، ضرب الامثال کے ساتھ عربی وفارسی اور اردو میں مضمون نما تحریروں کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ باب سوم میں مصنفہ نے ماسٹر رام چندر اور ان کے شاگردوں کا فن مضمون نگاری کے حوالے سے جائزہ بھی لیا ہے اور عہد بہ عہد مضمون نگاری کے ارتقا کے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن میں مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ باب چہارم میں سر سید احمد خان، چراغ علی، نواب محسن الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، نواب وقار الملک، اسماعیل میرٹھی اور قاری سرفراز حسین کی مضمون نگاری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف ابواب میں شبلی نعمانی، ریاض خیرآبادی، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، عبد الحلیم شرر، محمد علی جوہر، دیا نرائن نگم، ظفر علی خاں، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری جیسے ادبا کی مضامین نویسی کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

سیدہ جعفری کی یہ کتاب اپنے قیمتی اور مفید مشمولات کی وجہ سے، ادبی دنیا اور خصوصاً جامعات کے اساتذہ اور طلبا اور ریسرچرز کے لیے نہایت اہم ثابت ہوگی۔

## سماجی تحقیق

مصنف: عذرا عابدی

صفحات: 490، قیمت: 215 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد طلحہ ندوی

گیسٹ فیکلٹی پی جی ڈپارٹمنٹ آف اردو، دوراندا کالج، رانچی

اردو میں سماجیات پر بہت کم کتابیں ہیں۔ جب کہ سماجیات ایک بہت ہی ضروری علم ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں سماجیات پر بڑی اہم اور قیمتی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو زبان میں سماجیات کے حوالے سے قابل قدر کام نہیں ہوا ہے۔ خاص طور پر اردو زبان میں سماجی تحقیق کے حوالے سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ایسے میں اردو میں سماجی تحقیق پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں اس موضوع کی تمام جزئیات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں پروفیسر عذرا عابدی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ عذرا عابدی صاحبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ سماجیات سے وابستہ ہیں اور علم سماجیات ان کا خاص موضوع ہے۔ اس پر ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو میں یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں سماجی تحقیق کے اہم تصورات، مختلف مراحل، معروضیت، شماریات، اخلاقی امور اور دیگر مسائل پر بڑی عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ مصنفہ نے سماجی تحقیق کی تمام اصطلاحات کو آسان اور سلیس انداز میں بیان کیا ہے جس سے صرف سماجیات سے تعلق رکھنے والے طلبا نہیں بلکہ عام اردو داں حلقہ بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

'سماجی تحقیق' میں 21 کلیدی مضامین ہیں۔ ان 21 مضامین کے عناوین اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون 'علمیات کے نظریات سے متعلق امور' ہے۔ اس مضمون میں طبیعیات اور مابعد الطبیعیات، علمیات، علم الاقدار اور علم کی قسموں اور شکلوں پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے اور سماجی و سائنسی علوم، روشن خیالی اور موجودہ نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا مضمون بہت ہی دلچسپ ہے جس کا عنوان 'سائنسی تحقیق: اقسام اور طریقے' ہے۔ چونکہ سماجی علوم کا ڈانڈا سائنسی تحقیق کے طریقہ کار سے جا ملتا ہے۔ اس لیے مصنفہ نے سائنسی تحقیق کے طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کا علم ہونا کسی موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ وہی تحقیق کار آمد ثابت ہوتی ہے جو مبنی بر حقائق اور سائنٹفک ہو۔ تیسرے مضمون کا عنوان 'سماجی تحقیق اور سماجی سروے' ہے۔ اس مضمون میں مصنفہ نے فطری مظاہر اور سماجی مظاہر کی پیچیدگیوں اور ان کے پیچھے کی وجوہات کو تلاشنے اور ان کی گتھیوں کی تہہ تک اتر کر مطالعہ کرنے و سمجھنے اور ان کے معانی و مطالب سمجھ کر تعریف وضع کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح تحقیقی سلسلے کو منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھانے اور سائنسی نتائج اخذ کرنے کے تمام وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے چوتھا مضمون 'تجربی تحقیق'، پانچواں مضمون 'سماجی تحقیق کے کچھ اہم تصورات'، چھٹا مضمون 'سماجی تحقیق کے مختلف مراحل'، ساتواں مضمون 'مفروضہ'، آٹھواں مضمون 'سماجی تحقیق میں اخلاقی امور' نواں 'سماجی تحقیق میں معروضیت'، دسواں 'تحقیق کا ابتدائی خاکہ'، گیارہواں 'نمونہ کاری'، بارہواں 'سماجی تحقیق میں معطلیہ کا جمع کرنا'، تیرہواں 'انٹرویو'، چودہواں 'سوالنامہ'، پندرہواں 'مشاہدہ'، سولہواں 'مواد کا تجزیہ'، سترہواں 'نسل نگاری اور شرکتی مشاہدہ'، اٹھارہواں 'معطلیہ کا تجزیہ اور کوڈنگ'، انیسواں 'درجہ بندی اور جدول بندی'، بیسواں 'کمپیوٹر کا استعمال اور رپورٹ تحریر کرنا'، اکیسواں اور آخری مضمون 'سماجی تحقیق میں شماریات' ہے اور جیسا کہ عناوین سے ظاہر ہے۔ یہ مضامین سماجی تحقیق کے باب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال صرف کیے ہیں تب جا کر یہ سماجیات کے طالب علموں کے لیے یہ تحفہ تیار ہوا ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''سماجی تحقیق پر اردو زبان میں اچھی کتابوں کی دستیابی نہ ہونے کے سبب طلبہ کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا قیمتی وقت انگریزی زبان میں جو مواد انھیں فراہم کرائے جاتے ہیں ان کا ترجمہ کرنے اور سمجھنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ سماجی تحقیق پر ایک اچھی کتاب تحریر کرنے کی اس لیے ضرورت تھی کہ طلبا کو آسان زبان میں مواد فراہم کرایا جا سکے تاکہ وہ سماجی تحقیق سے جڑی اصطلاحات کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ اس کتاب کو تحریر کرتے وقت میں نے اس بات پر خاص توجہ دینے کی کوشش کی ہے کہ سماجیات کے طلبا کو ایک ہی کتاب میں وہ تمام مواد مہیا کرا سکوں جس کی ضرورت سماجی تحقیق کے حوالے سے اہم اور ضروری ہے۔''

امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر عذرا عابدی کی اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور کما حقہ اس کتاب سے استفادہ کیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:**

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

# فکشن

## مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

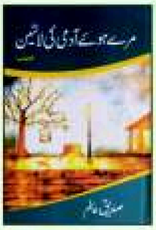


مصنف:صدیق عالم

صفحات: 319، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2019

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صدیق عالم جدید دور کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ تخلیقی ادب میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اہل دانش کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اب تک ان کی نو کتابیں بشمول 'مرے ہوئے آدمی کی لالٹین' اشاعت کے مراحل سے گزر کر قارئین سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے ان کی جو تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں تین افسانوی مجموعے، ایک شعری مجموعہ اور دو ناول شامل ہیں، جن کے نام بالترتیب 'آخری چھاؤں'، 'لیمپ جلانے والے'، 'بین' (افسانوی مجموعہ)، 'پتھر میں کھدی ہوئی کشتی' (شعری مجموعہ) اور 'چار رنگ کی کشتی'، 'چینی کوٹھی' (ناول) ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی دو کتابیں پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں 'نادر سکوں کا بکس' (افسانوں کا انتخاب) اور 'وحشیوں کا انتظار' جو جے ایم کوئسی کے ناول کا ترجمہ ہے، شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'مرے ہوئے آدمی کی لالٹین' صدیق عالم کا نہایت اہم افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں: رکی ہوئی گھڑی، ببول، چور دمسکو، غلط ہڈی، خدا کا بھیجا ہوا پرندہ، مرتا ہوا آدمی، مٹی کی کہانی، ڈولفن، دوسارس کی اوڈیسی، گنی پگ، سرچ لائٹ، جنگ اور امن، لال چیونٹیاں، الزورا، جانور، پری اور کلرک، قصہ ایک نیگرو اور مرے ہوئے کتے کا، شادی کا رجسٹر، مرے ہوئے آدمی کی لالٹین، رود خنزیر۔

صدیق عالم کے ان تمام افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھیں اپنے خیالات کی عکاسی اور اظہار بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی حقیقت، انسانی جبلت، اس کی خصلت، گھناؤنی سیاست، سماجی کرب اور خود غرضی وغیرہ کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف ستھری ہے۔ انھیں علاماتی اور استعاراتی زبان و بیان پر بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعے میں اس کی مثالیں کثرت سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب میں شامل ایک افسانہ 'الزورا' ہے جس میں ایک شرابی کی زبانی سماجی حقیقت، انسانی بے حسی اور روزمرہ کی زندگی پر طنز کے گہرے وار کیے گئے ہیں۔ لیکن انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ دوران مطالعہ قارئین کی نگاہوں میں سیکڑوں مناظر ابھرتے اور بکھرتے رہتے ہیں۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' الزورا نے مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم اس جانکاری کے بغیر بھی زیادہ بہتر یا بدتر جانور ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''تو پھر تم اپنے بارے میں مجھے اتنا کیوں بتانا چاہتے ہو؟...

''زیادہ بتانا مطلب زیادہ چھپانا، مطلب پانی کو زیادہ گدلا کر دیتا ہے۔ الفاظ ہمارے سب سے آزمودہ اور طاقتور نقاب ہیں۔ اور دریا کی طرف جانے کا مطلب ہے اس جگہ کو لوٹنا جہاں سے سے ہم سارے جاندار رینگ کر باہر آئے ہیں۔ یہ میں نہیں، دنیا کے سب سے پہلے فلسفی طالیس کا کہنا ہے۔ یہ پانی ہماری جبلت میں حاوی ہے اس لیے لوگ ساری عمر پانی کے طلسم میں گرفتار رہتے ہیں، جھیل اور سمندر کی طرف جانا چاہتے ہیں، کنوؤں میں ڈوب کر مرتے ہیں۔''

زیر تبصرہ کتاب میں ایک افسانہ ''مرے ہوئے آدمی کی لالٹین'' بھی ہے اور اسی افسانے کے عنوان پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی جدیدیت کا نظریہ غالب دکھائی دیتا ہے لیکن دلچسپی یا روانی میں کہیں بھی کمی یا جھول کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ ایک مثبت پہلو جو صدیق عالم کی تحریروں یا اس میں موجود فنی خوبیوں پر دال ہے۔

صدیق عالم کے مذکورہ افسانوی مجموعے کے تمام افسانوں پر فرداً فرداً گفتگو کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی یہاں اس کا موقع ہے۔ مجموعی طور پر صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مصنف نے اپنی تحریروں میں اپنا خون جگر شامل رکھا ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف بذات خود اس افسانے میں موجود ہے اور راوی کوئی اور شخص نہیں بلکہ خود مصنف ہی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا انتساب مصنف نے 'عمیق ذیشان' کے نام کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''جسے میں کبھی کچھ نہ دے سکا''۔ لیکن انتساب میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ عمیق ذیشان کون تھے؟ یا مصنف سے ان کا کیا رشتہ تھا؟ کتاب کی طباعت اور سرورق نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات کے اعتبار سے قیمت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں پروف کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ بہرحال اس مجموعے کے لیے میں صدیق عالم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا قلم آئندہ بھی اسی طرح رواں دواں رہے بلکہ وہ ادبی دنیا کو خوب سے خوب تر تخلیقات سے مالا مال کریں۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کی بھی قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی دیگر کتابوں کی طرح اس مجموعے کی بھی پذیرائی ہوگی۔

# انٹرویوز

## رشید حسن خاں کے انٹرویوز

مرتب و ناشر:ابراہیم افسر

صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

تقسیم کار: کتابی دنیا، دہلی

مبصر: ڈاکٹر صالحہ صدیقی، مکان نمبر 267/2B، وارڈ 24 محلّہ نواوا، الہ آباد 211002 (یو پی)

زیر تبصرہ کتاب کا نام 'رشید حسن خاں کے انٹرویوز' ہے، جسے ابراہیم افسر نے ترتیب دیا ہے۔ ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں کے انٹرویوز کو بڑی ہی خوبصورتی اور سلیقہ مندی کے ساتھ قاری کی آسانیوں کو دیکھتے ہوئے منظم انداز میں مرتب کیا ہے۔

رشید حسن خاں ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ محقق، مدون اور شاعر بھی تھے۔ مخطوطات میں بھی انھوں نے بہت اہم کارنامہ انجام دیا لیکن ان کی دلچسپی کا موضوع املا، لغت، قواعد، زبان و بیان تھا۔ انھوں نے کئی اہم موضوعات پر اعلیٰ درجے کے تحقیقی

وتنقیدی مقالات بھی لکھے جوان کے علاوہ بھی ان کی کئی اہم تصنیفات وتالیفات منظر عام پر آئیں جن میں زبان اور قواعد (لغت، تلفظ اور قواعد زبان و بیان کے مباحث) 1976 میں، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ (عملی تحقیق پر مضامین) جو کہ 350 صفحات پر مشتمل ہے 1979 میں شائع ہوئی، فسانہ عجائب (مقدمہ، متن، تشریحات، اماکن، تلفظ اور املا، اختلاف نسخ، فرہنگ اور اشاریہ) 1990ء میں شائع ہوئی۔

رشید حسن کا شمار اردو کی ممتاز تحقیق وتنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت کم وقت میں اپنی قابلیت اور فنی بصیرت، اپنے انوکھے انداز، تکنیک، ہیئت اور موضوعات و تلازمات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر اردو دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔

رشید حسن خاں نے اپنی کاوش سے اردو تحقیق وتنقید نگاری میں اہم اضافہ کیا۔ سچی تنقید وہی ہے جو زمانہ قدیم کے عظیم فنکاروں کی بالترتیب درجہ بندی اور رتبہ شناسی کرے ساتھ ہی زمانہ جدید کی تخلیقات کو بھی شامل رکھے۔ رشید حسن خاں نے اپنی اس کاوش میں ان باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ تحقیق وتنقید کے سلسلے میں وہاب اشرفی ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''کسی بھی شاعر یا فنکار یا دوسرے شاعر کی اہمیت واضح کرنے سے پہلے نقاد پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ واضح کرے کہ اس کے پاس پرکھ کے معیار کیا کچھ ہیں؟ تنقیدی کسوٹی کیا ہے؟ استدلال کن بنیادوں پر قائم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں جن سے کسی فن پارے کی بحث میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا ہے ورنہ رائے محض تو کوئی بھی قائم کرسکتا ہے، اس میں تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کی کیا ضرورت؟ گویا سب سے پہلے نقاد کو خود اپنی تنقید کی بوطیقا سے واقف ہونا چاہیے، پھر اسے اس کے نکات کی عملی صورت اجاگر کرنے پر قدرت بھی ہو۔ تب ہی تنقیدی وقار حاصل ہو سکے گا، تنقید رائے زنی نہیں ہے، نکتہ رسی اور نکتہ شناسی ہے، اور یہ کام مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس کے مطالبات بہت کچھ ہیں۔''

رشید حسن خاں بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے تقاضوں کی روشنی میں شعروادب کو پرکھنے کے قائل تھے۔ وہ زمانی تغیرات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہر عہد کی تفہیم بدلتے وقت و حالات میں مختلف ہو جاتی ہے، آج جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ماضی میں جس معنویت کے حامل تھے آج وہ بالکل مختلف ہیں، لہٰذا ہمیں نئی تفہیم کے ساتھ چیزوں کو پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے ہمارے کلاسیکی شاعروں کو بھی آج کے حالات و واقعات کے مطابق از سر نو پرکھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ رشید حسن خاں کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے انھوں نے نثری وشعری دونوں ہی صنف میں نئے نئے انکشافات کیے۔

عالمی ادب پر رشید حسن کی نظر بہت گہری تھی اور وہ عالمی تنقید کے جدید رجحانات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی لیے ان کی تنقید میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔ تنقید کا قدیم مشرقی انداز انھیں پسند نہ تھا وہ تجزیہ وتحلیل سے کام لینے کے عادی تھے۔ انھوں نے تاعمر بنا کسی مفاد کے اردو کی خدمت اور اس کی آبیاری کی اور زیادہ وقت تحقیق وتنقید میں گزارا۔ رشید حسن خاں نے اپنے تحقیقی مشاغل کے بارے میں وضاحت پیش کرتے ہوئے رسالہ اظہار ممبئی میں لکھا:

''ادبی تحقیق اب میرا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ میں اس تنقید کا قطعاً قائل نہیں، جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اس طرح میں اس تحقیق کو مکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے لیپنے پوتنے کا انداز ہو۔ چونکہ حالات نے اب بیشتر افراد کو دنیاداری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لیے تحقیق کا یہ سادہ اور صاف انداز ان کو پسندیدہ نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے منفی انداز نظر کی ایک اصطلاح وضع کی ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت کو اور جہالت کو فروغ دیں، وہ مثبت انداز نظر والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجران ادب کا ہے۔''

اس کتاب میں رشید صاحب کے ادب سے متعلق ایسے کئی حقائق کا انکشاف ملتا ہے۔ ان کے انٹرویوز کے مطالعہ سے تحقیق وتنقید، ادب وشاعری سے متعلق بے شمار گوشے منور ہوتے ہیں، وہ گوشے کیا کیا ہیں؟ رشید صاحب کیا سوچتے تھے؟ وہ تحقیق و تنقید کا مستقبل کیا دیکھتے تھے؟ ان میں آج کیا کیا برائیاں شامل ہو چکی ہیں؟ ان کو کیسے درست کیا جائے؟ اس طرح کے کئی سوالوں کے جواب آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف حاصل ہوں گے، بلکہ سیکھنے، سمجھنے اور غور وفکر کرنے کا مواد بھی حاصل ہوگا۔

اردو ادب میں کچھ شخصیتیں ایسی گزری ہیں جن کی کتابیں پڑھ کر جن کے دکھائے راستوں پر چل کر اردو سے محبت کرنے والے طلباء وطالبات اور قارئین اردو زبان سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، ایسی ہی اہم شخصیت رشید حسن خاں کی ہے جن کی کتابیں نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں، مگر افسوس کہ اس شخصیت کی کتابیں اپنی بنیاد مضبوط کرنے لیے پڑھتے تو ہیں لیکن ان کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کی زحمت کوئی نہیں اٹھاتا۔ یہ اردو داں طبقوں کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس لافانی شخصیت کو بھلا دیا۔ لیکن یہ کتاب ان کو جاننے سمجھنے کا اہم وسیلہ ہے۔ یقیناً ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں جیسی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی جو کاوش کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

یہ کتاب (رشید حسن خاں کے انٹرویوز) یقیناً ہمارے ادبی سرمایے میں اہم اضافہ ہے اور رشید حسن خاں سے محبت کرنے والوں کے لیے انمول تحفہ... جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

## تحقیق و تنقید

### پروفیسر عبدالحق منفرد اقبال شناس

مصنف: نازیہ رئیس

صفحات: 224، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-632، ڈی ڈی اے جنتا فلیٹس، پاکٹ 1، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب ایم فل کا مقالہ ہے۔ جس میں پروفیسر عبدالحق کی شخصیت اور ادبی خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے اور خاص طور پر ان کی اقبال شناسی پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی کے حوالے سے جامعات میں پی ایچ ڈی کی سطح کے کام ہو چکے ہیں اور اقبال شناس کی حیثیت سے ان کی شناخت ادبی دنیا میں مسلم ہے۔

نازیہ رئیس کی اس کتاب میں ان کی زندگی، تالیفات کے علاوہ ایک اہم باب اقبال شناسی کے حوالے سے ہے۔ اقبال کے تعلق سے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں اقبال کے ابتدائی افکار، تنقید اقبال اور دوسرے مضامین، اقبال کے شعری اسالیب، اقبال کی شعری سرگزشت، اقبال کی شعری وفکری جہات، اقبال اور اقبالیات،

اقبال شاعر رنگیں نوا، اقبال کا حرف شیریں اور بکھرے خیالات اہم ہیں۔

نازیہ رئیس نے پروفیسر عبدالحق کی ان تمام کتابوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور اقبال شناسی کے ضمن میں ان کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ یقینی طور پر پروفیسر عبدالحق نے اقبالیات کے ضمن میں جو کام کیا ہے وہ اتنا قابل قدر ہے کہ ان کے معاصرین نے بھی ان کی ستائش کی ہے اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے حوالے سے یہ ایک اچھی کتاب ہے جس میں ان کی شخصیت اور اقبالیات کے علاوہ ان کی دیگر تالیفات کا بھی ذکر ہے۔ پروفیسر عبدالحق کی اہم کتابوں میں انتخاب حاتم، کلام حاتم، خیال یار مہرباں، شمالی ہند کا پہلا اردو دیوان، رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب عصری لغت، دیوان زادہ، تذکرہ الٰہی قابل، مولانا ابوالکلام آزاد افکار و اسالیب، خواجہ طارق محمود وغیرہ اہم ہیں۔

نازیہ نے ان کی بیشتر کتابوں کا تعارف کرایا ہے، خاص طور پر اقبالیات کے ذیل میں ان کی کتابوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اقبال اور اقبالیات کے تعلق سے ڈاکٹر خالد ندیم نے پروفیسر عبدالحق کے حوالے سے بڑی اہم بات لکھی ہے:

''اقبال کے بارے میں مصنف کی دردمندی قابل تحسین ہے اور ان کی وسعت معلومات حیران کن۔ اپنے مطالعے کو منضبط صورت میں پیش کرنے کا ہنر انھیں دیگر اقبال شناسوں کے مقابلے میں منفرد بنا دیتا ہے جو قارئین کو خام معلومات تو فراہم کر دیتے ہیں لیکن ان کے قلب و روح میں افکار اقبال کی حرارت پیدا نہیں کر سکتے۔''

ان کی ایک کتاب 'اقبال شاعر رنگیں نوا' ہے۔ یہ 2009 میں منظر عام پر آئی۔ اس میں کل 15 مضامین شامل ہیں۔ یہ ان کی ایسی کتاب ہے جس کے مقالات کی گونج اندرون و بیرون ملک دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ دراصل ایک مصنف اور ادیب کی خوبی یہ ہے کہ اس کے علم و فضل سے ایک جہاں روشن و منور ہو جائے اس مجموعہ کا پہلا مضمون 'اقبال اور ایشیائی بیداری' کے عنوان سے ہے جو اس مجموعے کی جان ہے۔ یہ ایک ایسا جامع مضمون ہے جو کئی جگہ پڑھے جانے کے علاوہ کئی رسائل میں شائع ہوا ہے۔

مصنفہ اس کے متعلق لکھتی ہیں:

''اس مقالے میں موصوف نے شاعر مشرق کے ان اشعار اور نظموں سے استدلال کیا ہے جن میں براعظم ایشیا، اس کے کسی ایک خطہ یا اس میں بسنے والی کسی قوم یا کسی ممتاز فرد کا تذکرہ ہے۔'' (ص 67)

جب کہ اس مجموعہ کے متعلق خود ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ:

''براعظم کی زبوں حالی نے اقبال کو اپنی طرف سب سے زیادہ متوجہ کیا کیونکہ یہ مسلم کا سب سے عظیم گہوارہ و تمدن بھی ہے۔ یہی سرزمین ان کے دین و دانش کی امین اور جولان گاہ رہی ہے۔ اسلامی آثار و امصار کے لافانی نقوش یہیں موجود ہیں۔ یہاں کے بیشتر ممالک مغرب کی غلامی پر مجبور ہیں۔'' (ص 68)

دراصل ڈاکٹر عبدالحق کی یہی کل متاع ہے جس کی وجہ سے ان کی شناخت، ماہر اقبالیات کے طور پر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی چھوٹی کتابیں (1) محمد اقبال (مونوگراف) اور علامہ اقبال (مونوگراف) کے نام سے ہیں۔

مصنفہ کا انداز تحریر کافی جاذب ہے اور پختہ قلم کار کی طرح انھوں نے اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ زبان و بیان کی خامی بھی بہت کم ہے۔ امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی ایسے موضوع پر اپنا قلم رواں دواں رکھیں۔

## ابلاغیات

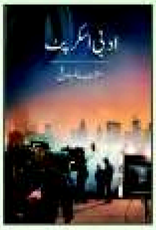

### ادبی اسکرپٹ

مصنف: مشرف عالم ذوقی

صفحات: 656، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2019

پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ساحرہ داؤد نگری، 275/6، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

مشرف عالم ذوقی کا تعلق ادب کے علاوہ الیکٹرنک میڈیا سے بھی رہا ہے۔ انھوں نے سیریل، ڈوکومنٹری فلمیں بنائی بھی ہیں اور منظر نامہ بھی تحریر کیا ہے۔ ذوقی دلّی آنے کے بعد ہی الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک طویل زندگی فلموں اور سیریل کے درمیان بسر کی ہے۔ اردو زبان میں اب بھی الیکٹرانک میڈیا اور اسکرپٹ کے موضوعات پر کتابوں کی کمی ہے۔ اس کمی کو بہت حد تک مشرف عالم ذوقی نے ادبی اسکرپٹ کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماس میڈیا اور اس پر کام کرنے والے طلبا کے لیے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آسان زبان میں اسکرپٹ کو لکھنا سکھایا گیا ہے۔ ماس میڈیا سے تعلق رکھنے والے طالب علم اس کتاب کے ذریعہ روزگار بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ذوقی نے پیش لفظ کے تحت کچھ ضروری امور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ٹیلی وژن اسکرپٹ — اس موضوع پر کتابیں ہندی اور دوسری زبانوں میں تو آسانی سے دستیاب ہیں مگر اردو زبان میں ابھی بھی اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو جاننے والے بچوں میں اس نئی اور خوبصورت دنیا کو جاننے کے لیے دلچسپی بڑھی ہے۔ میں 1988 سے ٹیلی وژن کی دنیا سے وابستہ ہوں اور اس درمیان سیریل، ٹیلی فلمیں، ڈیکو ڈرامہ، ڈاکیومنٹری سے نیوز پروگرام تک میں نے بہت سارے پروگرام ٹی وی چینلس اور منسٹریز کے لیے بنائے — ان میں ادبی نوعیت کے پروگرام یا سیریل بھی شامل ہیں۔ ماس میڈیا یا ماس کامیونی کیشن کی تعلیم حاصل کرنے والے بچے آئے دن مجھ سے ملتے رہتے ہیں — اور اس بات کا تقاضہ بھی کرتے ہیں کہ ٹیلی وژن اسکرپٹ کو لے کر کوئی کتاب اردو میں بسیار تلاش کے باوجود نہیں ملتی۔ اس لیے میں ایسی کوئی کتاب لکھوں جو ان جیسے بچوں کے کام آسکے۔''

وقت کے ساتھ ہماری فلموں اور سیریل کی دنیا میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ذوقی ان باریکیوں کو سمجھتے ہیں۔ ہدایت، موسیقی، کیمرہ پر بھی ان کی گرفت سخت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک اچھا منظر نامہ کیسا ہوتا ہے اور اسے پیش کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ منظر نامہ کو چست درست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی اس قابل ہو کہ سامعین جب کوئی سیریل دیکھ رہے ہوں تو انہیں ریموٹ کی مدد سے دوسرا سیریل دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یہ ریموٹ کی دنیا ہے جہاں دیکھنے والا وہی دیکھتا ہے، جو اسکرپٹ اسے پسند آتی ہے۔ ذوقی نے ادبی اسکرپٹ میں اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ تفریح کی تمام گنجائش باقی رہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر آج کے ٹی وی سیریئل اور فلموں پر نظر ڈالیں تو اسکرپٹ کی باریکیوں اور چیلنج کو سمجھا جا سکتا ہے — فلموں کی بات کریں تو نئی نسل کے زیادہ تر ڈائرکٹر، اسکرپٹ رائٹر بھی ہیں — اس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ ایک اچھا اسکرپٹ رائٹر ایک اچھا ڈائرکٹر بھی بن سکتا ہے — اور آج فلم انڈسٹری میں اچھے رائٹر کی ڈیمانڈ بہت حد تک بڑھ گئی ہے — فلموں کے مقابلے ٹی وی پر چلنے والے سیریل کے لیے اسکرپٹ لکھنا زیادہ آسان کام

ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے نوجوان جو کہانی اور اسکرپٹ رائٹنگ کی دنیا میں آنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب کسی حد تک مددگار ضرور ثابت ہوگی۔۔۔ اس میدان میں دلی سے ممبئی تک روزگار کے دروازے کھلے ہیں۔۔۔''

ادبی اسکرپٹ کو ذوقی نے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ادبی ناول ہے۔ ادبی ناول کے تحت گردش رنگ چمن (قرۃ العین حیدر)، فہیم (فیاض علی)، یادوں کے کھنڈر (نند کشور وکرم)، پروفیسر ایس کی عجیب داستان (مشرف عالم ذوقی) کا انتخاب کیا گیا ہے۔ گردش رنگ چمن قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول ہے۔ ان ناولوں کے چار اپی سوڈ کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔۔۔اور اس سے ناولوں کے ساتھ اسکرپٹ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرا باب آزادی کے مقدمے پر مشتمل ہے۔ اس میں شہید اشفاق اللہ خاں، شہید اودھم سنگھ، شہید راجندر ناتھ لہڑی اور کھدی رام بوس کو شامل کیا گیا۔ یہ تمام منظر نامے انتہائی دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ روانی اس قدر ہے کہ قاری منظر نامہ کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''اشفاق: انقلاب زندہ باد (تین چار بار کہتا ہے۔ پھر ٹھہر کر) میری طرح آپ بھی انقلاب کے نعرے کیوں نہیں لگاتے؟

سلامت: (ڈر کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوا) مجھے آپ کی والدہ محترمہ نے بھیجا ہے۔ انھوں نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہوگا؟

اشفاق: ہاں، بتایا تھا کہ آپ میری جان بخشی کرا سکتے ہیں۔

سلامت: بالکل ٹھیک۔ صرف جان بخشی ہی نہیں، میں پورے واقعہ کو نیا رخ دے سکتا ہوں لیکن اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ سرکاری گواہ بننے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟

اشفاق: مان لیجیے میں سرکاری گواہ بن جاتا ہوں پھر آپ کیا کریں گے؟

سلامت: (اپنے دوسرے دوست کو دیکھ کر/ آنکھوں میں چمک) یہ ہوئی نہ بات۔ پھر ہم رہائی کے سارے راستے کھول دیں گے۔ آپ کے لیے جگہ جگہ مظاہرے ہوں گے۔ کل کا اخبار آپ کی سرخیوں سے بھر جائے گا۔''

تیسرا باب ادیبوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں میں ذکیہ مشہدی، شفیع جاوید اور عبدالصمد کی کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مشق کے لیے ایک باب دیا گیا ہے۔ یعنی پہلے کہانی پڑھیے اور اس کے بعد منظر نامہ لکھنا سیکھیے۔ اس باب میں ذوقی نے اپنی تین کہانیوں حیران مت ہو سنگھ مترا، غلام بخش اور بارش میں ایک لڑکی کو حوالہ بنایا ہے۔ یہ اسکرپٹ بہترین تفریح بھی فراہم کرتی ہے۔ ہر منظر نامہ اتنا دلچسپ ہے کہ آپ خود کو مکمل مطالعہ کیے بغیر روک نہیں سکتے۔ یہ بھی ذوقی کے فن کا کمال ہے۔ مختصر میں، اس کتاب کی ادبی اہمیت تو ہے ہی لیکن یہ کتاب ماس کام اور ماس میڈیا کے طلبا کے لیے کسی دستاویز سے کم نہیں ہے۔ چھ سو چھپن صفحات کی کتاب کی قیمت بھی بہت کم ہے۔ یہ کتاب قومی اردو کونسل کے اشتراک سے شائع کی گئی ہے۔

## شاعری

### احساس نگر (نظمیں)

شاعر: ایم نصر اللہ نصر

صفحات: 160، قیمت 150 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: راکیش کمار بھارتی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو شعر و ادب کے میدان میں ایم نصر اللہ نصر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ 'احساس نگر' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے 'امکان سے آگے'، 'سخن سرائے'، 'ثنائے رب' صنف شاعری میں اپنی انفرادیت قائم کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق وتنقید کے میدان میں 'افہام ادب'، 'انتقاد واستبصار' اور 'بنگال میں اردو نظم نگاری' سے نثر میں بھی اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

زیر نگاہ 'احساس نگر' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ 'شہر موضوعات' کے نام سے ہے اس میں 48 نظمیں ہیں۔ دوسرے حصے کا نام 'شہر شخصیات' ہے اس میں 14 نظمیں اور تیسرا حصہ 'شہر اطفال' کے نام سے ہے جس میں بچوں کے لیے 10 نظمیں شامل ہیں کل ملا کر اس مجموعے میں 72 نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کا انتساب انھوں نے قارئین کے نام کیا ہے۔

اس مجموعہ کے پہلے حصے 'شہر موضوعات' میں شامل نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایم نصر اللہ نصر کوئی معمولی شاعر نہیں ہیں۔ ان کی زبان صاف اور سلیس ہونے کے ساتھ ہی ان کے موضوعات ومضامین میں گہرائی بھی ہے۔ وہ نہ صرف ذات اور زندگی پر بلکہ حالات حاضرہ، فکر روزگار اور عالمی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تمام نظمیں آج کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی انتشار کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کے جذبات واحساسات، تجربات اور مشاہدات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ نظم 'بھیڑیے' کے اس بند سے شاعر کے جذبات واحساسات، تعصب وتناؤ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پھر وہی حادثہ کالی حرکت
پھر وہی لوگ لٹیرے تن کے
پھر تمدن کا چلن ٹوٹ گیا
کچھ درندوں نے تقدس کا گلا گھونٹ دیا
اجلی تہذیب برہنہ بھی ہوئی
اور انسانیت بھی شرمندہ
عصمتیں خاک ہوئیں
جسم پامال ہوا
جان بھی ساتھ گئی

اس نظم میں شاعر کی مایوسی، محرومی، دردمندی اور بے چارگی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن شاعر چپ نہیں بیٹھتا ہے وہ کہتا ہے کہ جب بھی معصوم بے گناہوں، غریبوں کا قتل ہوگا اور بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی جائیں گی تو صدائے احتجاج بلند ہوگی اور قلم بھی چیخ اٹھے گا۔ نظم 'قلم پھر چیخ اٹھے گا' کا یہ بند ظلم وجبر، ناانصافی کے خلاف شدید جذبے کا اظہار ہے۔ بیان کچھ یوں ہے۔

ظلم اس طرح جب جب بڑھیں گے
لہو معصوم کا جب بھی بہے گا
کہ عصمت بیٹیوں کی جب لٹے گی
کہ ناحق خون ہوگا بے خطا کا......
لٹی جائے گی یوں گھر گھر کی دولت
تو پھر خاموش بیٹھا کون ہوگا
بطور احتجاجاً بول دے گا
قلم بھی چیخ اٹھے گا دفاع میں!!

اس حصے میں ایسی بہت سی نظمیں ہیں مثلاً تم ایسا سوچنا چھوڑو، عجیب رشتہ ہے، ملال، آدمی عجیب ہے، واہم، وطن، خدشہ، ماں، ہوا، یہ تماشا ذرا اب بند کرو، ریت ریت زندگی، تکبر ٹوٹ جاتا ہے اور جس کو دیکھو وہ بیمار جس سے شاعر کے مرکز نگاہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دوسرے حصے 'شہر شخصیات' میں شاعر نے اپنے شہر مغربی بنگال کی ان شخصیات پر نظمیں لکھی ہیں جو اہل سخن، اہل قلم اور صاحب ہنر ہیں جن کی یہ ضد ہے کہ ادب کی خدمت ہو اور اردو زبان پھولے پھلے۔ ان نظموں میں ان شاعروں و ادیبوں کی تعریفیں بھی کی ہیں اور ان کے علم و ادب اور فکر و نظر پر فخر بھی کیا ہے۔ مثلاً چراغ علم وفن (حضرت قیصر شمیم کی نذر)، شاعر صد کمال، ذرے سے آفتاب (معید رشیدی کی نذر)، جگنو سے ماہتاب (نذر: ڈاکٹر محمد شمشیر عالم)، علم و ادب کا تاجور (ظ۔ انصاری کی نذر) تیرے بارے میں کوئی سوچ رہا ہو جیسے (نذر: عرفان بناری) اور فہیم اختر (لندن) کی نذر قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان سے ان شاعروں کی علم دوستی، انسان دوستی اور ادب سے حقیقی محبت کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرے اور آخری حصے 'شہر اطفال' میں ان نظموں کو شامل کیا گیا ہے جو بچوں پر لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں پر گفتگو سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب اردو ادب سے وابستہ قلم کار اس موضوع پر قلم اٹھانے کی زحمت گوارہ نہیں کر رہے ہوں تو ایسے میں ادب اطفال پر نظمیں لکھنا قابل تعریف ہے۔ بچوں پر نظمیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ وہی کرسکتا ہے جو بچوں کی نفسیات، ان کی عادات واطوار اور ان کی خواہشات سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔ اس حصے میں شامل نظمیں دلچسپ معلوماتی اور سبق آموز ہیں۔ مثلاً "قدموں کے نیچے ماں کے جنت چھپی ہوئی ہے'، 'تارے'، 'بھکاری'، 'اللہ تیرے کتنے نام'، 'بچوں کی عید' اور 'میرے ابو کتنے اچھے' ایسی نظمیں ہیں جن کے ذریعے وہ بچوں کو قیمتی معلومات فراہم کراتے ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے حقانی القاسمی (نئی دہلی) اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"ان کی نظمیہ شاعری تشدد، تعصب اور تناؤ کے خلاف ایک مؤثر بیانیہ کی حیثیت رکھتی ہے 'احساس نگر' میں کل تین ابواب 'شہر موضوعات' 'شہر شخصیات' اور "شہر اطفال' کی نظموں میں ملال، بھیڑیے، قلم پھر چیخ اٹھے گا، وطن، خدشہ، یہ تماشا ذرا اب بند کرو، خاموش کیوں ہو، محافظ کی جستجو، ریت ریت زندگی، کبھی تو آؤ اور خواب رنگ موسم جیسی نظمیں مزاحمت اور مقاومت کا جلی عنوان ہیں۔ ایک حساس ذہن کے باطنی اور داخلی خلش کا اظہار ہیں۔ ان میں جذبے کی شدت اور اظہار کی حدت ہے۔ منفیت کے خلاف مثبت ذہن کا یہ ایک زبردست تخلیقی ردِ عمل ہے۔"

مختصر یہ کہ یہ کتاب خوبصورت اور حسین نظموں سے آراستہ ہے جس کے ہر لفظ میں انسانیت، امن واتحاد کی وہ روشنی ہے جس کی آج کے سماج کو شدید ضرورت ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ادب دوست حضرات اس کتاب کو خرید کر سخن فہمی اور ادب دوستی کا ثبوت دیں گے۔

## انشائیے

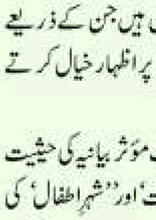

**تلخیاں (انشائیے)**

مصنف/ ناشر: شبر امام، مرتبہ: مریم فاطمہ

مطبع: تاج آفسیٹ پریس، سبزی باغ، دریاپور، پٹنہ- 800004

مبصر: وفا اعظمی، D-1014/B، فورتھ فلور، جیت پور 2، بدر پور

ادب سماجی شعور کا عکاس ہے۔ گہرے شعور اور احساس کی بدولت ہی ایک ادیب کے دل میں انسانیت کا درد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا حساس دل زندگی میں قدم قدم پر غور کرنے اور انسانی محرومی و ناکامی پر تڑپتا ہے۔ مریم فاطمہ کی مرتب کردہ اور شبر امام کے گیارہ مضامین کے مجموعے 'تلخیاں' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ شعر یاد آتا ہے۔

ہر شخص کو حساس بنادے یا رب
یا چھین لے مجھ سے بھی متاع احساس

دراصل ادیب اپنی حساس کیفیت کے سبب زندگی کے مصائب ایک عام آدمی کی بہ نسبت زیادہ گہرائی سے محسوس کرتا ہے اور پھر اپنے فن پاروں میں انہی مسائل کی عکاسی بھرپور طریقے سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبر امام نے 'مسلمانو! ووٹ دو' سے 'انتخابی ٹکٹ کا میلہ' تک تقریباً ہر مضمون میں سماج میں پھیلی ہوئی بیماریوں کو اپنے فنی نشتر سے باہر نکالنے کی بہترین کوشش کی ہے۔

'کرسی کی ہوس'، 'آویزش'، 'ووٹ کے بھکاری'، 'فرمائش'، 'کیتلی'، 'دلیش بچاؤ'، 'انتخابی ٹکٹ کا میلہ'، 'کشمکش'، 'ہندوستانی انقلاب'، 'غدار'، 'شریعت نسواں'، 'آہ'، 'مینڈک کوز کام'، 'ہمدردوں سے خطاب' اور 'ابا حضور' جیسے سماجی مضامین کو اپنا فکری موضوع بنانے والے شبر امام لکھتے ہیں: 'اگر آپ میں احساس نہیں تو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں اور اگر آپ حساس ہیں تو معاشرے کی تلخیوں سے دوچار ہونے میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے، لیکن ہر شخص کے تجربات مختلف ہوتے ہیں، میں نے وہ تلخیاں پیش کی ہیں جن کا تجربہ مجھے ہوا۔ کاش! آپ بھی اپنے معاشرے کی تلخیوں کو پیش کرتے تو ہم تلخ آشاموں کا خود ہی اپنا ایک معاشرہ ہوتا۔'

شبر امام حقیقت پسند ادیب ہیں۔ حالات اور ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے قلمی نشتر کو چلانے کا ہنر جانتے ہیں۔ جو ان کی نگاہ دیکھتی ہے اور جو وہ محسوس کرتے ہیں، اسے مضمون کے پیکر میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ووٹ کے بھکاری" کے تحت شبر امام لکھتے ہیں:

"ہماری بدقسمتی ہے کہ بہت سے ملکوں کے لوگ آسمان کی طرف پرواز کر رہے ہیں...... ہندوستانی آسمان تاک اور زمین چاٹ رہے ہیں۔ جب تک بارش نہیں ہوتی، کاشتکاری نہیں کرسکتے۔ جس سال موسم میں کچھ تبدیلی ہوئی اور بارش نہ ہوسکی تو قحط پڑ گیا...... عوام بھوک اور پیاس سے تڑپنے لگتی ہے۔"

مریم فاطمہ کا مرتب کردہ یہ مجموعہ زندگی کے خدوخال، تجربات کی روشنی اور معاشرہ کی ترجمانی کا عکاس ہے۔ اس مجموعہ میں بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے ماڈرن دانشوروں کے خیالات پر طنز کیا گیا ہے اور سیاسی میدان کے شہسواروں کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔

فن ایک تخلیقی عمل ہے، وہی فن بلندی پر پہنچتا ہے، جس میں الفاظ متوازن ہوں اور مضمون کی موزونیت برقرار رہے اور اس فن کے اسرار و رموز قاری کے سامنے آجائیں۔ شبر امام کے یہاں بھی یہ سبھی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے قاری سحر تحریر سے مسحور ہوجاتا ہے۔ الفاظ کے روابط اور نشیب و فراز کے سبب شبر امام سبھی کو اپنا بنالیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص کیفیت اور مخصوص شگفتگی ہے۔ 'کتابوں کا مقبرہ' کے تحت آنے والی ان کی تحریریں 'آہ! پھر کیوں درد اٹھا، دل کیوں بے چین ہے۔ ہاں اس لیے کہ انسانوں کا مقبرہ دیکھنے میں آیا ہے مگر آج کتابوں کا بھی مقبرہ دیکھ لیا ہے۔' دل کو جھنجھوڑ دینے والی ہیں۔ حقائق کو مزید اجاگر کرنے والے شبر امام اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ دیکھیے جہاں میں ہوں وہ قلب بہار کا مشہور و معروف تاریخی شہر عظیم آباد ہے

جس کے سینے پر ایک عظیم الشان عمارت نوابوں کے مسکن کے قریب کھڑی قوم وملت پر آنسو بہارہی ہے اوراراکین مدرسہ کی نااہلی کا گلہ کررہی ہے۔''

دراصل شبر امام کا حساس دل اس تاریخی عمارت کی بات کر رہا ہے جو شہر عظیم آباد کی شان ہے لیکن سماج کی عدم توجہی نے اسے تباہی کے دہانے پر لادیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ وہ مدرسہ ہے جہاں سے بڑے بڑے علمائے دین اور اہل قلم پیدا ہوئے۔ یہ مدرسہ جہاں فاضل تک کی تعلیم دی جاتی تھی، اب صرف چند بچوں پر مشتمل یہ مکتب خانہ ہوکر رہ گیا ہے۔''

کتاب کا ٹائٹل عمدہ، کمپوزنگ اور کتابت کی غلطیاں شاذ ونادر ہیں۔ قیمت بھی مناسب ہے، امید ہے کہ 'تلخیاں' کے نام سے شائع یہ مجموعہ قارئین کے لیے 'شیریں' اور مفید ثابت ہوگا۔

# رسائل و جرائد

## تخلیقات (کتابی سلسلہ)

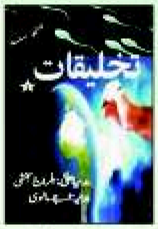

مدیر اعلی: بلراج بخشی مدیر: اے جے مالوی

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: جے بھارتی پرکاشن، موتھی گنج، الہ آباد

مبصر: ساجد حسین ندوی، 28بی 1، سیکنڈ کراس اسٹریٹ منٹ ماڈرن سٹی، اولڈ واشر مین پیٹ، چنئی 600021

اردو رسائل کی دنیا میں کتابی سلسلہ 'تخلیقات' کی آمد کئی لحاظ سے مفید ہے۔ کیونکہ اس میں موضوعاتی، فکری اور بہترین تجزیاتی عناصر والے مضامین کی کثرت ہے جو اس کی انفرادیت ثابت کرتے ہیں۔ 'تخلیقات' کے پہلے شمارے میں 'اردو عظیم بھی ہے اور قدیم بھی: سہیل احمد صدیقی'، 'کہانی، افسانہ اور وژن: پروفیسر قدوس جاوید'، 'کیا مابعد جدیدیت کی موت ہوچکی: احمد سہیل' اور 'ماحولیاتی تنقید: ناصر عباس نیر' یہ چاروں مضامین انتہائی عالمانہ ہیں۔ کیونکہ نہ صرف ان میں تھیوریز پر مدلل بحث کی گئی بلکہ موجودہ ادبی رویوں کو ان سے جوڑ کر دیکھا گیا ہے۔ اول الذکر تینوں مضامین میں نظری مباحث کی کثرت کے باوجود تفہیم کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا، مگر پتا نہیں کیوں ناصر عباس نیر کے اکثر مضامین میں تفہیم اور تطابق کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ رہتا ہے۔ اس مفروضے پر یہ بھی سوال ہوسکتا ہے کہ تھیوریز کی بحث نہ صرف مشکل ہوتی ہے بلکہ اس کا تفہیمی سروکار بھی الگ ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے، مگر اردو میں اکلوتے ناصر عباس نیر نہیں جو تھیوریز پر بحث کرتے ہیں۔ اس قبیل کے دیگر ناقدین کے یہاں تفہیمی سروکار ملتا ہے اور موجودہ ادبی تناظرات سے تطابق بھی۔ گویا ان ناقدین کے یہاں تھیوری، فہم اور ادب کے درمیان معلق نہیں ہوتی، مگر ناصر عباس کی علمیت کے خوف سے ان کی تھیوری 'فہم اور ادب' کے درمیان معلق معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ چاروں مضامین کے علاوہ 'تخلیقات' کے مدیر اعلی بلراج بخشی نے 'اظہار ذات/اداریہ' میں ادبی مفروضات اور تحریکات کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدید نظریات کی بخیہ گری کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔ تحریکات ونظریات کے تجزیوں میں عموماً تاریخی پہلوؤں اور اعداد وشمار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے مگر بلراج بخشی نے تحریکات کے ابعاد ومتعلقات بلکہ ان کے نقصانات کا بہترین محاکمہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اداریے کی معنویت دوچند ہوجاتی ہے۔ صحیح معنوں میں اُن ہی اداریوں کی ادبی حیثیت مستحکم ہوسکتی ہے جن میں سوالات قائم کیے جائیں۔ پتا نہیں کیوں آج اداریوں کو فقط رسائل کے 'مشمولاتی تعارف' کے لیے وقف کردیا گیا ہے جو کہ کم ازکم میری ناقص رائے میں بہتر رویہ نہیں ہے۔ مدیرانہ بصیرتوں کی کامیابی کا انحصار موجودہ ادبی منظرنامے کی آگہی اور ادبی نظریات ورجحانات پر ہونا چاہیے، تاکہ چند ادبی سوالات قائم کیے جاسکیں۔ بلراج بخشی نے یقیناً اپنی ادبی بصیرت اور مدیرانہ لیاقت سے کام لیا ہے اور کتابی سلسلہ 'تخلیقات' کی عظمت بڑھادی ہے۔

ان قابل ذکر مقالات کے علاوہ مدیر اے جے مالوی کا مضمون 'اردو میں گاندھیائی فکریات' بھی انتہائی اہم ہے۔ اس مضمون کا تحقیقی اور تجزیاتی پہلو قابل قدر ہے۔ کیونکہ انھوں نے نہ صرف گاندھیائی فکر کے اختصاص کا ذکر کیا بلکہ اس فکر پر لکھی گئی چند بہترین کتابوں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں ہیں۔ اس مضمون کی قرأت سے گاندھیائی نظریات سے آگاہی ہوتی ہے اور ان نظریات پر مبنی مواد کی جھلکیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رغبت شمیم ملک اور رفیق شاہین کے مضامین وتراجم بھی دل کشی رکھتے ہیں۔ رغبت شمیم ملک تنقید کے علاوہ تراجم پر یکساں توجہ دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوان ناقدوں میں ممتاز نظر آتے ہیں اور ان کی تنقید میں ایک نیا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اس کتابی سلسلے 'تخلیقات' کے افسانوی زمرے میں معاصر فکشن کے کئی اہم نام شامل ہیں۔ 'ٹشو پیپر' کے ساتھ مشرف عالم ذوقی حاضر ہیں تو 'کرتب' کے ساتھ اسلم جمشید پوری۔ جہاں نورالحسنین موجود ہیں، وہیں صادقہ نواب سحر بھی۔ ان افسانوں میں نورالحسنین کا افسانہ '19 مارچ 2350' انتہائی قابل ذکر ہے۔ فنتاسی سے بھرپور اس افسانے میں مستقبل کی برق رفتار ترقی کا بہترین نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی بنت بھی فن کاری کی بہترین مثال ہے۔ اس گوشے کی خاص بات یہ بھی ہے کہ مدیر اے جے مالوی نے مختلف افسانوں کے تراجم شائع کیے ہیں۔ ہمارے ادبی رسائل میں لازمی طور پر تراجم کے لیے صفحات مختص ہونے چاہئیں، تاکہ اردو قارئین دوسری زبانوں کی ادبیات سے کسی حد تک آگاہ ہوسکیں۔ نظمیہ اور غزلیہ گوشے کو بھی فاروق مضطر، چندر بھان خیال، شمس تبریزی، عمر فرحت اور مصداق اعظمی جیسے متعدد خوش فکر شاعروں سے سجانے کی کوشش کی گئی ہے۔

'تخلیقات' کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس میں موضوعاتی اور نظریاتی مضامین کو اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی دیگر زبانوں کی ادبیات خصوصاً افسانوں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی سوالات سے لبریز تھیوریٹکل مضامین پر بھی توجہ مبذول کی گئی ہے۔ بڑے تخلیق کاروں سے نئی تخلیقات کا حصول بھی کوئی آسان کام نہیں، مگر 'تخلیقات' کے مدیروں نے ان سے نئی تخلیقات لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظری مباحث کی کثرت، نئی تخلیقات کی تلاش، تراجم کے اہتمام اور سوالات سے لبریز مضامین نے واقعی اس کتابی سلسلے کو انفراد عطا کیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے شماروں کی ادبی عظمت اس شمارے سے کہیں زیادہ ہوگی اور بیدار مغز قارئین ان کے منتظر رہا کریں گے۔

■

# قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

# خبرنامہ

## قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر کورس کو وزارت برائے اسکل ڈیولپمنٹ سے منظوری

**نئی دہلی:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کا ایک خودمختار ادارہ ہے، جس کا بنیادی مقصد اردو زبان وادب کا فروغ اور اس کے دائرۂ اثر کو وسیع کرنا ہے۔ ساتھ ہی شروع سے اس ادارے کا مطمحِ نظر یہ بھی رہا ہے کہ اردو حلقے کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور جدید ٹکنالوجی اور ذرائع معلومات سے استفادے کی راہیں نکالی جائیں، جس سے نئی نسل کی صلاحیتوں کو بھی وسعت و ہمہ جہتی حاصل ہو اور اس کے لیے معیشت و روزگار کے بھی نئے مواقع پیدا ہوں۔ اسی مقصد سے قومی کونسل جہاں ایک طرف اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسز چلا کر اسکول و کالج کے طلبہ و طالبات کو ان زبانوں کی تعلیم فراہم کر رہی ہے وہیں نسل نو

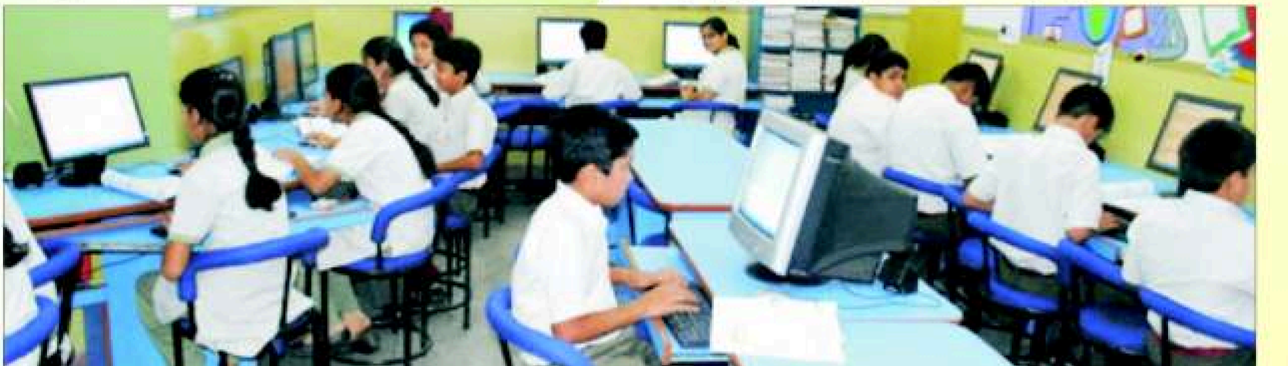

کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے اور اس کے پیشہ ورانہ استعمال کی صلاحیتوں سے لیس کرنے کے لیے 1998 سے ہی ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشنز، بزنس اکاؤنٹنگ اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کا ایک سالہ کورس کروا رہی ہے۔ جس سے اب تک پورے ملک کے لاکھوں طلبہ و طالبات استفادہ کر چکے ہیں اور اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر وہ مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ملازمت کے حصول میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ اس وقت پورے ملک کی 27 ریاستوں میں کونسل کے 536 کمپیوٹر سینٹرز سرگرم خدمات ہیں جہاں سے 20-2019 کے تعلیمی سال کے دوران 31358 طلبہ اور 12544 طالبات نے اس کورس کی تکمیل کی ہے۔ واضح رہے کہ کونسل کا یہ کورس وزارت برائے الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی، حکومت ہند کے خودمختار ادارہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی (نیلیٹ) چنڈی گڑھ کے اشتراک سے چل رہا ہے اور اب اس کورس کو نیشنل اسکل کوالیفکیشنز فریم ورک، وزارت برائے اسکل ڈیولپمنٹ اینڈ انٹرپرینر شپ کی جانب سے منظوری مل گئی ہے، جس سے اس کورس سے مستفید ہونے والے طلبہ و طالبات کے لیے کامیابی اور سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں کے امکانات مزید وسیع ہو گئے ہیں۔ پہلے بھی کونسل کے اس کورس کی تکمیل کے بعد مختلف ریاستوں کے سرکاری اداروں میں ملازمتیں مل جاتی تھیں مگر اب اس کورس کو مکمل کرنے والے طلبہ ملک کی تمام ریاستوں کے سرکاری اداروں میں ملازمت کے اہل ہوں گے۔ کونسل کی اس اہم حصولیابی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا ہے کہ یہ اردو طلبہ و طالبات کے لیے مقام مسرت ہے اور کونسل کے کمپیوٹر کورس کو اسکل ڈیولپمنٹ منسٹری سے منظوری ملنے کے بعد ان کے لیے کامیابی کی راہیں مزید روشن ہوگئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے بھی کونسل کا کمپیوٹر کورس مکمل کرنے کے بعد اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر پرائیویٹ اور متعدد ریاستی حکومتوں کے اداروں میں ملازمتیں مل جاتی تھیں مگر اب اس کورس کی بنیاد پر تمام ریاستوں اور مرکزی حکومت کے اداروں میں بھی ملازمت کا حصول ممکن ہوگا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ قومی کونسل شروع سے ہی اردو دنیا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں ہے اور کونسل کے تحت چلنے والا کمپیوٹر کورس اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ جو اردو داں طبقے کو جدید ٹکنالوجی سے مربوط کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل اردو کے طالب علموں کے روشن مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں اپنے مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے پابندِ عہد ہے اور ہم مسلسل ایسی کوششیں کر رہے ہیں جن سے اردو زبان کی ترقی بھی ہو، ساتھ ہی اردو دنیا کو جدید ٹکنالوجی سے بھی جوڑا جائے اور اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں اور بچیوں کے لیے ترقی و کریئر کی نئی نئی راہیں بھی ہموار کی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل آئندہ بھی ہمعصر تقاضوں اور اردو دنیا کی ٹیکنکل ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں ضروری اقدامات کرتی رہے گی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 جون 2020

## 'آن لائن اردو زبان وادب کی تدریس: مسائل وامکانات' کے موضوع پر قومی ویبینار

**نئی دھلی:** آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے 'آن لائن اردو زبان وادب کی تدریس: مسائل وامکانات' کے موضوع پر ایک قومی سطح کا ویبینار منعقد کیا گیا جس میں ملک بھر کی موقر یونیورسٹیز کے اساتذہ و دانشوران اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی، اردو زبان وادب کی آن لائن تدریس کے مختلف مسائل وامکانات پر گراں قدر مقالات پیش کیے گئے اور ان مقالات کی روشنی میں کئی اہم تجاویز زیر غور آئیں۔ کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقعے پر تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آج عالمی سطح پر آن لائن نظام تعلیم پر زور دیا جارہا ہے اور تمام تعلیمی ادارے بتدریج اس نظام کو اپنا رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں اردو زبان کو بھی نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی تعلیم و تدریس اور ترقی کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے ممکنہ اسباب و وسائل اور امکانات پر غور وخوض کے مقصد سے آج کا یہ سمینار منعقد کیا گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو کی آن لائن تعلیم کے حوالے سے کئی مسائل ہیں جن پر قابو پانا ضروری ہے تبھی یہ سلسلہ کامیاب ہوسکتا ہے، خصوصا پرائمری سطح کی آن لائن تدریس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل اس سلسلے میں منظم منصوبہ بندی کے ساتھ کام کررہی ہے۔ ویبینار کی صدارتی تقریر میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ وبا کی وجہ سے جہاں زندگی کے دوسرے شعبے متاثر ہوئے ہیں وہیں تعلیمی سسٹم بھی آف لائن سے آن لائن کی طرف منتقل ہورہا ہے اور اردو زبان اس حوالے سے پیچھے نہیں ہے، انھوں نے کونسل سمیت ان تمام اداروں اور افراد کو مبارکباد پیش کی جو اردو زبان کی آن لائن تدریس کے علاوہ اس کے فروغ کے لیے آن لائن مذاکرہ، مشاعرہ اور ویبینار وغیرہ منعقد کروا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں حالات سے گھبرانے یا مسائل کی شکایت کرنے کے بجائے دستیاب وسائل کو استعمال کرنے پر توجہ دینی چاہیے، ہم اسی طرح خود کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ خواجہ اکرام نے کہا کہ ہم لوگ ابھی آن لائن نظام تدریس سے اتنے مانوس نہیں ہیں اس لیے تھوڑی پریشانی تو ہوگی مگر معمولی توجہ اور سنجیدگی سے کام لے کر ہم خود کو اس نظام سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی آن لائن تدریس اور مذاکرہ و سمینار وغیرہ کے کامیاب انعقاد کے لیے ایک مکمل ایپ، تیار کیے جانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل یہ کام بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ کونسل کے ڈائریکٹر نے ان کے مشورے کو قابل قدر قرار دیتے ہوئے کہا کہ کونسل کی جانب سے اردو زبان کی آن لائن تدریس کے لیے ایپ بنانے کا کام جاری ہے اور جلد ہی یہ ایپ تیار ہوکر محبین اردو کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

قبل ازاں اس ویبینار میں اہم مقالات پیش کیے گئے جن میں اردو زبان کی آن لائن تدریس کے مختلف مسائل اور امکانات زیر بحث آئے۔ مقالہ نگاروں نے اس پہلو پر زور دیا کہ آن لائن تدریس کو وقتی ضرورت کے طور پر تو قبول کیا جاسکتا ہے مگر اسے مستقل نظام کے طور پر اپنایا نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ آف لائن اور درسگاہ میں دی جانے والی تعلیم کے جو فوائد ہیں وہ آن لائن تدریس سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ اسی طرح مقالہ نگاروں نے اس پہلو کی بھی نشان دہی کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اب بھی ملک کے بڑے حصے میں انٹرنیٹ اور بجلی کی سہولت دستیاب نہیں ہے، وہاں آن لائن تدریس کا تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جبکہ بعض مقالہ نگاروں نے آن لائن تدریس کے مثبت پہلوؤں پر بھی اچھی طرح روشنی ڈالی اور بتایا کہ اردو زبان وادب کی تدریس کو ترقی یافتہ بنانے کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع کرنے میں بھی تکنیکی ذرائع کو بخوبی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس ویبینار میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر شہاب عنایت ملک (یونیورسٹی آف جموں)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)، ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل سی ایم کالج، دربھنگہ)، پروفیسر شہاب ظفر اعظمی (پٹنہ یونیورسٹی)، پروفیسر ندیم احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر مسرت جہاں (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر درخشاں زریں (عالیہ یونیورسٹی کولکاتا)، ڈاکٹر شعیب رضا خان (این آئی او ایس)، نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ویبینار کی نظامت کے فرائض دہلی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر امتیاز احمد نے بخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ ویبینار اختتام پذیر ہوا۔ اس ویبینار میں کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، افضل خان، فیاض احمد، نوشاد منظر اور بڑی تعداد میں دانشوران اور ریسرچ اسکالرز موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 جولائی 2020

## 'وبائی دور میں اردو میڈیا کا کردار اور ذمہ داریاں' کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ

**نئی دھلی:** ایسے وقت میں جبکہ ساری دنیا کووڈ-19 جیسی خطرناک وبا سے دوچار ہے اور لوگوں میں زبردست خوف ودہشت کا ماحول پایا جارہا ہے، ایسے میں میڈیا کی ذمے داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس کا کام محض خبررسانی نہیں رہ جاتا، بلکہ اسے اپنے قارئین کی نفسیاتی تربیت کا سامان بھی کرنا چاہیے۔ اس ماحول میں سنسنی خیز، فرضی اور منفی اثر ڈالنے والی خبروں کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کی جانب سے 'وبائی دور میں اردو میڈیا کا کردار اور ذمے داریاں' کے عنوان سے منعقدہ آن لائن مذاکرے میں افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کورونا کے دور میں کس طرح زندگی گزارنی ہے اور وائرس سے بچنے کے لیے کیا ضروری اقدامات اور حفاظتی تدبیریں ہیں، ان پر خصوصی مضامین فیچرز اور ڈاکٹرز کے مشورے شائع ہونے چاہییں۔ قبل ازاں انھوں نے اس مذاکرے میں شریک ہونے والے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ موجودہ ہنگامی صورتحال میں بھی کونسل تمام احتیاطی تدابیر کو عمل میں لاتے ہوئے اپنی سرگرمیاں انجام دے رہی ہے، یہ پروگرام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ بی بی سی سے وابستہ معروف صحافی مرزا عبدالباقی بیگ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ایسے دور میں جبکہ پورے ملک میں نفسی نفسی کا عالم ہے، سچی خبروں کی اشاعت بہت ضروری ہے۔ روزنامہ انقلاب، ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے اس پورے وبائی دور میں اردو میڈیا کے کردار کو صحت مند، سنبھلا ہوا اور سلجھا ہوا قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ شروع میں گرچہ عوام نے

تھوڑی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا مگر پھر جلد ہی اس پر قابو پالیا گیا اور خصوصاً اردو میڈیا اپنے قارئین کو باخبر اور بیدار کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایشین اسکول آف میڈیا اسٹڈیز، نوئیڈا میں اسکول آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن کی ڈائرکٹر البینہ عباس نے کورونا کے دور میں میڈیا کے طلبہ و طالبات کو درپیش چیلنجز کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ شروع میں انھیں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر اب طلبہ آن لائن امتحان بھی دے رہے ہیں اور ان کی کلاسز بھی کروائی جارہی ہیں۔ اردو میڈیا کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اسے حالات کے حساب سے مزید اپڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ اشوکا یونیورسٹی، ہریانہ سے وابستہ علی خان محمود آباد نے کہا کہ موجودہ ڈیجیٹل دور میں اردو اخبارات کو عوام تک پہنچنے کے نئے فارمز بھی اپنانے چاہئیں، مثلاً روزانہ مخصوص مضامین، اداریے اور خبروں کو آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں یوٹیوب چینل وغیرہ کے ذریعے بھی لوگوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ سینئر صحافی سراج نقوی نے کہا کہ اردو اخبارات کو فرسٹ ہینڈ اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، ساتھ ہی ان کے رپورٹرز کو اپنے قارئین کی نفسیات سے واقف ہونا چاہیے اور اسی کے مطابق رپورٹ تیار کرنی چاہیے۔ اردو میڈیا کو جذباتیت سے گریز کرتے ہوئے سائنٹفک اپروچ اختیار کرنی چاہیے۔ نیوز 18 اردو کے ایڈیٹر تحسین منور نے بھی خبروں کی اشاعت میں معروضیت و غیر جانب داری اختیار کرنے پر زور دیا۔ خصوصاً نیوز 18 اردو کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ اس چینل نے شروع سے ہی ناظرین تک صحیح خبریں پہنچانے اور انھیں بیدار رکھنے کا اہتمام کیا اور کورونا کے تعلق سے صحیح معلومات پہنچانے کے لیے کئی ملکی و بین الاقوامی سطح کے ماہرینِ صحت اور ڈاکٹرز کے پروگرام نشر کیے ہیں، جس سے ناظرین کو اس وبا کی خطرناکی سے بروقت باخبر کرنے میں کامیابی ملی ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں سماجی و مذہبی اداروں اور تنظیموں کے کردار کو بھی اہم قرار دیا۔ اس مذاکرے کی نظامت بھی تحسین منور نے بحسن وخوبی انجام دی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر پر مذاکرے کا اختتام ہوا۔ اس مذاکرے میں مذکورہ شرکاء کے علاوہ قومی کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، فیاض احمد اور افضل خان بھی شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 جون 2020

## تخلیقی ادب پینل کی آن لائن میٹنگ

**نئی دہلی:** ہندوستان میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کا اپنا ادب ہے جس میں عمدہ شاعری اور بہترین کہانیاں لکھی جاتی ہیں، چونکہ اردو زبان اس ملک ہی نہیں، دنیا کی ایک نمایاں زبان ہے اس لیے ہماری خواہش ہے کہ اس زبان میں ہندوستان کی تمام زبانوں بالخصوص علاقائی و قبائلی زبانوں کی عمدہ کہانیوں، افسانوں اور شاعری کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ اردو زبان میں اس تہذیبی و لسانی رنگارنگی کی بخوبی نمائندگی ہو جو ہمارے ملک کی خصوصیت ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے تخلیقی ادب پینل کی آن لائن میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ زندہ زبانیں وہ ہوتی ہیں جو معاصر زبانوں کے ادبی و تخلیقی تغیرات سے نہ صرف آگاہ رہتی ہیں بلکہ انھیں اپناتی بھی ہیں، اسی نقطۂ نظر سے کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ کونسل نہ صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں بلکہ دنیا بھر کی اہم زبانوں کے افسانوں، کہانیوں اور شاعری وغیرہ کا ترجمہ شائع کرے گی۔ اس میٹنگ میں ترجمہ و تخلیق کے مختلف پروجیکٹس کا جائزہ لیا گیا اور اتفاق رائے سے انھیں جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں کونسل کے ڈائرکٹر اور پینل کے معزز ممبران کی جانب سے ہندوستان کی علاقائی و قبائلی زبانوں کی بہترین تخلیقات کے ترجمے پر خاص زور دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ کونسل کی جانب سے ڈوگری، بھوجپوری، کشمیری، بنگالی، کنڑ اور دیگر زبانوں کی نمائندہ کہانیاں، افسانے اور شاعری شائع کی جائے گی۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے تمام ممبران سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں کونسل کو مشورے دیں اور میٹنگ کے علاوہ ذاتی طور پر بھی اپنی تجاویز پیش کریں کہ بچوں اور بڑوں کے لیے کس قسم کی کتابیں شائع کی جانی چاہئیں اور کس زبان کے ادب کا ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر پینل کے ممبران نے آن لائن میٹنگ کے تجربے کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں پینل کے چیئرمین نور الحسنین، شمول احمد، مہر افروز، بلراج بخشی، وحشی سعید، سلمیٰ صنم، شبیر احمد، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، آبگینہ عارف (ٹیکنکل اسسٹنٹ) اور نایاب حسن موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 جون 2020

## صحت و تندرستی اور قوتِ مدافعت کو بڑھانے میں یوگ کا غیر معمولی کردار: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

**نئی دہلی:** بین الاقوامی یومِ یوگ کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد ڈیجیٹل طور پر یوگ سے جڑے۔ قابل ذکر ہے کہ اس سال کووڈ-19 کی وجہ سے وزیر اعظم نریندر مودی نے عالمی یومِ یوگ کو اپنے اپنے گھروں میں اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ منانے کی اپیل کی تھی اور اقوام متحدہ کی جانب سے اس سال 'یوگ صحت کے لیے' اور 'یوگ کنبے کے ساتھ' یومِ یوگ کا تھیم قرار دیا گیا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل نے یوگ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں یوگ کو اپنے معمولات کا حصہ بنانا چاہیے کیونکہ یوگ ایک بہترین ورزش ہے، جو نہ صرف ہمارے نظامِ صحت کو درست رکھتی ہے بلکہ بہت سی بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہماری قوتِ مدافعت کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ یومِ یوگ پر پورے ملک کے عوام کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یوگ ہمارے جسم، ہماری سوچ اور ہماری روح کو پرسکون رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ جسم اور دماغ کو ایک اصول میں پیوست کرکے زندگی کو سکون اور توازن سے ہمکنار کرتا ہے۔ زندگی کی الجھنوں، گھٹن، پریشانیوں اور بےچینیوں کے درمیان آپ کو اطمینان اور سکون کے احساس سے جوڑنے میں یوگ مددگار ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگا ہماری قدیم ہندوستانی روایات کا ایک انمول تحفہ ہے۔ یوگا ذہن و جسم، فکر و عمل میں وحدت پیدا کرتا ہے جو ہماری صحت و سلامتی کے لیے بہت قیمتی ہے۔ یوگا صرف ورزش نہیں ہے، یہ اپنے آپ اور دنیا و فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے احساس کو دریافت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج کے مشکل دور میں گھر پر رہتے ہوئے آپ یوگ کرکے ذہنی و نفسیاتی گھبراہٹ کو دور بھگا سکتے ہیں اور اپنے جسم میں لچک کے ساتھ طاقت اور دماغ میں خود اعتمادی بھر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یوگ اپنی معنویت و افادیت کے اعتبار سے ساری دنیا کو متحد کرتا ہے اور خصوصاً خوفناک وبا کے موجودہ دور میں ہمارے اندر اس سے لڑنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی قوت و حوصلہ عطا کرتا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جون 2020

# اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

## قومی

### اسکولوں میں نیا نصاب جلد

**نئی دھلی:** کورونا وبا کے دوران ہی سرکار نے اسکولی تعلیم میں تبدیلی کا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ 15 سال بعد اسکولی تعلیم میں تبدیلی ہونے جا رہی ہے۔ اب نئے نصاب کے ساتھ این سی ای آر ٹی سے پوری کتابیں تیار کرنے کو کہا گیا ہے۔ واضح رہے کہ فروغ انسانی وسائل کی وزارت نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) کو کتابوں میں تبدیلی کا حکم دیا ہے، ساتھ ہی نئے نصاب تیار کرنے کی بات کہی ہے اور کہا ہے کہ نئے فریم ورک کا مسودہ دسمبر تک تیار ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ نیا نصاب آئندہ برس مارچ تک تیار ہو جائے۔ وزارت نے ایک بیان میں کہا کہ اسکول کی تعلیم کے لیے نیا نصاب تیار کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے، این سی ای آر ٹی سے توقع کی جائے گی کہ وہ نئے نصاب کے مطابق کتابوں میں ضروری تبدیلیاں کرے، اسکول کی تعلیم کے لیے ماہرین سے اس عمل کی شروعات کی جائے گی اور دسمبر 2020 تک عبوری رپورٹ پیش کی جائے گی۔ امکان ہے کہ نیا نصاب مارچ 2021 تک تیار ہو جائے گا۔ وزارت نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) کو ہدایت کی ہے کہ درسی کتب میں تبدیلی کرتے ہوئے، یہ بات ذہن نشیں ہو کہ اس میں حقائق کے علاوہ کوئی اور چیز نہ درج ہو، وزارت نے کہا ہے کہ درسی کتب میں کتابی متن کو نکال کر تخلیقی سوچ، زندگی کی مہارت، بھارتی ثقافت، آرٹ اور دیگر چیزوں جیسی اضافی چیزوں کو ان میں شامل کیا جائے۔ واضح رہے کہ این سی ای آر ٹی میں اب تک چار بار تبدیلیاں کی جا چکی ہیں۔ پہلی بار اس میں 1975، اس کے بعد 1988، 2000 اور 2005 میں تبدیلی کی گئی تھی۔ نئے نصاب کے مطابق کلاس ایک سے کلاس 12 تک کی تمام کتابوں میں تبدیلیاں ہوں گی، اس کے علاوہ وزارت نے این سی ای آر ٹی سے کہا ہے کہ ایسے طلبا کے لیے ضمنی کورس کا مواد تیار کیا جائے جن کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود نہیں ہے، وزارت نے این سی ای آر ٹی سے کہا ہے کہ کووڈ-19 وبا کے دوران اضافی کورس کا مواد تیار کریں، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو انٹرنیٹ تک رسائی نہیں رکھتے ہیں۔ این سی ای آر ٹی کلاس ایک سے پانچ تک کے لیے مطالعہ کا مواد دسمبر 2020 تک اور چھٹی کلاس سے بارہویں کلاس تک مرحلہ وار طریقے سے تیار کرے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 جون 2020

### سہ روزہ کثیر لسانی بین الاقوامی ویبینار

**میرٹھ:** ''کورونا وائرس جیسے خطرناک اور المیاتی ماحول میں آج کا یہ کثیر لسانی ویبینار وقت کی ضرورت ہے، جب ہم کورونا وائرس کے ماحول سے باہر آئیں گے تو کافی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہوں گی۔'' یہ الفاظ تھے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے، جو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے بین الاقوامی ویبینار 'سماجی تغیرات کے اردو زبان و ادب پر اثرات' عنوان سے منعقدہ سہ روزہ کثیر لسانی عالمی ویبینار (اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور فارسی) کے افتتاحی اجلاس کا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے عہد حاضر کے بدلتے حالات و ماحول میں زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات کو تفصیل سے واضح کرتے ہوئے سماج و ماحول کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔

پروگرام میں مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (ڈائریکٹر این سی پی یو ایل منسٹری آف ایچ آر ڈی حکومت ہند) محترم، وی این رائے (سابق شیخ الجامعہ، مہاتما گاندھی بین الاقوامی ہند یونیورسٹی، وردھا) شریک ہوئے، اور مہمانان ذی وقار کے بطور محترم عارف نقوی (صدر، اردو انجمن برلن، جرمنی) اور پروفیسر وائی سنگھ (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) شریک ہوئے، نظامت کے فرائض صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بحسن و خوبی ادا کیے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانان کا استقبال کیا اور پروگرام کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو کے لیے آج کا یہ سہ روزہ کثیر لسانی ویبینار آج کے مسائل سے پُر ماحول میں ایک تاریخی ویبینار ہوگا۔

آج ہندی، اردو، انگریزی، فارسی اور سنسکرت کے بڑے دانشور ہمارے اس بین الاقوامی ویبینار میں شریک ہیں۔ اس سہ روزہ کثیر لسانی ویبینار میں موجودہ سماجی تغیرات کے اردو زبان و ادب پر اثرات پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عہد حاضر میں تغیرات کی شدت نے سماج کی ہر ایک شے کو متاثر کیا ہے۔

مہمان خصوصی شیخ عقیل احمد نے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک ادیب بھی ایک طبقے اور معاشرے کے درمیان رہتا ہے۔ وہ جیسا ماحول دیکھتا ہے اسی کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ صرف جدید ٹیکنالوجی پر ہی پورا فوکس نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات، تعلیم و تہذیب کو بھی برقرار رکھا جائے۔

محترم وی این رائے نے سماجی تغیرات کے سماج پر اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سماج پر پڑنے والا یہ ایک اہم اور مشکل وقت ہے، اور وقت کا سماجی تبدیلیوں پر اثر دیکھنے کو مل رہا ہے۔ پروفیسر یوسف عامر نے اردو زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات پر تفصیلی گفتگو پیش کی اور بتایا کہ ادب فکری طور پر ایک ایسا آئینہ ہے جس سے ادیب کے فکری تخیلات دکھائی دیتے ہیں۔ ادب میں نئے الفاظ کا استعمال ہونے لگا ہے۔ ایسے نازک دور میں ایک ادیب کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔

مہمانان ذی وقار میں محترم عارف نقوی نے ویبنار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج اس ماحول میں اچھی اچھی تخلیقات منظر عام پر آرہی ہیں ہم سماجی تبدیلیوں کو معاشی اور سیاسی تبدیلیوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ پروفیسر وائی سنگھ (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے کہا کہ سماج کی ہر شے پر بدلتے وقت کے اثرات دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسے نازک حالات میں ہمیں وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے نائب شیخ الجامعہ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ آج حالات سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں کام کرنا چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد ہندی کا سیشن کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس ہندی سیشن کی مجلس صدارت میں پروفیسر وائی وملا (نائب شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) اور صدر شعبۂ ہندی پروفیسر نوین چند لوہانی شریک رہے۔ اس سیشن میں پانچ مقالہ نگاروں نے ہندی ریسرچ پیپرس پیش کیے۔ ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک، محترم جے نندن (جمشید پور)، ڈاکٹر روپا سنگھ، محترم شکیل صدیقی (لکھنؤ)، ڈاکٹر ودیا ساگر نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ہندی سیشن کے بعد اردو سیشن کی محفل صدارت میں پروفیسر انور پاشا (دہلی) اور پروفیسر کوثر مظہری (دہلی) نے شرکت کی۔ پروفیسر انور پاشا نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انسانی بقا کو قائم رکھنے کے لیے انسان اپنی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے اور نامناسب حالات میں بھی انسان اپنے کو ڈھال لیتا ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ انسان کی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں یا تغیرات آئے ہیں، وہ ادب میں بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اس سیشن میں ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر نعیم انیس (کلکتہ)، ڈاکٹر فرحت خاتون (میرٹھ) نے مقالے پڑھے۔ اردو سیشن کے بعد شامِ غزل کے پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ہندوستان کے مشہور اور ممتاز فنکار محترم مکیش تیواری (میرٹھ) نے اپنی مترنم آواز میں غزلیں پڑھیں اور سامعین کو گنگنانے اور مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

دوسرے دن کے پہلے اردو سیشن کی صدارت پروفیسر شہاب عنایت ملک (کشمیر) اور پروفیسر فاروق بخشی (حیدرآباد) نے مشترکہ طور پر فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب علیم نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ اس سیشن میں ڈاکٹر فوزیہ بانو (میرٹھ) ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی) ڈاکٹر عقیلہ غوث (مہاراشٹر) ڈاکٹر درخشاں زریں (کلکتہ) ڈاکٹر رضیہ بیگم (میرٹھ) ڈاکٹر ہما مسعود (میرٹھ) نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اردو سیشن کے بعد اردو ریسرچ اسکالر سیشن عمل میں آیا۔ اس سیشن کی صدارت کے فرائض پروفیسر شبنم حمید (الہ آباد) ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی) نے مشترکہ طور پر ادا کیے۔ اس میں تسلیم جہاں، سید ساجد علی، فرح ناز، نوید خان نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اردو ریسرچ اسکالر سیشن کے بعد تیسرا اجلاس محفل افسانہ عمل میں آیا جس میں تین افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے افسانے پیش کیے پہلا افسانہ ارشد منیم نے 'آنسو' دوسرا افسانہ فہیم اختر نے 'کتے کی موت' اور تیسرا افسانہ ڈاکٹر فرقان سنبھلی نے 'صلیب پر لٹکے ہوئے لوگ' پڑھے۔ ڈاکٹر پرویز شہریار (دہلی) اور محترم اشتیاق سعید (ممبئی) نے مشترکہ طور پر صدارت کے فرائض انجام دیے۔

محفل افسانہ کے بعد ایک شاندار کوی سمیلن اور مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کوی سمیلن اور مشاعرے کی صدارت محترم عارف نقوی (صدر اردو انجمن برلن، جرمنی) نے کی اور قومی و بین الاقوامی سطح کے شاعر اور شاعرات نے آن لائن شرکت کی۔ ان شعرا میں محترم جاوید دانش (کناڈا) صدف مرزا (ڈنمارک) عشرت معین سیما (جرمنی) مقصود انور مقصود (قطر) ڈاکٹر ولا جمال (مصر) پروفیسر شہپر رسول (دہلی) پروفیسر فاروق بخشی (حیدرآباد) ڈاکٹر نواز دیوبندی (دیوبند) محترم ذکی طارق (غازی آباد) محترمہ علینا عترت (غازی آباد) فخری میرٹھی (میرٹھ) محترم تشا شرما (میرٹھ) احمد علوی (دہلی) اظہر اقبال (میرٹھ) ڈاکٹر فرحت حسین خوش دل، ایشور چند گمبھیر (میرٹھ) اور فرقان سردھنوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس بین الاقوامی کوی سمیلن اور مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر فرقان سردھنوی نے کی۔

تیسرے دن کے پہلے اردو سیشن میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اردو کے تمام مقالہ نگاروں پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر فریدہ انصاری (قطر)، ڈاکٹر ریاض توحیدی، محترمہ صدف مرزا (ڈنمارک) نے مقالے پڑھے۔ پروگرام کی نظامت محترم آفاق احمد خان نے کی۔ اردو سیشن کے بعد فارسی اور سنسکرت سیشن عمل میں آیا۔ جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر بلرام شکلا (دہلی) اور پروفیسر صالحہ رشید (الہ آباد) نے مشترکہ طور پر ادا کیے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر واچسپتی مشرا (میرٹھ) پروفیسر اخلاق آہن (جے این یو، دہلی) پروفیسر شاہ حسین احمد (آرا) نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد قمر عالم (اے ایم یو علی گڑھ) نے انجام دیے۔ سہ روزہ کثیر لسانی بین الاقوامی ویبنار کے تیسرے دن کا تیسرا اجلاس انگریزی میں عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر انیس الرحمان (دہلی) نے کی۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر ثمینہ خان (اے ایم یو، علی گڑھ) پروفیسر پردیپ ترکھا (ایم ایل ایس یونیورسٹی، ادے پور) پروفیسر حسیب الدین قادری (مانو، حیدرآباد) پروفیسر آئی ڈی تیواری (چھتیس گڑھ) ڈاکٹر مریانلنی اہت (مظفر نگر) نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ جبکہ نظامت کے فرائض محترم آر ایم، تیواری (ڈی اے وی کالج مظفر نگر) نے ادا کیے۔ اس کے بعد محفل افسانہ کی محفل سجائی گئی۔ جس میں کل تین افسانہ نگاروں، محترم عامر نظیر ڈار (دہلی) محترم طاہر انجم صدیقی (مہاراشٹر) اور محترمہ مینا خان (غازی آباد) نے اپنی اپنی کہانیاں پیش کیں۔ محفل افسانہ کی صدارتی محفل میں تین صدور محترم نیاز اختر (جمشید پور) محترم اسرار گاندھی (الہ آباد) اور محترم مشتاق احمد نوری (پٹنہ) نے شرکت کی۔ جبکہ نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔

سہ روزہ کثیر لسانی بین الاقوامی ویبنار کے آخری تیسرے دن پانچواں اجلاس اختتامی اجلاس کے نام سے منعقد کیا گیا۔ اس سیشن میں پروفیسر رانیہ محمد فوزی (مصر) نے مقالہ پڑھا جبکہ سیدہ مریم نے 'اردو نظم' اپنی مترنم آواز میں پڑھی۔ اس سیشن میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر وائی ملا (نائب شیخ الجامعہ، چودھر چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے شرکت کی۔ مہمانان ذی وقار کے بطور پروفیسر خواجہ اکرام الدین (دہلی) اور پروفیسر وائی سنگھ (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھر چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے شرکت کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری اور ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر آصف علی صاحب نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 8 جولائی 2020

دھلی

## ہم عصر عربی ادب: رجحانات و تصورات

**نئی دھلی:** کبھی شعر عربوں کا دیوان مانا جاتا تھا، لیکن موجودہ دور میں اب اس کی جگہ ناول نے لے لی ہے اور عرب ادبا ناول نگاری کی طرف اس طرح توجہ دے رہے ہیں کہ یہ فن اپنے اندر ان کی تاریخ، تہذیب، رسم و رواج کو سموئے ہوئے ہے، جدید ناول نگاروں نے عربوں میں موجود قدیم کہانیوں، افسانوں اور اساطیر کو ترقی بخشی اور ناول کا جامہ پہنا کر عربی ادب میں اضافہ کیا ہے، سماج کے اندر جب انقلاب آتا ہے تو ناول کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے، اسی لیے عرب اسرائیل جنگ کے بعد عربی ناول کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا ہے، ان خیالات کا اظہار متحدہ عرب امارات میں مقیم عراق کے مشہور ناول نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر شاکر نوری نے کیا ہے، وہ 'موجودہ عربی ناول نگاری' کے موضوع پر جے این یو میں منعقد دو روزہ بین الاقوامی ورچوئل کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے جسے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جے این یو نے اکسیلینس اکادمی، بھارت، اور عالمی تحقیقی تنظیم برائے امن لندن کے مشترکہ تعاون سے دلی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر مرحوم ولی اختر ندوی کی یاد میں منعقد کیا تھا۔ پروگرام کے ڈائرکٹر، پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم پروفیسر ولی اختر ندوی ہندوستان میں علم و ادب کے نیر تاباں تھے، بہت قلیل مدت میں مرحوم نے عربی زبان و ادب کی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے ادھورے مشن کو آگے بڑھانے کی یہ بین الاقوامی کانفرنس ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ 'ہم عصر عربی ڈرامہ' کے موضوع پر کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے متحدہ عرب امارات کے مشہور ادیب، تنقید نگار اور تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عبدالفتاح صبری نے کہا کہ عربی ڈرامے کو آگے بڑھانے میں مصر اور لبنان کے ادبا نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ طرابلس یونیورسٹی، لیبیا میں لسانیات کے استاذ، تنقید نگار اور ثقافتی مشیر نے 'ہم عصر عربی تنقید' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید کا فن عربوں میں قدیم زمانہ سے موجود تھا لیکن موجودہ عربی تنقید، مغربی تنقید سے خاصی متاثر ہوئی ہے۔ پروگرام کے اخیر میں دنیا بھر کے ادبا، پروفیسروں اور تخلیق کاروں نے اپنے تاثرات پیش کیے اور کانفرنس کے ڈائرکٹر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے تمام حاضرین و ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جون 2020

## عالمی ادب میں مذاہب کا بیان

**نئی دھلی:** مذہب اور ادب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے پروفیسر انور پاشا (سابق چیئر پرسن، سی آئی ایل، جے این یو) نے کہا کہ مذہب جس طرح گمراہی سے بچاتا ہے، اسی طرح ادب بھی گمراہی سے بچاتا ہے۔ دونوں کا بنیادی مقصد صالح معاشرے کی تشکیل ہے۔ یہ بات انھوں نے فاؤنڈیشن اور دی ونکس فاؤنڈیشن دہلی کے آن لائن بین الاقوامی سمینار 'عالمی ادب میں مذاہب کا بیان' میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ مذہب اور ادب دونوں دراصل ذات کے عرفان اور انسانی اقدار سے جڑے ہوئے ہیں۔ مذہب جہاں انسانوں کی اخلاقی آبیاری کرتا ہے وہیں ادب انسانوں کے طرز زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ اردو ادب میں مذہبی بیان کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ مذہبی معاملات کا ایک سماجی پہلو بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر واحد نظیر (جامعہ) نے کہا کہ ادب کا کوئی موضوع متعین نہیں۔ ادب اسلوبیاتی معاملات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے بہترین اسلوب کے ساتھ ادب میں مذہب کا بیان بھی مستحسن ہے۔ کلیدی مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد جمیل محمد اسرار (ناگپور) نے کہا کہ جس طرح مذہب سے زندگی کا تعلق ہے، اسی طرح مذہب سے ادب بھی متعلق ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ خان (اورنگ آباد)، ڈاکٹر عین رشید (دربھنگہ)، ڈاکٹر شمشاد علی (راجستھان)، ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی (کھگڑیا) اور ڈاکٹر صدیقی صائم الدین (اورنگ آباد) وغیرہ نے بطور صدر یا ناظر اجلاس گفتگو کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض ساجد حسین ندوی (نیو کالج، چنئی) اور ذیشان مصطفیٰ (جے این یو) نے ادا کیے۔ مشہور تخلیق کار پروفیسر غضنفر نے برقی پیغام میں کہا کہ مذہب اور ادب مقصد کے لحاظ سے ایک ہے۔ دونوں کا مقصد انسانوں کو صحیح راستے پر چلانا اور دماغ کو سکون بخشنا ہے۔ اس سمینار میں ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو (ماریشش)، راغب الحق (امریکہ)، کوکب الباری ازہری (مصر) کے علاوہ ایچ سی یو، جے این یو، ڈی یو، جے ایم آئی، مانو، ایم یو، اے ایم یو، ایس وی یو، مظہر الحق یونیورسٹی اے یو، اور رانچی یونیورسٹی کے تقریباً چار درجن اسکالروں نے ادب اور مذہب کے رشتوں پر اپنے مقالات پیش کیے۔ تسخیر فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی مسٹر گلاب ربانی اور دی ونکس فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر جاوید حسن نے کہا کہ مقالات پر نظر ثانی کے بعد جلد ہی کتاب شائع کی جائے گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 جون 2020

## بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار

**نئی دھلی:** ورلڈ اردو ایسوسی ایشن ملکی و عالمی سطح پر اردو زبان و تہذیب کے فروغ کا ایک ادارہ ہے۔ ایسوسی ایشن نے گذشتہ روز ریسرچ اسکالرس سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک و بیرون ملک کے تقریباً 200 ریسرچ اسکالرس نے دل چسپی دکھائی، اس طویل فہرست نے ایسوسی ایشن کو احساس دلایا کہ نئی نسل کس قدر متحرک ہے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن نے 40 ریسرچ اسکالرس کو آن لائن مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔ سمینار کا عنوان 2019 کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نگارشات: تبصرہ تجزیہ طے پایا تھا۔ اس سمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شہاب عنایت ملک، صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی نے شرکت کی، جب کہ صدور کی حیثیت سے پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی، صدر شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ اور ڈاکٹر محمد کاظم، دہلی یونیورسٹی دہلی نے شرکت کی۔ اس سمینار میں تعارفی کلمات پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین چیئرمین ورلڈ اردو ایسوسی ایشن نے پیش کیے۔ بیرون ممالک سے محترمہ تغرید البیومی، ازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر، آذربائیجان سے ابراہیموف، باکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے علاوہ پاکستان اور ایران سے بھی کافی لوگوں نے نمائندگی کی۔ اس سمینار کے کنوینر محمد رکن الدین اور کوکنوینر مہوش نور نے نظامت کی۔ اس سمینار میں انٹرنیشنل یونیورسٹی ایران، تہران یونیورسٹی، ایران، جامعہ مدراس، چنئی، جموں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، ازہر یونیورسٹی، یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور، یونیورسٹی آف لاہور، باکو اسٹیٹ یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی آف لاہور، جے این یو، دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، تریپورہ یونیورسٹی، پنجابی یونیورسٹی، یونیورسٹی آف بردوان، وشوبھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، پٹنہ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹ، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ، بھگونت سنگھ یونیورسٹی، امیر، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی، ونوبھاوے یونیورسٹی، ہزار باغ، عثمانی یونیورسٹی، حیدرآباد، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ، رانچی یونیورسٹی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال کے ریسرچ اسکالرس نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 جون 2020

## شعری افسانہ

**نئی دھلی:** 6 جون کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام

آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالرس کے اشتراک وتعاون سے زوم ایپ کے ذریعے شعری افسانہ کے موضوع پر ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں مقرر کی حیثیت سے جامعہ ازہر کے نائب صدر پروفیسر یوسف عامر (مصر) نے شرکت کی اور شعری افسانہ کے موضوع پر خطاب کیا۔ پروگرام کے آغاز میں صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالس کے صدر پروفیسر حبیب اللہ خان نے تمام شرکا اور مہمان خطیب کا استقبال اور تعارف پیش کیا اور ان کی اردو اور عربی علمی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر عامر یوسف نے اپنے خطاب میں کہا کہ گذشتہ دس سالوں میں عالمی سطح پر بہت طرح کے تغیرات رونما ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں ادب کے اندر بہت سی نئی چیزیں ظاہر ہوئی ہیں، فن افسانہ اور ناول اور دیگر اصناف ادب میں جدید رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔ اکیسویں صدی کی ابتدا میں ادب کی ایک صنف شعری افسانہ کا وجود عمل میں آیا جس میں ادیب اپنے زمانہ اپنے ملک اور دنیا کے مسائل کو رمز اور کنایہ میں بیان کرتا ہے، لیکن یہ افسانہ نثر کے بجائے شعری تفعلہ پر مبنی ہوتا ہے۔ فاضل خطیب نے شعری افسانہ کی ابتدا اس کے خصائص نیز اس کے رائٹرس کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا، انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس صنف ادب میں سوالیہ، تعجب کی علامتوں اور نکتے وغیرہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اس کے الگ الگ مفہوم بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان سب کو مثالوں کے ذریعے سامعین کے سامنے واضح بھی کیا۔ فاضل خطیب نے کہا کہ شعری افسانہ میں پوری انسانیت کے لیے پیغام ہوتا ہے۔ انھوں نے شعری افسانے کے تین نمونے سامعین کے سامنے پیش کیے اور ان کی تشریح بھی بہت ہی اچھے انداز میں کی۔ انھوں نے فرمایا کہ شعری قصہ میں کردار واضح نہیں ہوتے ہیں لیکن رمز کے ذریعے انھیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کے لیکچر کے بعد کچھ شرکا نے سوالات کیے جن کے انھوں نے تسلی بخش جوابات بھی دیے۔ اس سمینار میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کے 80 سے زائد عربی زبان وادب کے اساتذہ اور اسکالرس نے شرکت کی۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر صابر نواز نے تمام شرکا، فاضل خطیب اور پروگرام کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 7 جون 2020

**اتر پردیش**

## پروفیسر محمد زاہد: شخصیت اور فن

**علی گڑھ:** لاک ڈاؤن میں ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنا عصر حاضر میں کسی جہاد سے کم نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد زاہد: شخصیت اور فن کے موضوع پر

منعقد بین الاقوامی سمینار میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے مجلس فخر بحرین کے صدر شکیل احمد صبرحدی نے کیا۔ وہ آج مجلس فخر بحرین اور سرسید وبھیم راؤ امبیڈکر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے اشراک سے منعقدہ سمینار کو خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر محمد زاہد سے میرا گہرا وطنی اور قلبی رشتہ رہا۔ انھوں نے پروفیسر زاہد کے نمایاں علمی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ شکیل احمد صبرحدی نے پروگرام سکریٹری ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی اور پروگرام کنوینر ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ان نامساعد حالات میں پروفیسر محمد زاہد انٹرنیشنل آن لائن سمینار منعقد کرکے ملک وبیرون ملک کے مشاہیر ادب اور ارباب علم وفضل کو ایک مقام پر مجتمع کردیا۔ سمینار کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے ویبینار کے موضوع پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ پروفیسر محمد زاہد نے اردو ادب میں جو مقام حاصل کیا وہ اپنی ذاتی محنت کا ثمرہ تھا۔ کنوینر ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے پروفیسر محمد زاہد کی زندگی اور علمی وادبی کارناموں کا خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر طارق سعید نے ان کے عبدالرحمٰن بجنوری پر تحقیقی کام کو بے حد اہم بتایا۔ پروفیسر سید محمد امین نے اپنی پچاس سالہ گہری دوستی کا تذکرہ کرتے ہوئے مستقبل میں ان کے کارناموں کو باقاعدگی سے منصۂ شہود پر لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حکیم محمد طارق اصلاحی نے اپنے مقالے میں موصوف کی مختلف کارکردگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی تینوں تصانیف کو منفرد نوعیت کا تحقیقی کام بتایا۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر الطاف اعظمی، پروفیسر حسنین اختر، خالد اعظمی، حسن ضیا (ایڈیٹر رسالہ آج کل)، طارق فاروقی، جناب اعجاز مقبول (ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ) نے اپنی گفتگو اور مقالوں میں پروفیسر محمد زاہد کی گوناگوں صلاحیتوں اور کارناموں کا اعتراف کیا۔ طارق صدیقی (صدر اولڈ بوائز ایسوی ایشن، لکھنؤ)، جاوید صدیقی، عاطف حنیف، ڈاکٹر اجمل صبرحدی، ڈاکٹر خورشید صبرحدی (سعودی عرب)، طلحہ فخر عالم (دبئی)، محمد فائز (بحرین) نے بھی پروفیسر محمد زاہد کی زندگی کے اہم امور پر گفتگو کی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ، علی گڑھ، نئی دہلی، اعظم گڑھ، جون پور، پٹیالہ، شملا، کشمیر، ممبئی اور بیرون ممالک سے دبئی، سعودی عربیہ، بحران، قطر اور برطانیہ وغیرہ کے افراد نے شرکت کی اور ان کی شخصیت نیز علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 8 جون 2020

## زین العابدین اور علی گڑھ تحریک

**علی گڑھ:** سید زین العابدین راؤ امبیڈکر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ کی جانب سے 'زین العابدین اور علی گڑھ تحریک' کے عنوان سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی، جب کہ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی سرسید کے اہم رفقا میں سے ایک اہم رفیق سید زین العابدین کی زندگی، ان کی شخصیت اور علی گڑھ تحریک میں ان کے کردار کی تفصیل پیش کی۔ پروفیسر طارق سعید نے زین العابدین کی نمایاں خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے انھیں تحریک سرسید اور دانشگاہ کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے والی بے حد اہم شخصیت تصور کیا۔ ڈاکٹر احمد عرفان علیگ (لکھنؤ) نے دوران مذاکرہ سید زین العابدین کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ جناب طارق صدیقی (لکھنؤ) نے زین العابدین کی سماجی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان کو زمانے کی معروف ہستی قرار دیا جب کہ عاطف حنیف (لکھنؤ) نے علی گڑھ تحریک پر گفتگو کرتے ہوئے مولوی زین العابدین کے ان کارناموں پر خصوصی روشنی ڈالی جن کا تعلق تحریک سرسید سے تھا۔ ان کے علاوہ جناب شمیم صدیقی نے اپنی گفتگو میں سید زین العابدین کی شخصیت کے نمائندہ گوشوں کا احاطہ کیا جب کہ جناب طارق صدیقی (صدر علی گڑھ مسلم یونیوسٹی اولڈ بوائز ایسوی ایشن لکھنؤ) نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے خاندان کی جانب سے لکھنؤ میں ان کی سماجی خدمات کا تذکرہ کیا اور بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ علی گڑھ تحریک اس خانوادے کے ذریعے ایک منظم شکل میں آج بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زین العابدین کی پوتی طیبہ عابدین قدوائی نے جو خود علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہیں سرسید وبھیم راؤ امبیڈکر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی خصوصاً ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی، ڈاکٹر ریحان

اختر قاسمی اور پروفیسر طارق سعید صاحب کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا اور اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ نئی نسل پھر سے علی گڑھ تحریک کو اس دور میں آگے بڑھا رہی ہے۔ زین العابدین کے پوتے نورالعابدین نے بھی اس پروگرام کے انعقاد کے سلسلے میں منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور عاطف حنیف اور جاوید صدیقی کا بھی شکریہ ادا کیا جن کے ذریعے انھیں اس پروگرام میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ زین العابدین کی پرپوتی حنا قدوائی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا جہاں کے اساتذہ نے اس طرح کے پروگرام کا انعقاد کیا۔ آخر میں پروفیسر صغیر افراہم نے اپنے صدارتی خطبے میں مجموعی طور پر سید زین العابدین کی زندگی، شخصیت، مناصب، عدالتی خدمات، سماجی خدمات اور تحریکی کارناموں کا احاطہ کیا۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر فاطمہ زہرا نے تمام مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جون 2020

## سرسید احمد خان، مہاتما گاندھی، بھیم راؤ امبیڈکر

**علی گڑھ:** قومی یکجہتی ہی ہماری مشترکہ تہذیب کی بنیاد ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کیا۔ وہ آج سرسید اور بی آر امبیڈکر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام منعقدہ دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کو خطاب

کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں، مہاتما گاندھی اور امبیڈکر نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے پروگرام کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی اور کنوینر ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سرسید، مہاتما گاندھی اور بھیم راؤ امبیڈکر کی خدمات کو عصر حاضر میں نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ معروف سیاسی رہنما پروفیسر منوج کمار جھا نے سرسید احمد خاں، مہاتما گاندھی اور امبیڈکر کو عصری صورت حال میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان تینوں شخصیات سے بے حد متاثر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ تینوں ہستیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سیمینار میں 15 زبانوں خاص طور پر اردو، ہندی، انگریزی، بنگلہ، ملیالم، تمل، سنسکرت، کشمیری، پنجابی، مراٹھی، فارسی اور عربی میں تحقیقی مقالے پیش کیے گئے جس میں دو سو سے زیادہ اسکالرز نے حصہ لیا اور دانشوران علم و ادب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عارف ایوبی نے قومی یکجہتی کے نظریہ کو ملک کے لیے بے حد اہم اور مفید قرار دیا۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی اور پروفیسر علی خان محمود آباد نے اس بدلتی صورت حال کے پیش نظر تینوں نظریات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ویبینار کے کنوینر ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے گفتگو کی اور تینوں ہستیوں کو آج کے تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور ان کے نظریات کو قبول کرنے کی جانب توجہ دلائی۔ عاطف ہانف نے موضوع سیمینار کو جامع انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی، ڈاکٹر محمد فیصل نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 جولائی 2020

### کرناٹک

## غیر ملکی زبان سیکھنے کے چیلنجز اور مواقع

**گلبرگہ:** علم و تحقیق کے اعتبار سے عربی زبان و ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے، خلافت عباسیہ کا زمانہ سب سے روشن زمانہ تھا لیکن ترجمے کی وجہ سے اس کے بعد بھی اس کی اہمیت باقی رہی، اور پچھلے پندرہ سو سالوں سے زبان مسلسل استعمال میں ہے، اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا، گلوبلائزیشن کے اس دور میں اس زبان کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، اور یہ پیشہ ور کورسز کی صف میں کھڑی ہو گئی ہے، ہندوستان میں تقریباً چالیس کالجز اور یونیورسٹیوں میں یہ داخل نصاب ہے۔ ان خیالات کا اظہار ہندوستان میں عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن لندن کے برانچ آفس کے سربراہ اور شعبۂ عربی، جے این یو کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کیا، وہ 'موجودہ تناظر میں غیر ملکی زبان سیکھنے کے چیلنجز اور مواقع' کے موضوع پر شعبۂ مطالعات برائے غیر ملکی زبان، کرناٹک مرکزی یونیورسٹی، گلبرگہ، کی طرف سے منعقد دو روزہ قومی ورچوئل سیمینار سے خطاب کر رہے تھے جس کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایچ ایم مہویش واریا نے کی۔ سیمینار کے پہلے دن اسپینی اور جرمن زبانوں کے تعلق سے مقالات پڑھے گئے جب کہ دوسرے دن عربی اور جاپانی زبانوں پر مقالات پڑھے گئے۔ عربی پروگرام کا افتتاح شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر اور سیمینار کے کوآرڈی نیٹر انعام الآزاد نے کیا، انھوں نے تمام حاضرین و ناظرین کا استقبال کیا، پھر مہمان مقرر کا مختصر تعارف پیش کیا اور عربی زبان کا پہلا سیمینار منعقد کرنے پر یونیورسٹی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ واضح ہو کہ کرناٹک مرکزی یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم حال ہی میں شروع ہوئی ہے، یہاں ڈپلومہ، سرٹیفکیٹ ڈپلومہ اور ایڈوانس ڈپلومہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ جلد ہی بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی بھی کرائی جائے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جون 2020

### مغربی بنگال

## پروفیسر اعزاز افضل کی ادبی خدمات

**کلکتہ:** ممتاز اردو شاعر و ادیب اور مغربی بنگال کی اردو تہذیب کی نمایاں پہچان اعزاز افضل کی ادبی خدمات پر یہاں اولین قومی ویبینار کا اہتمام کیا گیا۔ کلکتہ گرلس کالج کے شعبۂ اردو کے زیراہتمام اس ویبینار میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندوں نے اظہار خیال کیا اور مقالے پیش کیے۔ شرکا میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم، ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر زین رامش، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر اسلم جمشید پوری، کلکتہ گرلس کالج کی گیسٹ لکچرر شیریں ظفر، مرحوم افضل صاحب کے بیٹے تنویر افضل، کلکتہ یونیورسٹی کے نشاط عالم، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے شاہد اقبال، ٹی وی رائٹر زماں حبیب، مدرس اصغر شمیم، شاعر و صحافی عبدالسلام عاصم اور دوسرے شامل تھے۔ صدارت کے فرائض ایل این متھلا یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر رئیس انور نے انجام دیے اور نقابت ڈاکٹر نعیم انیس نے کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 جون 2020

## بیدل مرشدآبادی: حیات وخدمات

**کولکاتہ:** کلکتہ گرلس کالج کی جانب سے 'بیدل مرشدآبادی: حیات و خدمات' پر ایک کامیاب ریاستی ویبینار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت معروف محقق و ڈراما نگار اصغر انجم (انچارج، ڈی ڈی او، کڑایہ گورنمنٹ اسکول) نے کی جب کہ نظامت کا فریضہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر نعیم انیس نے ادا کیا۔ اس ویبینار میں ڈاکٹر دقیق الارشاد القادری (گیسٹ لکچرر، شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج) اطہر آفاق مرزا (اسسٹنٹ ٹیچر، فیض احمد فیض اردو ہائی اسکول، تیلنی پاڑہ)، دائم محمد انصاری (گیسٹ لکچرر، شعبۂ اردو، کلکتہ

گرلس کالج)، سید آصف عباس میرزا (اسسٹنٹ ٹیچر، رسا کھوا ہائی اسکول، شمالی دیناجپور) سیدہ جینیفر رضوی (گیسٹ لکچرر، ایس بی سی کالج، لال باغ، مرشد آباد) اور عرشیہ اقبال (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے مقالات پڑھے۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر نعیم انیس نے بیدل مرشد آبادی کی حیات اور ان کی شعری خدمات پر تعارفی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بیدل مرشد آبادی کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی خدمات کا خلوص دل سے اعتراف کیا جائے۔ واضح ہو کہ بیدل مرشد آبادی کلکتہ گرلس کالج میں شعبۂ اردو کے بانی معلم تھے۔ 1972 میں انھیں کی کوششوں سے کالج میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کالج کی جانب سے بی اے جنرل کورس میں فائنل ائیر کے طلبا کو اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے پر 'بیدل مرشد آبادی ایوارڈ' سے نوازا جاتا ہے۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ستیہ اپادھیائے نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ آج مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ شعبۂ اردو اپنے اس محسن کو یاد کر رہا ہے جس نے اس کالج میں اردو کو آباد کیا تھا۔ اس ویبینار کے ذریعہ یقیناً بیدل مرشد آبادی کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ عرشیہ اقبال نے اپنے مقالے 'بیدل مرشد آبادی کی ادبی خدمات' میں بیدل کے سوانحی کوائف پیش کرنے کے ساتھ ان کی ادبی خدمات کا خوبصورتی سے احاطہ کیا۔ اطہر مرزا نے 'بیدل ایک غزل گو شاعر' کے عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ ادب کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نکھارنے اور ان میں تازگی پیدا کرنے کا جو کام بیدل نے کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔ سیدہ جینیفر رضوی نے اپنے مقالہ 'دبستان مرشد آباد کا اہم شاعر بیدل مرشد آبادی' میں کہا کہ آزادی کے بعد مرشد آباد کے ادبی منظر نامے پر جو نام تیزی کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں بیدل مرشد آبادی کا نام بہت اہم ہے۔ آصف مرزا نے اپنے مقالے 'بیدل مرشد آبادی کی نظموں میں مرشد آباد کا عکس' میں کہا کہ بیدل مرشد آبادی ان چنندہ شعرا میں سے ایک ہیں جن کی نظموں میں مرشد آباد کی تاریخ وتہذیب سانس لیتی ہے۔ ڈاکٹر وسیق الارشاد القادری نے 'بیدل مرشد آبادی کی غزل گوئی' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ دائم محمد انصاری نے 'بیدل مرشد آبادی کی نظموں میں جمالیات کی کارفرمائی' کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ لفظوں کا دھیما پن، موسیقی کا ہلکا ہلکا ترنم اور غنائیت بیدل کی نظموں کا خصوصی وصف ہے۔ صدارتی خطبہ میں اصغر انیس نے تمام مقالہ نگاروں کو ان کے کامیاب مقالے کے لیے مبارک باددی اور بیدل کی شاعری پر جامع گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بیدل نے مرشد آباد کے دو ادوار دیکھے ہیں، ایک قبل آزادی اور دوسرا اس کے بعد کا دور۔ وہ بلا شبہ اپنے عہد کے سفیر تھے۔ شکریہ کی رسم شعبۂ اردو کی گیسٹ لکچرر ممتاز آرا نے ادا کی۔

پریس ریلیز: انیس نعیم، مغربی بنگال، 29 جنوری 2020

**رسم اجرا**

## مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی: زندگی کے تابندہ نقوش

**دیوبند:** مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (مفتی اعظم دارالعلوم وقف دیوبند) کی حیات اور خدمات پر ایک کتاب بعنوان 'مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: زندگی کے تابندہ نقوش' منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب میں مفتی صاحب کی علمی، دینی اور فقہی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔ 554 صفحات کی یہ کتاب ملک اور بیرون ملک کے اکابر علمائے کرام اور نامور شخصیات کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں مفتی صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دارالسلام اسلامی مرکز مالیر کوٹلہ کی شائع کردہ اس کتاب کے آن لائن ایڈیشن کا اجرا، دہلی میں ایک سادہ تقریب میں کیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ کتاب میں مفتی صاحب کی وہ آخری تحریر بھی شامل ہے جو آپ نے پنجاب میں نصف صدی پر محیط اپنے قیام کے حوالے سے اہلیان پنجاب کے لیے مرض الوفات میں پیغام کی شکل میں لکھوائی تھی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 28 جون 2020

## نوائے اسد

**مراد آباد:** خواجہ غریب نواز ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام سوسائٹی کے رجسٹرڈ آفس واقع فاروقی ہاؤس بروالان مراد آباد میں جناب مشکور احمد فاروقی اسد مراد آبادی مرحوم کے مجموعۂ کلام 'نوائے اسد' کا اجرا بدست مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد رضا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت نیشنل سوشل آرگنائزیشن کے صدر مرزا ارشد بیگ نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض ناصر منصوری نے ادا کیے۔ لاک ڈاؤن کے مدنظر صرف پانچ افراد کو ہی اس مختصر پروگرام میں مدعو کیا گیا تھا جنھوں نے اسد مراد آبادی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی جملہ ادبی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 جون 2020

**وفیات**

## اکرام باگ

**گلبرگہ:** برصغیر کے جدید لب ولہجے کے ممتاز افسانہ نگار پروفیسر اکرام باگ کا 2 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے

اردو دنیا کو رنجیدہ کردیا ہے۔ اکرام باگ اپنی ذہانت، مطالعہ اور عصری علوم وفنون لطیفہ پر دسترس کے باعث بہترین افسانے لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے افسانے نہ صرف قاری کی پسند بن گئے تھے بلکہ تنقید نگاروں کی میزان پر بھی کھرے اترتے تھے۔ اکرام باگ کا تعلق گلبرگہ کی بستی بسوا کلیان سے تھا۔ انھوں نے اس بستی کو نہ صرف اردو دنیا سے متعارف کروایا بلکہ ان کی حیات ہی میں اس علاقے کو اکرام باگ کے شہر سے جانا جانے لگا تھا۔ ان کے انتقال کو افسانوی ادب کے ایک روشن باب کا خاتمہ قرار دیا جارہا ہے۔ وہ جدید فکشن میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے اور اس حوالے سے کرناٹک کی افسانوی دنیا میں ان کی ایک شناخت تھی۔ اردو افسانے کی عہد ساز شخصیت کی وفات

اردو دنیا کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کے علامتی افسانے زبان وادب کا سرمایہ ہیں۔ اکرام باگ کو حمید سہروردی، م ناگ، علی امام نقوی اور اس دور کے دیگر افسانہ نگاروں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جدیدیت اور علامتوں کے سائے تلے اپنی ادبی حیثیت کو منوایا ہے۔ وہ استعارہ، علامت اور تشبیہات کے عمدہ استعمال سے واقف تو تھے ہی اپنے خوبصورت بیانیے کی بدولت بھی لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 3 جولائی 2020

## فراغ روہوی

**کلکتہ:** کلکتہ کے معروف اردو شاعر فراغ روہوی کا 13 جولائی کو صبح 9 بجے انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی سالوں سے بیمار تھے۔ خاندان کے ذرائع کے مطابق فراغ روہوی (محمد علی صدیقی) کے خاندان کا تعلق بہار کے ضلع بالندہ کے 'روہ' گاؤں سے تھا مگر انھوں نے کلکتہ میں ہی بود و باش اختیار کرلی تھی اور ٹرانسپورٹ کے پیشے

سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان کی عمر 64 برس تھی۔ ان کا اصلی نام محمد علی صدیقی تھا تاہم وہ اپنے نام سے زیادہ 'فراغ روہوی' سے زیادہ مشہور تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی جدید اصناف ماہیہ نگاری اور ہائیکو پر طبع آزمائی کرنے کے ساتھ اردو شاعری کے ہر صنف پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ 1999 میں ان کے ماہیوں کا پہلا مجموعہ 'چھیاں چھیاں' شائع ہوا۔ اس کے علاوہ شاعری پر کئی کتابیں غزلوں کا مجموعہ 'ذرا انتظار کر' اور 'درخواب دستک' رباعیوں کا مجموعہ 'جنون خواب' نعتیہ مجموعہ 'میرا آئینہ مدینہ' شائع ہوچکی ہیں۔ فراغ روہوی نے بچوں کے لیے بھی شاعری کی ہے اور دو مجموعے 'جب ہم بھی بڑے ہوجائیں گے' اور 'ہم بچے ہیں پڑھنے والے' شائع ہوچکے ہیں۔ مرحوم شاعر کے پسماندگان میں چار بیٹیاں، اہلیہ اور دو بھائی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 14 جولائی 2020

## کبیر اجمل

**وارانسی:** بنارس کے مشہور شاعر کبیر اجمل 29 جون کو بنارس کے ٹاٹا اسپتال میں 53 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی وفات کی خبر نے ادبی فضا کو سوگوار کر دیا۔ کبیر اجمل منفرد لب ولہجے کے

شاعر تھے اور انھوں نے اردو غزل میں نئی راہ نکالی۔ روایت پسندی کے ساتھ جدت و ندرت ان کی شاعری کی خاص پہچان تھی۔ 'منتشر لمحوں کا نوراں' کا شعری مجموعہ ہے جس میں ان کے شاعرانہ کمالات کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مرحوم اپنی ذاتی زندگی میں نہایت سنجیدہ، ملنسار، خوش اخلاق، خوش مزاج و مہمان نواز شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ہی ایک ہنر مند ڈیزائنر اور کامیاب تاجر تھے۔ بنارس میں ادبی ماحول کو فروغ دینے میں بھی ان کا اہم رول تھا۔ ان کی وفات پر سرکردہ ادبی شخصیات نے رنج وغم کا اظہار کیا۔

## خورشید ہاشمی

**پٹنہ:** ممتاز صحافی اور روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ کے اگزیکیٹو ایڈیٹر 13 اور 14 جولائی کی درمیانی شب وفات پاگئے۔ خورشید ہاشمی کا آبائی وطن گیا تھا، وہیں ان کی پیدائش یکم مارچ 1958 کو ہوئی تھی۔ ان کی بنیادی تعلیم مقامی مکتب اور مدرسہ سے ہوئی تھی لیکن بعد میں کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریاں انھوں نے حاصل کیں۔ اردو ادب

میں تحقیق کے لیے انھیں خدا بخش فیلوشپ ملی تھی۔ خورشید ہاشمی صاحب نے تحقیق کی دنیا سے باہر نکل کر 1985 میں سرگرم اردو صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ ایک عرصے تک وہ روزنامہ 'قومی تنظیم' سے وابستہ رہے۔ اس دوران ملک و بیرون ملک کے مختلف اخبارات ورسائل کے لیے بھی لکھتے رہے۔ دوردرشن اور پٹنہ ریڈیو سے بھی ان کی وابستگی دو دہائیوں پر محیط ہے پھر جب روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ سے نکلنا شروع ہوا تو اس سے وابستہ ہوگئے مگر چند ہی برسوں کے بعد ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ جا کر رہے بھی مگر وہ جگہ انھیں شاید راس نہیں آئی۔ لہٰذا وہ پھر پٹنہ لوٹ کر آگئے اور روزنامہ 'تاثیر' کے اگزیکیٹو ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا قلمی تعاون تاحیات دیتے رہے۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 15 جولائی 2020

## ابن حسن خورشید

**رامپور:** معروف ادیب ومحقق ابن حسن خورشید 11 جولائی کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم تقریباً پانچ دہائیوں سے اردو ادب کی آبیاری میں مصروف تھے۔ کچھ وقت سے وہ گردہ کی بیماری میں مبتلا تھے جو زندگی کے خاتمہ کا سبب بن گئی۔ مرحوم ابن حسن خورشید کی ولادت مورخہ 2 نومبر 1945 کو ریاست رامپور کے محلہ اعلیٰ عصمت خاں میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی خورشید حسن بخش ہے۔ حسن خورشید کے ادبی نام سے معروف اس شخصیت کا اصل نام ابن حسن تھا جو بیک وقت افسانہ نگار بھی تھے اور مضمون نویس بھی۔ آپ کی تالیف تذکرہ ہنرمندان رامپور نے آپ کی شخصیت کو ایک نمایاں پہچان عطا کی۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو لڑکے اور تین لڑکیاں شامل ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 12 جولائی 2020

## حکیم عبدالحنان

**نئی دہلی:** یونانی طب میں عظیم خدمات انجام دینے والے حکیم عبدالحنان کا دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں دوران علاج 2 جولائی 2020 کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹے اور

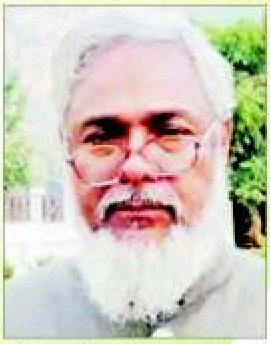

ایک بیٹی ہیں۔ اس خبر سے طبی دنیا سوگوار ہے۔ واضح رہے کہ مرحوم ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن اوکھلا میں عرصے تک انچارج تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی، بڑی تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا۔ انھوں نے جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس سے فراغت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس کیا اور اس کے بعد 1979 میں زبیریہ طبیہ کالج جودھ پور کے بانی پرنسپل کے طور پر سروس کا آغاز کیا اور پھر سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، حکومت ہند، نئی دہلی سے وابستہ ہوئے۔ جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے تقریباً 7 سال پہلے سبکدوش ہوئے۔ آل انڈیا طبی کانگریس انھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں 21 فروری 2014 میں عالمی یوم یونانی میڈیسن کے موقع پر ایوارڈ سے سرفراز کرچکی ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس نے ان کی وفات کو طبی دنیا کا بڑا خسارہ قرار دیا ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس

کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں اور مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جولائی 2020

## وریندر کمار برنوال

**نئی دهلی:** ممتاز تاریخ داں، مترجم اور انڈین ریونیو سروس کے ریٹائرڈ افسر وریندر کمار برنوال کا 13 جون کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 78 سال کے تھے اور کورونا سے بھی متاثر تھے۔ ان کے اہل خانہ میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کی اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ 21 اگست 1941 کو اتر پردیش کے اعظم گڑھ ضلع کے پھول پور میں پیدا ہوئے، مسٹر برنوال کو پچھلے دنوں ایک نجی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا اور ان کے ٹیسٹ میں کورونا انفیکشن پایا گیا تھا۔ انھوں نے کاشی ہندو یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور انکم ٹیکس کے چیف کمشنر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ انھوں نے ہندی زبان میں محمد علی جناح، سر سید احمد خان اور مہاتما گاندھی پر کتابیں لکھیں اور نوبل انعام یافتہ افریقی شاعر وول شیانکا کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اکبر الہ آبادی کی گاندھی نامہ کا ترجمہ کیا۔ ان کی کتاب 'ہند سوراج آدھونک سبھیتا ویمرش' کے نام سے بہت سرخیوں میں رہی۔ انھوں نے جناح پر ہندی میں لکھی گئی اپنی کتاب سے بہت شہرت پائی تھی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 جون 2020

## ماہر حسین

**نئی دهلی:** اردو اکادمی، دہلی کے کارکن ماہر حسین کا 23 جون کو ان کے آبائی وطن سرسی، ضلع مراد آباد میں 45 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم گذشتہ تقریباً چھ ماہ سے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کا علاج دہلی کے بی ایل کپور اسپتال میں چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کے جواب دینے پر ان کے لواحقین انھیں 22 جون کو سرسی لے کر گئے تھے جہاں وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم اکادمی میں اپنی ذمے داریوں کے تئیں کافی سرگرم اور فعال تھے۔ وہ اپنے مفوضہ کاموں کے علاوہ اکادمی کی دیگر سرگرمیوں میں بھی خندہ پیشانی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اپنے حسن اخلاق سے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چھ بیٹیاں ہیں جن میں سے تین کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ ان کے انتقال پر اردو اکادمی کے موجودہ وائس چیئرمین ڈاکٹر شہپر رسول اور سابق وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع وغیرہ نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جون 2020

## نثار احمد عاصی

**مونگیر:** مونگیر کے بزرگ صحافی جناب نثار احمد عاصی 27 جون کو انتقال کر گئے۔ موصوف طویل عرصے سے بستر مرگ پر تھے۔ نثار صاحب کی اہلیہ کا 2008 میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ پسماندگان میں دو فرزندوں کے علاوہ 6 بیٹیاں ہیں۔ 93 سالہ نثار احمد عاصی کو 'لاوارث لاشوں کے وارث' کے طور پر بھی جانا جاتا تھا۔ لاوارث لاشوں کی تدفین کے فریضے کو موصوف 'عبادت' ہی نہیں سمجھتے، بلکہ اس ذمے داری کی ادائیگی کے لیے وہ ہمہ وقت تیار بھی رہتے۔ مونگیر میں عوامی سطح میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ انھیں بہار کی سیاست سے سروکار رکھنے والے خواص بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی رحلت کی خبر سوشل میڈیا پر آئی تو تعزیت کرنے والی قابل قدر ہستیوں میں بہار قانون ساز کونسل کے سابق صدر نشیں پروفیسر جابر حسین، پروفیسر اقبال حسن آزاد اور پروفیسر اسعد الحق وحیدی کے علاوہ کالم نویس شکل رشید، سید احمد قادری، اشرف استھانوی، عطا عابدی، خورشید ہاشمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہ حیثیت صحافی انھوں نے ابتدائی دنوں میں بہار کے معروف روزنامہ 'سنگم' کے لیے نامہ نگاری کا باضابطہ فریضہ نبھایا۔ بعد میں انھوں نے ملت اسلامیہ کے معاملات و مسائل سے سروکار رکھنے والی خبروں تک خود کو محدود کر رکھا تھا اور اس نوعیت کی خبریں وہ اسی ملی جذبے کے تحت اردو کے تمام اخبارات کو ارسال کرتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 جون 2020

## جگدیپ (سید اشتیاق احمد جعفری)

**ممبئی:** معروف فلم اداکار جگدیپ (سید اشتیاق احمد جعفری) 9 جولائی کو 81 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

انھوں نے پچاس کے عشرے میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر اپنا فلمی کیریئر شروع کیا تھا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جگدیپ کے پسماندگان میں اہلیہ، تین بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں جبکہ دو بیٹے جاوید جعفری اور نوید جعفری بھی فلموں میں سرگرم ہیں۔ 1951 میں بی آر چوپڑہ کی فلم افسانہ سے بطور چائلڈ اداکار شروعات کی اور اس کے بعد 'اب دلی دور نہیں'، 'منا'، 'دو بیگھہ زمین' اور 'آر پار' میں بھی نظر آئے۔ فلم 'دو بیگھہ زمین' میں بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کے طور پر اہم رول کیا تھا۔ بعد میں جگدیپ نے ہندی فلموں میں ہیرو کے رول بھی کیے جن میں بھابھی، برکھا اور بندیا جیسی فلمیں شامل ہیں۔ 1968 میں فلم برہمچاری سے انھوں نے مزاحیہ اداکار کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ شمی کپور فلم میں ہیرو تھے۔ 1975 میں ریلیز ہونے والی رمیش سپی کی 70 ایم ایم فلم 'شعلے' میں سورما بھوپالی کے کردار نے انھیں مزید شہرت دلائی تھی اور ان کا بھوپالی انداز کا کردار لوگ اب تک بھلا نہیں پائے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 جولائی 2020

## سروج خان

**ممبئی:** بالی ووڈ کی مشہور رقاصہ اور اپنے فن میں ماہر کوریوگرافر سروج خان کا 3 جولائی کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ سروج کی موت کا سبب حرکت قلب بند ہونا بتایا جا رہا ہے۔ انھیں سانس لینے میں دشواری کی شکایت کے بعد 20 جون کو باندرا کے گرونانک اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ اطلاع کے مطابق اسی دوران اسپتال میں داخل ہونے کے بعد سروج خان کی کووڈ 19 کی بھی جانچ کی گئی جس میں انفیکشن کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ سروج خان 22 نومبر 1948 کو ممبئی میں پیدا ہوئی۔ وہ 72 سال کی تھیں۔ ان کا اصلی نام نرملا ناگپال تھا۔ انھوں نے 200 سے زیادہ فلموں کے لیے کوریوگرافی کی۔ سروج پہلے اسسٹنٹ کوریوگرافر تھیں، لیکن وہ 1974 میں بننے والی فلم گیتا میرا نام سے کوریوگرافر بن گئیں۔ سروج خان نے 1986 سے لے کر 2019 تک سیکڑوں بالی ووڈ فلموں میں گانوں کی کوریوگرافی کی۔ سروج خان 'چولی کے پیچھے کیا ہے' جیسے بہت سے سپر ہٹ اور مشہور گانوں پر رقص کی وجہ سے ہٹ ہوگئی تھیں۔ سروج خان نے بہت سی ہٹ فلموں کے گانوں کی کوریوگرافی کی جن میں تیزاب، کھلنایک، مسٹر انڈیا، چالباز، نگینہ، چاندنی، ہم دل دے چکے صنم، دیوداس شامل ہیں۔ سروج خان کو 2002 میں فلم 'گرو' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ، اسی سال فلم 'دیوداس' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ اور فلم 'لگان' کے لیے نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا، اس کے علاوہ 2007 میں فلم 'جب وی میٹ' کے لیے بہترین کوریوگرافر کا قومی فلم ایوارڈ بھی انھیں دیا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جولائی 2020

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

### قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون
اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 20
قیمت: 20 روپے

### لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

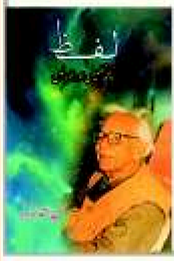

مصنف: آل احمد سرور
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 95
قیمت: 70 روپے

### صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن
ساتویں طباعت: 2019
صفحات: 253
قیمت: 90 روپے

### کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

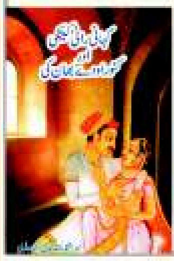

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشاؔ دہلوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 30
قیمت: 35 روپے

### مثنوی مولانا روم (جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

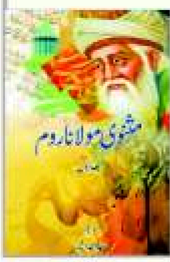


مترجم: سید احمد ایثار
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 223 (جلد اول)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)
قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

### مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

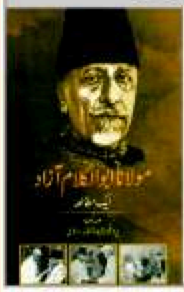


مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
دوسری طباعت: 2019
صفحات: 474
قیمت: 215 روپے

### کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

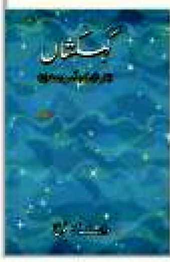


مصنف: وارث علوی
پہلی اشاعت: 2019
صفحات: 527
قیمت: 240 روپے

### عام لسانیات

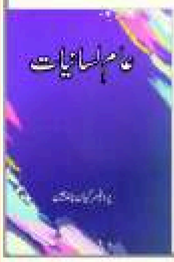


مصنف: پروفیسر گیان چند جین
تیسری طباعت: 2019
صفحات: 910
قیمت: 395 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, August-2020, Vol.22, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/07/2020
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

## اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025